قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جولائی 2014، قیمت -/15

ماہنامہ

اردو دنیا

دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

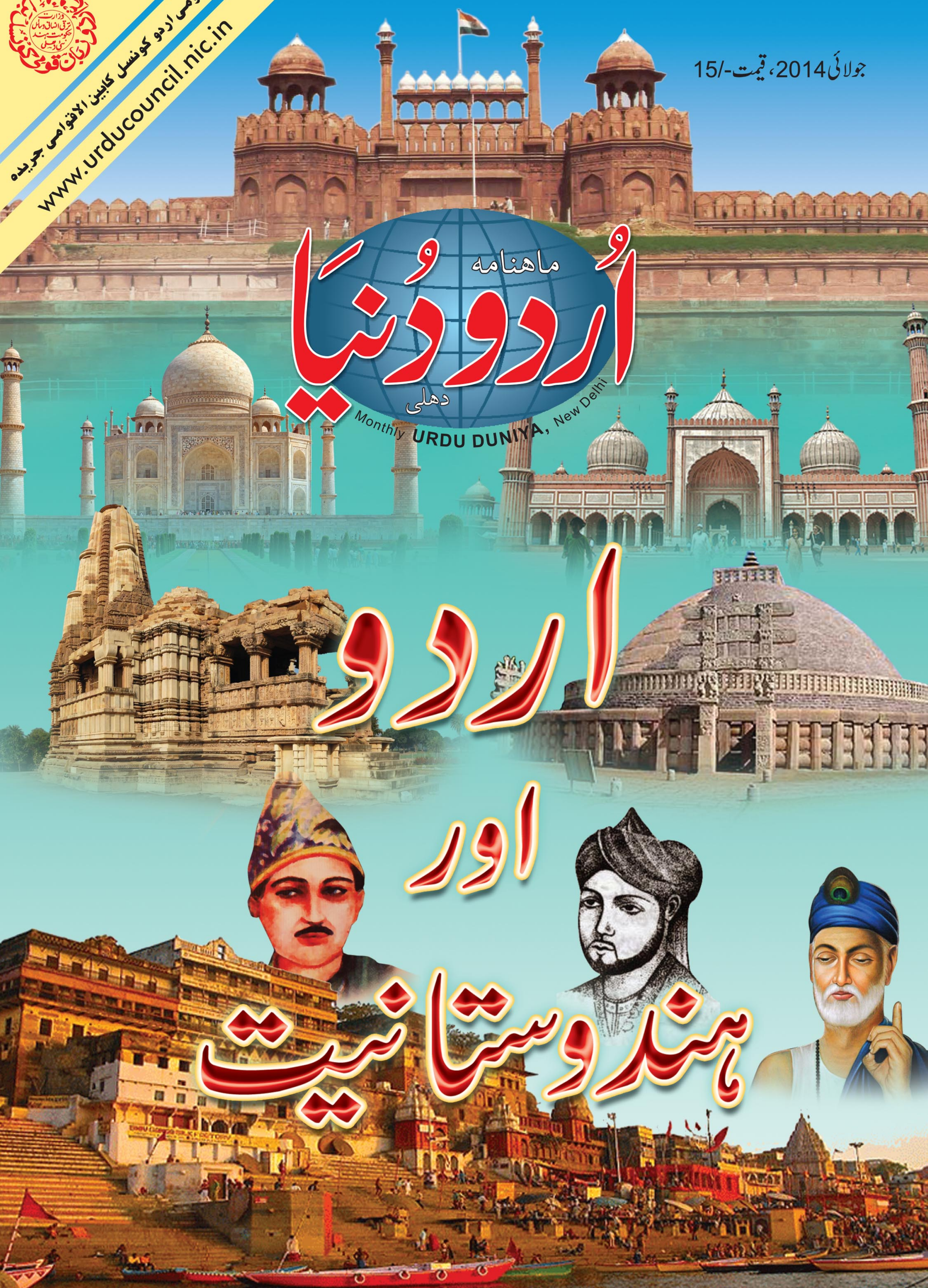

اردو اور ہندوستانیت

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:16، شمارہ:07، جولائی 2014

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا

انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: منظر سبحانی

قیمت-/15 روپے، سالانہ -/150 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000

(شعبۂ ادارت: 49539009)

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

email: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7

آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746 فیکس: 011-26108159

ای میل: sales@ncpul.in, ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194- 040

مشمولات

اداریہ

ہماری بات — 2

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط — 3

انٹرویو

اکثر تنقیدی مضامین دراصل تنقیدی انشائیے ہیں: نصیر احمد خان — معید رشیدی — 8

کور اسٹوری

ہندوستانیت اور اردو — مظفر حسین سید — 12

اردو شاعری میں جھلکتا ہندوستان — شائستہ فاخری — 15

اردو کی شعری روایات اور ہندوستانی عناصر — شاداب عالم — 18

اردو غزل اور ہندوستانی تہذیب — راشد انور راشد — 21

اردو اشعار میں ہندوستانیت — خلیق الزماں نصرت — 25

اردو میں ہندوستانیت کا مصور شاعر: نظیر اکبرآبادی — محمد ذاکر — 28

اردو افسانہ میں ہندوستانیت — نور الحسنین — 30

زبان و تعلیم

اردو نثر کے بنیادی اسالیب — احسان حسن — 32

ادبی مباحث

اقبال کے ہم معنی فارسی اردو اشعار — عبدالحق — 35

فارسی کے نامور ہندو شعرا و مورخین — عبدالقادر — 38

شخصیات

حیات اللہ انصاری: ایک ہمہ جہت شخصیت — عابد سہیل — 40

مولانا جامی احوال و آثار — محمد عبداللہ انصاری — 43

سیکولر حکمراں: ٹیپو سلطان — ساجد حسین — 46

خراجِ عقیدت

سید ضمیر حسن دہلوی: کچھ یادیں کچھ باتیں — محمد فیروز دہلوی — 48

اردو طباعت و اشاعت کا مسیحا: احمد مرزا جمیل — ندیم صدیقی — 52

مشاہیر ادب

خمار کی سرور آگیں شاعری — وسیم فرحت کارنجوی — 54

انتخاب کلام — خمار بارہ بنکوی — 58

ہماری مطبوعات

حصولِ آزادی کے لیے پہلی بڑی جدوجہد — پروفیسر بپن چندرا — مترجم: سعید احمد انصاری — 62

تہذیب و ثقافت

کتب بینی کا تحقیقی جائزہ — جاں نثار معین — 67

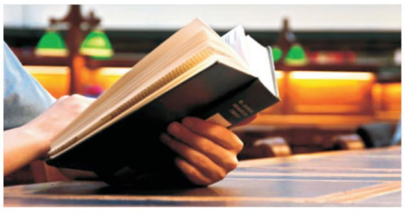

فلم

ہندوستانی ٹی وی سیریلز اور خواتین — عبدالقادر صدیقی — 70

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف — 73

عالمی اردو نامہ

عزیز نبیل سے خاص گفتگو — عبدالحی — 83

عالمی خبریں — ادارہ — 86

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ — 89

ہماری بات

ہندوستانیت اور اردو۔ اردو اور ہندوستانیت۔ دونوں ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں۔ ہمالیہ کی بلندیوں سے گنگا اور جمنا بن کر ابھرتی، اترتی، اچھلتی، اٹھلاتی، پھولتی پھلتی اور پھیلتی، سب کو ساتھ لے کر کھُلتی کھیلتی، دھومیں مچاتی اور ناچتی گاتی ہوئی اس ملی جلی معاشرت اور تہذیب نے، جسے ہم ہندوستانیت کہتے ہیں، اردو کو تخلیق کیا، یا اردو نے ہندوستانیت کے خدوخال کو ابھارا اور سنوارا، یہ کہنا مشکل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی زبانوں میں اردو وہ واحد زبان ہے جس نے اس ملک کی شاندار، عظیم اور قدیم تاریخ کے تسلسل کا حصہ بنتے ہوئے پہلی بار اس جغرافیائی خطّے کے رسم و رواج، رہن سہن کے طور طریقوں اور فکری زاویوں میں پائے جانے والے اختلاف، بعد اور فرق کو کسی گلشن میں پھیلی ہوئی خوش نما رنگارنگی سے تعبیر کیا، اسے ہندوستانیت کا نام دیا اور اس کی مشترکہ روح کو پہلی بار پہچانا۔ اس ملک میں اور بھی کئی خوب صورت زبانیں ہیں، جنھوں نے ہمارے لسانی چمن زار کو خوش نظر بنایا ہے، اور جن میں سے کئی زبانیں بعض ادبی اور فکری

معاملات میں بجا طور پر اردو سے آگے ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہیں، لیکن نظیر اکبر آبادی صرف اردو میں پایا جاتا ہے۔ اور یہ کوئی حسن اتفاق نہیں ہے۔ نظیر کو اردو میں ہی پیدا ہونا تھا۔ کیونکہ اسی زبان کا شاعر ہندوستان کی اصل روح کو سمجھ کر اور پہچان کر بیان کر سکتا تھا۔ یہی وہ زبان تھی، اور ہے، جس نے اس عظیم الشان ملک میں عوامی رابطے کی زبان کا درجہ حاصل کیا ہے۔

ہم اردو کو گنگا جمنا کی تہذیب کا ثمرہ مانتے ہیں۔ لیکن یہ پورا سچ نہیں ہے۔ اس زبان نے صرف لال قلعے کی فصیلوں اور بنارس کے گھاٹوں کو ہی نہیں چوما ہے۔ تاج محل کی بنیادوں اور برندابن کے حیات افزا لمس کو ہی انگیز نہیں کیا ہے۔ جہلم اور چناب کے مکتبوں میں بھی اس نے محبت کے کئی سبق پڑھے ہیں۔ سندھ اور ویاس کے کناروں پر بھی تعلیم پائی ہے۔ نربدا، کرشنا اور گوداوری نے بھی اسے اپنی گود میں کھلایا ہے۔ خواجہ غریب نواز، گورو نانک دیو مہاراج، بابا فرید، محبوب الٰہی، امیر خسرو اور سنت کبیر جیسے بزرگوں کا دست شفقت اس کے سر پر رہا ہے، ان کی صحبتوں اور گفتگوؤں سے اس نے لفظ و معانی کے موتی چنے ہیں، شمالی، مغربی، مشرقی اور جنوبی ہندوستان کے سیکڑوں ہندو مسلم اور سکھ راجے مہاراجاؤں، بادشاہوں نوابوں اور جاگیرداروں نے اس کے شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کر کے اردو کے دائرے کو وسعت دی ہے۔ چندر بھان برہمن، ولی گجراتی اور قلی قطب شاہ نے اسے اپنا کر اس قابل بنایا کہ یہ آگے چل کر میر، غالب اور اقبال پیدا کر سکے! تو یہ وطنِ عزیز کے کسی ایک خطّے میں پیدا ہونے والی زبان نہیں ہے۔ بحیثیت مجموعی پورے ہندوستان نے اردو کی تخلیق و تشکیل میں حصہ لیا ہے اور یہ پورے ہندوستان کی زبان ہے۔ لہٰذا ہندوستانیت کو اردو کے علاوہ کوئی اور زبان کیسے بہتر طور پر سمجھ اور سمجھا سکتی ہے۔

اس حقیقت سے بہر حال کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ تاریخ کی ابتدا سے ہندوستان مختلف تہذیبوں کا مسکن رہا ہے، ہر مذہبی فکر کو اس نے اپنے دامن میں جگہ دی ہے، ہر زبان کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا ہے اور یہی رواداری اردو کے ڈی این اے میں بھی شامل ہے۔

اردو زبان کی تہذیبی، ثقافتی اور سماجی اہمیت و افادیت کو سمجھنے سمجھانے کے مقصد سے 'اردو دنیا' میں اس زبان کے حالات کا مختلف زاویوں سے جائزہ لینے کے لیے کور اسٹوریز کا جو سلسلہ ہم نے گذشتہ دو برسوں سے شروع کر رکھا ہے اُس کے تحت اِس مرتبہ 'ہندوستانیت اور اردو' کو ہی موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ اپنے آپ میں اتنا بڑا اور اتنا اہم موضوع ہے کہ اس پر اگر ایک سو صفحوں کا خاص نمبر بھی نکالا جائے تو وہ بھی کم پڑے گا۔ کیونکہ بات وہی ہے: چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری! پھر بھی کوشش کی گئی ہے کہ بیس بائیس صفحات میں اردو اور ہندوستانیت کے اٹوٹ رشتے کی ایک چھوٹی سی جھانکی پیش کر دی جائے۔ اب یہ دیکھنا اور طے کرنا آپ کا کام ہے کہ اس کوشش میں ہم کس حد تک کامیاب ہو سکے ہیں!

(پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین)

آپ کی بات

خورشید حیات

چیف کنٹرولر، ساؤتھ ایسٹ سنٹرل ریلوے، بلاسپور

جون کی تپتی دوپہر میں 'اردو دنیا' کا چہرہ بہت قریب سے دیکھا۔ رو بہ رو ہوا پانی پت کے خواجہ احمد عباس سے، اس خواجہ سے جس نے نوعمری میں ہی یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ کبھی برطانوی حکومت کی غلامی نہیں کرے گا، حالات کیسے بھی ہوں وہ دائروں کا قیدی نہیں بنے گا۔ ایک جنون تھا، جس نے عباس کو صحافی سے کہانی کار، ناول نگار، فلم ساز، ہدایت کار یا پھر ترقی پسند ادب کا 'تریوینی' بنا دیا۔ دل کی دھڑکنوں کو جو لوگ غور سے سنتے ہیں، وہ بہت حساس ہوتے ہیں، حساس ذہن کو سکوں کہاں؟، جنون اسے منزل تک لے جاتا ہے۔ جہاں سے ایک نئے سفر کی شروعات ہوتی ہے۔ آج کا پانی پت ہو یا پھر، کل کے خواجہ احمد عباس کا وہ قصبہ اور وہ حالی مسلم ہائی اسکول، جہاں خواجہ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی، سب کا چہرہ آج نئے ہزارے میں بدل گیا ہے۔ چہرہ تو بدلتا رہتا ہے، جس طرح پگڈنڈی، چوڑی چھاتی والی سڑک بن جاتی ہے۔

اردو ادب کے تریوینی اگر خواجہ احمد عباس تھے تو آج نئی صدی میں 'اردو دنیا' کے گنگا، یمنا، سرسوتی خواجہ محمد اکرام الدین، نصرت ظہیر اور عبدالحی۔ قومی اردو کونسل کی پوری ٹیم کو وسیم بریلوی کے ساتھ ایک اردو قبیلہ کی صورت میں دیکھیے۔ آپ کا بے اختیار دل چاہے گا کہ ان کے قدموں کے نشان سے، سنہری تہذیب-تپتی ریت پر مل آیا جائے۔ مبارکباد! قبیلے کے سردار/ وزیر کو اس خصوصی شمارہ کے لیے۔ کتب و رسائل کو زندگی کا اہم حصہ بنانے میں، آپ سب کے جنوں کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ تعریف اس تخلیق کار کی جس نے آپ سب کے جنوں کو اعتبار بخشا۔ مالیگاؤں کے چوراہوں سے کچھ ایسی ہی آوازیں پیچھا کرتی ہیں۔ مہانگروں میں جب تیز رفتار زندگی ٹریفک سگنل پر رینگنے لگی تو مہاراشٹر کے کئی شہروں نے 'کتاب تہذیب' کے نام خاموشی سے ایک نئی عبارت لکھ ڈالی۔ مہاراشٹر میں ایک اردو قبیلہ بہت تیزی سے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا ہے۔ اس طرف بہار، اترپردیش اور دیگر ریاستوں کو دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ جاگنا بہت آسان ہے۔ علامہ شبنم کمالی پر اشرف استھانوی اور ساحر لدھیانوی پر رہنما شیخ کی تحریر نے متاثر کیا۔ ساحر کے ساتھ ساتھ امرتا پریتم پر بھی کچھ ہوتا تو پنجاب/ ہریانہ کی ماٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو کا احساس اپنا ایک الگ رنگ بکھیرتا، اونگھتے ہوئے شہر کو اسی طرح جگاتے رہیے، بس اتنی سی دعا ہے۔ دعا اک عبادت، دعا ادب و زندگی کی رفتار۔

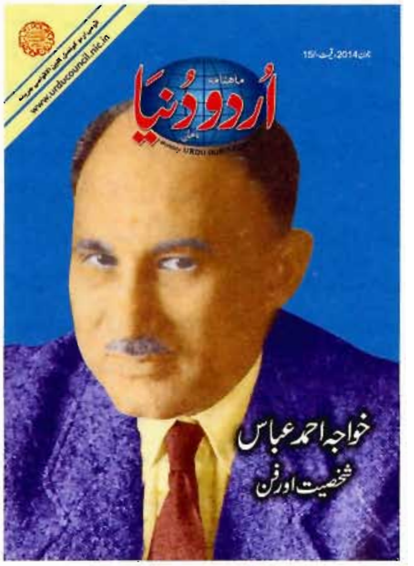

محمد بشیر مالیر کوٹلوی

ریٹائرڈ اسٹیٹ آفیسر، بی/ ایس اردو اکادمی، منٹو اسٹریٹ، دہلی گیٹ، مالیر کوٹلہ

'اردو دنیا' جون کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خواجہ احمد عباس بلند پایہ کے صحافی، فلم ڈائرکٹر اور فلم رائٹر تھے۔ اس شمارے سے خاص کر ڈاکٹر قدسیہ نصیر صاحبہ کے مضمون سے پتہ چلا وہ تو منٹو، بیدی، کرشن چندر، قاسمی اور عصمت سے بھی عظیم افسانہ نگار تھے۔ آخری پیراگراف سے محترمہ نے خواجہ کا ادبی قد کھینچ کر اتنا لمبا کر دیا کہ پچھلی صدی اور عصر حاضر کے ادبا، ان کے آگے بونے لگنے لگے ہیں۔ میں محترمہ سے کہنا چاہوں گا کہ کسی جریدے کا مدیر آپ کو کبھی نہیں کہتا کہ جس فن کار پر مضمون لکھو تو اس فن کا اُسے خدا ہی بنا ڈالو۔ محترمہ رقم طراز ہیں: ''موضوعات اُن کے (خواجہ) کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑے رہتے تھے۔ جس طرح آقا کے سامنے سیکڑوں غلام کھڑے حکم کے منتظر ہوں!'' یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ خواجہ مرحوم کا بیان تھا یا محض اُن کے حسنِ فکر کی تخلیق ہے۔ محترمہ سے ایک گزارش یہ ہے کہ منٹو کے بارے میں آئندہ کچھ لکھیں تو پہلے اُن کو پڑھ لیں اور سمجھ لیں۔ پھر ایسے تکلیف دہ جملے عطا کریں۔ ملاحظہ فرمائیں: ''منٹو سے طوائفوں کی زندگی لے لیجیے تو وہ قریب قریب کورے ہو جائیں۔''

موذیل، کھول دو، ٹوبہ ٹیک سنگھ، پھاہے، دھواں اور ٹھنڈا گوشت، کیا محترمہ ان چھ شاہ کار افسانوں سے ویشیائیں، ہٹا سکتی ہیں؟ محترمہ نے سیاہ حاشیوں کا درد محسوس کیا ہے!؟ منٹو نے شاید بہت قلیل مدت میں ڈھائی سو کے قریب افسانے تخلیق کیے ہیں۔ کیا سب افسانوں میں سے محترمہ کو ویشیائیں ہی نظر آئیں۔

ہمارے بھائی خورشید حیات کے صرف ایک جملے نے خواجہ کا مکمل تعارف دے ڈالا ''کہانی کی تھالی میں خواجہ احمد عباس رپورٹ پروس رہے ہیں۔'' اُن کے اس ایک جملے پر میں اُن کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ارتضیٰ کریم نے بھی اپنے مضمون میں کسی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا۔ کسی افسانے کو بہترین قرار دینے کے لیے یہ کافی نہیں ہوتا کہ اس افسانے کے تراجم دنیا کی دس بڑی زبانوں میں ہو چکے۔

پریم وار برٹنی ایک عظیم شاعر تھے۔ جن کی شناخت فلم اور اردو ادب میں برابر بنی ہوئی ہے اُن کے بارے میں یہ کچا سا مضمون پڑھ کر افسوس ہوا۔ یوں لگا جیسے پریم صاحب کا تمسخر اڑایا گیا ہے۔ اس مضمون کو ملاحظہ فرمائیں۔ منیر نیازی نے پریم وار برٹنی کے بارے میں یہ کہا۔ فراق گورکھپوری نے یہ کہا۔ جان نثار اختر نے یہ۔ بشیر بدر نے یہ کہا۔ محترمہ روبینہ شبنم نے یہ کہا پریم کی اہلیہ نے یہ کہا۔ خود پریم نے اپنے بارے میں یہ لکھا۔ ناشر صاحب نے یہ لکھا۔ آٹھ لوگوں کے حوالے جا بجا پریم صاحب کا کلام۔ اُن کے مجموعوں کی تصاویر۔ حواشی کتابیات و رسائل کی فہرست۔ مضمون نگار کا مضمون میں اپنا کیا ہے؟

میں صرف کچے پکے افسانے ہی لکھتا ہوں میں نے صرف افسانہ نگاروں کے فن پر ہی قلم اٹھایا ہے۔ کسی عظیم شاعر کے بارے میں لکھنے کا جوکھم کبھی نہیں اٹھایا۔ صاحب مضمون لکھتے ہیں ''بمبئی کو خیرآباد کہہ کر مالیر کوٹلہ

چلے آئے'' جب کہ لفظ خیر باد ہے رخصتی دعا۔

ان کی اہلیہ پرم جیت کور لکھتیں ہیں جب کہ ہونا چاہیے لکھتی ہیں۔

پریم وار برٹنی ابتدائی دور میں چترا جیسے پرچے میں پریم مالیرکوٹلوی کے نام سے چھپتے رہے۔ بعد میں ان کو احساس ہوا کہ وہ تو وار برٹن جو پاکستان میں ایک مقام ہے، جو شاید کسی انگریز کے نام پہ رکھا گیا تھا، میں پیدا ہوئے تھے اس طرح انھوں نے اپنا نام پریم وار برٹنی استعمال کیا۔ یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ پریم مرحوم پی کے اگروال کے نام سے شمع دہلی میں بطور افسانہ نگار بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی شاعری کا مزاج و رنگ ساحر لدھیانوی کا سا تھا۔ ایک بار امین سیانی نے بنا کا گیت مالا میں پریم وار برٹنی کا ایک فلمی گیت بجا کر سامعین کو کہا کہ وہ اگلے ہفتے اس گیت کے شاعر کا نام بتائیں گے۔ اس سے پہلے آپ لکھیں گے کہ یہ گیت کس نے لکھا۔ سینکڑوں لوگوں نے لکھا ساحر لدھیانوی پریم کا مزاج ساحر سے بہت ملتا تھا۔ مینا کماری جیسی سخن فہم اور شاعرہ پریم کی مداح تھیں۔ دھرمیندر بھی ان کے ہمدرد تھے۔ اُن کے کلام کی حفاظت کھرڑ کے شاعر کرشن پرویز نے کی۔ لندن کے سوہن راہی پریم کے شاگردوں میں سے ہیں۔ پریم وار برٹنی اپنی بلانوشی کی وجہ سے بمبئی میں کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ اپنے فن کو اس کا صحیح مقام نہ دلوا سکے۔

کرشن بھاؤک

A-201، گورونانک نگر، اسٹریٹ نمبر 18K، پٹیالہ، پنجاب

'اردو دنیا' کے جون کے شمارے میں ڈاکٹر عبدالحی کا عتیق اللہ جیسے بلند پایہ و مایۂ ناز ادیب سے کیا گیا انٹرویو کاملاً معیاری نوعیت کا ہے۔ اس میں جتنے معقول سوالات ہیں، اتنے ہی قابلِ قبول جوابات بھی ہیں۔ عتیق صاحب کی تلخ نوائی غالب کے ایک اعترافیہ شعر کی مانند لائقِ معافی ہی گردانی جائے گی، کیونکہ موجودہ حالات کے موجب ان کے دل میں بھی درد سِوا ہو رہا ہوگا۔ انگریزی ناول نگار کے نام 'تھامسن' کی جگہ 'تھامس' یا 'ٹامس' صحیح ہوتا۔ ہارڈی کے اسی ناول 'ٹیس....'' پر جاندار ہندی فلم 'دلہن ایک رات کی' بنی تھی۔ نصرت ظہیر کا عباس سے متعلق مختصر مضمون بے عیب ہے، صرف صفحہ 30 پر 'اسم اعظم' کی بجائے 'عزمِ اعظم' چاہیے تھا۔

علی احمد فاطمی کا مقالہ حسبِ معمول از حد بلند معیار رکھتا ہے۔ اس میں 'ہمہ جہت شخصیت' کے معنی میں انگریزی کے لفظ 'Versatile Genius' (ص 17) کے اردو مترادف لفظ کے لیے 'مختلف الصفات شخص' الفاظ کا تصرف نہایت موزوں ٹھہرتا ہے۔ اسی صفحے پر ان کا یہ قول بڑے معرکے کا ہے اور زریں حروف میں جڑنے کے لائق ہے کہ ''صرف ایک کہانی، ایک شعر سے بھی فنکار زندہ رہ سکتا ہے۔'' یہ کار آمد نتیجہ سالہا سال کے مشاہدات و تجربات سے ہی اخذ کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر قدسیہ نصیر کے شاندار مقالے کے آخر میں مہدی افادی کے 'عناصرِ خمسہ....'' والے قول و خیال کا عباس کی ادبی خدمات سے موازنہ کرتے ہوئے اِن کی انفرادیت و افادیت کی نشان دہی کرتے ہوئے دل پر دیر پا اثر قائم کرنے والا ہی یہ مقولہ ثابت ہوا ہے۔ عباس کے ایک افسانے 'گیہوں اور گلاب' کا موازنہ ہندی کوی سوریہ کانت ترِپاٹھی نرالا کی طویل نظم 'کُکُرمُتا' سے کیا جا سکتا ہے، جس میں 'کُکُرمُتا' یعنی مشروم Mushroom کو غریبوں کا مظہر بنایا گیا تھا اور 'گلاب' کو سرمایہ داروں کا۔ لیکن عباس صاحب نے 'گلاب' کو سرمایہ داروں کا استعارہ بنانے کے ساتھ ساتھ 'جمالیت' کا بھی نیا مظہر بنا کر اپنی انفرادیت یکسر قائم کی ہے۔

ارشاد انصاری کا مقالہ بھی معیاری ہے۔ اس میں میری دانست میں سنہ 1936 کو بیسویں صدی کی تیسری کی بجائے چوتھی دہائی لکھنا چاہیے تھا اور 99 سال کی جگہ سو سال قبل ہونا درکار تھا۔ (ص 19) 'ابابیل' افسانہ پہلی بار سنہ 1935 میں چھپا تھا، نہ کہ سنہ 1937 میں (ص 19) موصوف کے اس خیال میں بہت کچھ سما گیا ہے۔ ''عباس صاحب نے کثیر الجہات خوبیوں سے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے''۔ اگلے ہی صفحہ 20 پر 'انقلاب' کو افسانے کی جگہ ناول لکھنا تھا اور اسی صفحے پر 'ادب کی بیشتر اصناف' صحیح نہیں ہے، یہاں 'کی' کی جگہ 'کے' لفظ درکار تھا۔ اسی صفحے پر افسانے کا نام 'واپسی کا ٹک' کی بجائے 'ٹکٹ' لفظ درکار تھا۔

'آپ کی بات' کے تحت حضور سہسوانی نے اپنے خط میں لفظ 'کریہ' کو غلط کہا ہے اور 'فیروز اللغات' کا حوالہ دیا ہے۔ محمد مصطفیٰ خاں مداح کے بلند پایہ و قدیم لغت 'اردو ہندی شبد کوش' (اتر پردیش ہندی سنستھان، لکھنؤ) میں صفحہ 104 پر صفت لفظ ''کریہ'' ہی درج ہے، جس کے یہ معنی ہیں بدشکل۔ بدنما، نفرت آمیز، مکرُوہ وغیرہ۔ اس لفظ سے پہلے لفظ 'قریہہ' لفظ بھی درج ہے، لیکن وہ معنی و املا دونوں میں ہی ایک مختلف لفظ ہے اور اس ضمن سے اس کا کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ کلی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جہاں اردو ناقدوں نے عباس صاحب کی ادبی خدمات کے تئیں حد درجے کی بے اعتنائی برتی ہے، وہاں یہ ایک شمارہ ان کی خاطر خواہ پزیرائی کرنے کے موجب ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھنے والا بن چکا ہے۔

'اسم اعظم' کے بارے میں نصرت ظہیر کا کہنا ہے کہ 'کام، کام اور صرف کام' جیسے جملے کے لیے 'اسم اعظم' ہی موزوں ترین لفظ تھا۔ پرانی طلسمی کہانیوں میں 'اسم اعظم' منتر کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا تھا۔ (ادارہ)

مہوش نور

ریسرچ اسکالر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی

'اردو دنیا' جون کا شمارہ کافی عمدہ اور دلچسپ ہے۔ یہ شمارہ اس شخصیت کے نام منسوب ہے جو بیک وقت ایک صحافی، کالم نویس، افسانہ نگار، ناول نگار، فلم اسٹوری رائٹر، فلم ڈائریکٹر، پروڈیوسر سبھی کچھ تھے، جسے دنیائے اردو ادب خواجہ احمد عباس کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اس رسالے میں گوشۂ خواجہ احمد عباس کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ افسانہ، ناول، صحافت اور فلم۔ ان سارے گوشوں پر مقالہ نگاروں نے بہت ہی جامع اور مفصل مضامین لکھ کر خواجہ احمد عباس کی ادبی زندگی سے نئی نسل کو واقف کرایا ہے۔ بہتر ہوتا کہ خواجہ احمد عباس کے احباب اور خاص تعلق رکھنے والوں پر بھی ایک مضمون ہوتا۔

گوشۂ عباس کے علاوہ اور بھی دیگر مضامین مثلاً اڈیشا میں فارسی زبان کا ارتقا، اردو ادب میں تذکرۂ کشمیر، ڈینگو وائرس کا تعدیہ اور اس کا تدارک بہت معلوماتی مضامین ہیں۔ شمارے میں پروفیسر عتیق اللہ کا انٹرویو بہت عمدہ اور معلوماتی ہے۔

شکیل سہسرامی

یو ایس بی ایل سی پٹنہ

تقریباً 28 و 30 تاثراتی خطوط پر مبنی جون 2014 کا تازہ ترین اردو دنیا کا شمارہ نصیب ہوا۔ سرورق پر ماہرِ فنونِ کثیر الجہات شخصیت خواجہ احمد عباس کی تصویر دیکھ کر اچھا لگا۔ اردو کی معروف شخصیات پر خصوصی گوشہ کی اشاعت مرحومین کے تئیں انتہائی مناسب خراجِ عقیدت کی مستحسن پیروی ہے۔ تاثراتی خطوط کی بڑھتی تعداد اردو دنیا کی روز افزوں مقبولیت میں اضافہ کا زندہ ثبوت ہے۔ عتیق اللہ صاحب کا خوبصورت اور دلچسپ انٹرویو کئی نقطۂ نظر سے قاری کو انسپائر کرتا نظر آتا ہے۔ دو صفحات پر مشتمل پروفیسر اختر الواسع سے کی گئی خصوصی گفتگو نے شمارے کا معیار دوبالا کر دیا۔ ہر شمارے کی طرح اس شمارے کے تمام قلم کار کم و بیش اپنی تخلیقی ماہیت کے تعلق سے خاطر خواہ تعریف و توصیف کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

سابق ممبر راجیہ سبھا، ریٹائرڈ استاد سیاسیات
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

متعدد محققانہ مضامین کی وجہ سے مئی 2014 کا اردو دنیا پچھلے شماروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ یہ مضامین بیش بہا معلومات کے خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انٹرویو، رسم الخط کسی بھی زبان کی روح ہے، بھاشا زبان اور مسلمان، علامہ شبلی نعمانی، علی عباس حسینی کے کرداروں میں مشرقی نفسیات، رامائن مسلمان اور اردو، ایک باغ و بہار شخصیت صغرا مہدی، خشونت سنگھ کی کالم نویسی اور نشاطیہ کلچر، اثر خیز صحافت کے علم بردار ظفر علی خاں، عطیہ فیضی ایک بھولی بسری داستان، اردو زبان میں سائنسی، تکنیکی، حرفتی پیشہ ورانہ اور اعلیٰ تعلیم کے مسائل اور کتابوں کی فروخت کا منظر نامہ جنوبی ہند کے پبلشرز کی اردو خدمات، مضمون: عہد ساز شخصیت حسرت موہانی میں اس کا کوئی ذکر نہیں کہ کانگریس کے کس ممبر نے احمد آباد 1921 میں نے مکمل آزادی کا ریزولوشن پیش کیا اور نہ اس کا کوئی ذکر کہ انھوں نے سائمن کمیشن کا بائی کاٹ بھی کیا تھا۔

پرویز اشرفی

ڈی 321، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

مئی کا شمارہ دیکھا۔ اس مرتبہ بھی اداریہ قابل تحسین ہے۔ بے شک کتابیں خرید کر پڑھی جائیں تو مسئلہ آسانی سے حل ہوسکتا ہے۔ اردو سے عوام کی بے رُخی نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہے۔ حیرت ہوتی ہے اُس وقت جب ملت کے بچے خط لکھتے وقت دیوناگری رسم الخط کا استعمال کرتے ہیں اور اُنھیں احساس تک نہیں ہوتا کہ اُردو زبان کی اس سے بڑی ناقدری اور کیا ہوگی؟

تمام مشتمولات معیاری اور علم میں اضافہ کرنے والے ہیں۔ محترم عارف اقبال صاحب نے نہایت اہم موضوع قلم بند کیا ہے۔ نگار عظیم نے صغرا مہدی پر جو مضمون لکھا ہے میری معلومات میں اضافے کا سبب بنا۔ خاص کر آخری صفحے کا تیسرے کالم کا ٹکڑا جس میں لکھا ہے ''جب آنگن میں صغریٰ مہدی سفید لباس میں مُنھ ڈھانپے خاموش ابدی نیند سوئی تھیں اور عذرا باجی زار و قطار رو رہی تھیں تو کلیجہ مُنھ کو آتا تھا۔ لگتا تھا صغریٰ مہدی ابھی ابھی مُنھ سے چادر ہٹائیں گی اور بولیں گی: اے ہے عذرا بس اب چُپ بھی کرو، کیوں نیند خراب کرتی ہو، تمھیں خدا سمجھے'' یقین جانیے یہ جملے دل میں اس طرح اُترے کہ آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔

عطیہ فیضی پر وقار ناصری کا مضمون پڑھ کر دو عظیم شخصیتوں کے متعلق زندگی کے نئے اوراق کھلے۔ فارسی افسانہ 'وطن' ایک عمدہ افسانہ ہے۔ نصر اللہ اپنے باپ کے گھر کی تلاش میں زندگی کے آخری پڑاؤ کے کرب میں مبتلا تھا اور شاید قارئین کو بھی مبتلا کر گیا۔ سعید نفیسی اور مترجم واصف احمد کو مبارکباد۔

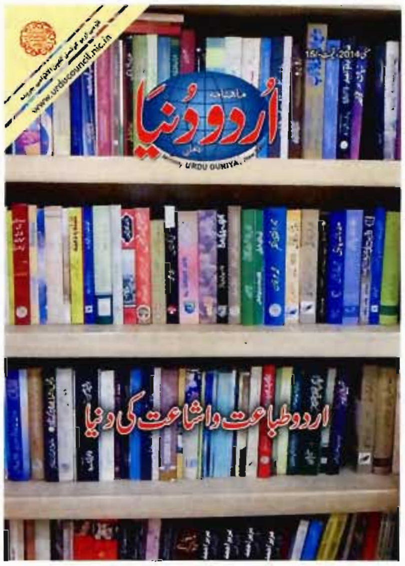

شفقت اعظمی

'دلکشا'، این-49، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

اردو دنیا کا تازہ شمارہ مئی 2014 پیش نظر ہے۔ ویسے اس موقر مجلّہ کا پابندی سے مطالعہ میرے معمولات میں شامل ہے تاہم جب بھی قلم اٹھانے کا قصد کرتا ہوں تو خود کو کچھ لکھنے سے قاصر پاتا ہوں کہ اتنے محاسن اور رعنائیوں سے معمور رسالہ کی کن کن خوبیوں پر گفتگو کی جائے، 'کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست'۔ بہرحال طوالت کے خوف سے 'ہماری بات' سے ہی آغازِ سخن کیا جائے تو بہتر ہے جو انتہائی معنیٰ آفریں اور عصری مسائل اور وسائل سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتی ہے۔ اردو کتابوں کی طباعت واشاعت کی طرف جن چند تلخ وشیریں حقائق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو صد فیصد درست، مثلاً ''ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ کتابیں خرید کر پڑھی جائیں، اردو والوں کے حالات اتنے گئے گزرے نہیں ہیں کہ وہ مہینے بھر میں اپنی پسند کی ایک کتاب بھی نہ خرید سکیں۔'' بلا شبہ اگر آج ریڈر شپ بڑھ جائے تو اردو کتابوں کی نشر و اشاعت کا منظر بدلتے دیر نہیں لگے گی۔

شمارے میں کلدیپ نیر کا انٹرویو انتہائی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ موصوف نے ''رسم الخط کسی زبان کی روح ہے'' کہہ کر اردو زبان کے موجودہ رسم الخط کی وکالت کا حق ادا کر دیا۔ محمد عارف اقبال نے اردو کتابوں کی فروخت کا جامع منظر نامہ پیش کیا ہے۔ جسے محبانِ اردو کو بالاستیعاب پڑھنا اور اس کے عواقب کا تجزیہ کرنا چاہیے۔ عہد ساز شخصیت (عاقل زیاد)، کرداروں میں مشرقی نفسیات (محمد مستمر) کے علاوہ شخصیات اور خراجِ عقیدت کے تحت بھی مضامین بڑے اچھے ہیں بالخصوص پروفیسر عبدالحق نے اپنے استاد پر 'پروفیسر محمود الٰہی-ایک دبستان' کے زیرِ عنوان جامع مقالہ لکھ کر اہم حقائق سے ہمیں روشناس کرایا ہے جس کی روشنی میں ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ تبصرہ و تعارف کے تحت کتنی اہم کتابوں سے ہم گھر بیٹھے آشنا ہو جاتے ہیں۔ بعینہٖ خبرنامہ اور وفیات کے کالم بھی بہت مفید اور معلومات آفریں ہوتے ہیں۔ اس معیاری رسالے کی اس شان سے جلوہ گری کہ صوری و معنوی دونوں اعتبار سے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے کسی بھی رسالے کے مماثل پورے اعتماد سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اخبار بینی سے جہاں زبان بگڑتی ہے، اردو دنیا اسے سنبھال لیتی ہے۔ اس کا ہر شمارہ گونا گوں خوبیوں کا مجموعہ اور معلومات کا خزینہ ہوتا ہے۔ بہرحال اس حسین پیشکش پر صمیم قلب سے ہدیۂ تہنیت حاضر ہے۔

ڈاکٹر الطاف انجم

نظامت فاصلاتی تعلیم، کشمیر یونیورسٹی

مئی 2014 کے شمارے میں کئی مضامین میرے لیے قابلِ توجہ رہے۔ جن میں استادِ محترم پروفیسر عبدالحق کا مضمون کئی اعتبار سے فکر انگیز اور معلوماتی ہے۔ ان کے مضمون 'پروفیسر محمود الٰہی: ایک دبستان' سے جہاں ایک طرف شعبے اُردو دہلی یونیورسٹی کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے وہیں اس شعبہ سے وابستہ اساتذہ کی منفرد کارکردگی کا بھی منظر نامہ تیار کیا جاسکتا ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ ''بزرگ اساتذہ تحقیقی مقالوں کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے'' اتنا بلیغ جملہ ہے کہ جامعات میں اُردو کے نام پر روٹیاں کھانے والوں کو اپنا محاسبہ کرنے کے لیے کافی وشافی ہے۔ ترقی کی رفتار میں جامعات کے اساتذہ بغیر کسی معیاری کام کے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں کس عجلت کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس تشویش کا اظہار پروفیسر عبدالحق نے بجا طور پر کیا ہے ''یہ درسیات کے فسانے بھی غریب ہیں کہ توفیق میں ترقی ہوتی رہی مگر علمی انحطاط میں اضافہ ہوتا رہا۔'' مجموعی طور پر ان کا یہ مضمون نہایت معلوماتی ہے اور اسلوب کی نیرنگی اپنی جگہ داد کی طالب ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر عبدالحق نے اُردو کی طرف اپنی مراجعت کا قصہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ پہلے گورکھپور یونیورسٹی میں ایم اے جغرافیہ کے لیے منتخب ہوئے

تھے لیکن استادِ محترم پروفیسر محمود الٰہی کے مشورے پر انھوں نے اُردو میں داخلہ لے کر شعبۂ اُردو کو قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ کچھ ایسی ہی کہانی میری بھی رہی۔ پہلے جغرافیہ (ایم اے) میں داخلہ ہوا پھر بعد میں ذاتی دلچسپی اور لگاؤ کی بنا پر اردو (ایم اے) میں ایڈمیشن لیا۔

اس شمارے میں محمد عارف اقبال نے اپنے مضمون 'اُردو طباعت و اشاعت کی دنیا' میں اُردو سے محبت کا دم بھرنے والے لوگوں کو ہوش کے ناخن لینے پر مجبور کیا۔ اُردو طباعت و اشاعت کے ہر ادارے کا مفصل جائزہ پیش کر کے انھوں نے اس صنعت کا پوسٹ مارٹم کیا ہے۔ البتہ اس دوران انھوں نے دورِ حاضر کے ایک اہم اشاعتی ادارہ 'ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلی' سے صرف نظر کیا ہے جس کے لیے ہم مضمون نگار سے وضاحت چاہتے ہیں کیونکہ اس کے ذکر کے بغیر اُردو اشاعت کی تاریخ مرتب کرنا محال ہے۔ اس ادارے کی تاریخ کم و بیش نصف صدی کو محیط ہے اس لیے اس کا ذکر ناگزیر ہے۔

ایم راگھو راؤ

ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا 480001 (مدھیہ پردیش)

فیض احمد فیض کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے پوری دنیا کے مجبور انسانوں کے دکھ درد کو اپنا سمجھا اور زندگی بھر اس کے خلاف اپنے قلم کے ذریعے آواز اٹھائی۔ علی عباس حسینی ابتدائی دور کے وہ افسانہ نگار ہیں جن کے ادبی کارناموں کا شمار کلاسیکی ادب میں ہوتا ہے۔ ساحر لدھیانوی نے مصرعوں اور شعروں میں نہایت شگفتہ انداز میں حکمت کے راز کھولے ہیں۔ ان مصرعوں اور شعروں میں بڑی بڑی داستانیں پوشیدہ ہیں۔ خوشونت سنگھ کے تخلیقی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا تھا۔ انھیں کہانی لکھنے اور سنانے کا فن آتا تھا۔ پروفیسر صغرا مہدی ایک ممتاز ادیبہ، افسانہ نگار، ناول نگار اور انشاپرداز تھیں۔ ظفر علی خان اپنے وقت کے عظیم صحافی، ادیب اور مترجم تھے۔ انھوں نے ادب کو عوام کے سانچے میں ڈھالا۔

ممتاز الحق

E227، ابوالفضل انکلیو II، نئی دہلی

مئی 2014 کا شمارہ حسبِ معمول دلکشی اور تنوع کا مرقع ہے۔ کلدیپ نیر ہمارے عہد کے ایک بیباک صحافی ہیں وہ انسان دوستی، اردو دوستی، اور سیکولر روایات کے امین ہیں۔ موصوف کا مختصر مگر جامع انٹرویو شائع کر کے آپ نے 'اردو دنیا' کے قارئین کو ان کے خیالات سے آگاہ کیا ہے۔ برادران وطن میں شاید ہی اب کوئی ایسی شخصیت ہمارے درمیان ہو جس کا تعلق حسرت موہانی اور مولانا آزاد سے ایسے خلوص اور عقیدت پر مبنی ہو، انھیں آزادی کے بعد کے دور میں اردو پر ہونے والی ناانصافیوں کا پورا احساس ہے مگر وہ اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ موصوف ہند و پاک دوستی کے بھی علمبردار رہے ہیں وہ ہر سال واگھا سرحد پر شمع جلا کر عہد کرتے ہیں کہ ہر حال میں امن قائم رکھا جائے گا۔ دیکھنے میں ان کا یہ معمولی عمل ایک بڑی تحریک کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ یہ شمارہ اردو طباعت و اشاعت کے لیے مخصوص ہے۔ اس سلسلے کے مضامین شمال و جنوب میں اردو طباعتی اور اشاعتی اداروں کا اچھا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ خراجِ عقیدت کے تحت مارچ 2014 میں ہم سے جدا ہونے والی تین بڑی شخصیتوں پروفیسر محمود الٰہی، خوشونت سنگھ اور صغریٰ مہدی کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ پروفیسر محمود الٰہی ایک دبستان ہیں۔ ان کے ابتدائی دور کے اہم شاگرد پروفیسر عبدالحق نے بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ مرحوم کو یاد کیا ہے اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر الٰہی نے اپنی طویل مدت کار میں کئی نسلوں کی تربیت کی۔ خاکسار کو بھی ان کی شاگردی کا شرف حاصل رہا ہے۔ 'عطیہ فیضی ایک بھولی بسری داستان' ایک داستان عبرت ہے۔

ڈاکٹر شمیم احمد

صدر شعبۂ اردو و فارسی، سینٹ اسٹیفن کالج، دہلی یونیورسٹی

اردو طباعت واشاعت کے موضوع پر اردو دنیا کا تازہ شمارہ بابت مئی 2014 گزشتہ شماروں کے مانند حسن طباعت اور معیارِ طباعت کے اعتبار سے اہل اردو کو فخر و انبساط کا موقع فراہم کرتا ہے کہ ہمیں اس ضمن میں بھی دیگر زبانوں کے مقابلے سبقت حاصل ہے۔ آفریں و مبارک باد! آپ نے اس میں کتابوں کی اشاعت کی حوصلہ افزا اور ان کی فروخت کی حوصلہ شکن صورتِ حال کو تو موضوع بنایا تاہم رسائل و جرائد توجہ سے محروم رہے جب کہ مذکورہ ہر دو اعتبار سے ان کی صورت حال کتب کی اشاعتی صورتِ حال سے بہت بہتر ہے۔ مدیر موصوف نے 'ہماری بات' میں جس بے باکی کے ساتھ اردو کتب کی خریداری کی طرف متوجہ کیا ہے وہ ہمیں اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے کو مجبور کرنے کے لیے کافی ہے۔ خراجِ عقیدت کے ذیل میں پروفیسر عبدالحق کا مضمون 'پروفیسر محمود الٰہی: ایک دبستان' ہمارے عہد کے بزرگوں کی ایک ایسی داستان سناتا ہے جس میں شخصیتوں کے بننے اور سنورنے کی حکایات چشم کشا ہیں اور مقاماتِ عبرت بھی۔ عبدالحق صاحب کا قلم حقائق کے بیان میں مصلحتوں کی خاطر سکوت اختیار نہیں کرتا، وہ تمام تر شوخیوں کے ساتھ تکلف برطرف کی مثال قائم کرتا ہے۔ یہی بے باکی زبیر رضوی کے مضمون خوشونت سنگھ کی کالم نویسی اور نشاطیہ کلچر سے بھی عیاں ہیں۔ وقار ناصری کا مضمون عطیہ فیضی ایک بھولی بسری داستان، ان حقیقتوں سے روشناس کراتا ہے جن کی عدم معلومات یا گمراہ کن ادھوری معلومات ہمیں اپنے دو اہم ترین ادیبوں کی ذاتی زندگی کے تعلق سے تحیر خیز سرگوشیوں پر آمادہ کرتی رہی ہے۔ شمارے کے دیگر مشمولات میں احتشام الحق کا مضمون اردو زبان میں اعلیٰ تعلیم کے مسائل اور دیوان حنان خان کا مضمون 'احتجاج کی منفرد آواز فیض' قابل ذکر ہیں۔

عبیدالرحمن

روم نمبر 42، اولڈ، برہم پُترا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

'اردو دنیا' مئی کا شمارہ 30 اپریل کو موصول ہوا۔ شمارے میں شامل تمام مضامین معلوماتی اور لائق مطالعہ ہیں۔ شفیع ایوب کے انٹرویو کا انداز پسند آیا۔ اس انٹرویو میں ایک نوآموز صحافی کو سیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ ڈاکٹر ثوبان سعید صاحب نے 'رامائن مسلمان اور اردو' کے حوالے سے عمدہ بحث کی ہے۔ مضمون کے آخر میں رام چندر جی کی شخصیت پر لکھی گئی مثنویوں اور رامائنوں کے اشعار کا اردو مثنوی اور مرثیے کے اشعار سے تقابل و موازنہ کر کے مطالعے کی ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ احتشام الحق صاحب نے اردو میڈیم سے پیشہ ورانہ اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کو درپیش مسائل سے معاملہ کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ یہ بات درست ہے کہ جب اسکول اور گریجویٹ کی سطح پر دیگر مضامین کی کتابیں اردو میں دستیاب نہیں ہیں تو پھر تکنیکی، سائنسی، حرفتی اور پیشہ ورانہ کورسیز کی کتابیں ملنا اور مشکل ہے۔ منور حسن کمال نے ظفر علی خاں کی خدمات پر مقالہ تحریر کرنے میں عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر عبدالحق، زبیر رضوی اور نگار عظیم نے اپنے اپنے مضمون میں ہم سے رخصت ہوئے ادیبوں کو دل کی گہرائیوں سے خراجِ عقیدت پیش کیا۔

ذاکر فیضی

برہم پُترا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے مئی 2014 کے شمارے میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ چھپی ہوئی کتاب کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا، اس کی اہمیت ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ یقیناً یہ بات درست ہے۔ اردو دنیا کے اس شمارے میں سب سے دلچسپ کلدیپ نیر سے لیا گیا انٹرویو ہے جسے شفیع ایوب نے لیا ہے۔ ایسا انٹرویو جس میں شفیع ایوب سوال کریں اور کلدیپ نیر جیسی شخصیت جواب دے

دلچسپی اور معلومات سے خالی ہو بھی نہیں سکتا۔ اردو طباعت واشاعت کی دنیا سے متعلق، جو مضامین اس شمارے میں شامل کیے گئے ہیں، وہ طالب علم اور اردو شائقین کے لیے بہت سی نئی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ دیگر مضامین بھی بہت خوب ہیں مگر زبیر رضوی کا مضمون خوشونت کی کالم نویسی اور نشاطیہ کلچر اور نگار عظیم کا 'ایک باغ و بہار شخصیت صغرا مہدی' بہت خوب ہیں۔ وقار ناصری نے عطیہ فیضی کی داستان کو اپنے انداز سے اور بھی رنگین بنا دیا ہے۔ سعید نفیسی کا فارسی افسانہ 'وطن' کا اردو ترجمہ پسند آیا۔

عبدالواجد خان

نائب صدر اردو مجلس ٹرسٹ رجسٹرڈ میسور

'اردو دنیا' مئی 2014 میں کئی قلمکاروں نے نہایت ہی بے باکی سے قلم چلایا ہے جس کی داد دینی پڑتی ہے۔ 'سماجی برائیاں: بوستانِ خیال کے تناظر میں' جناب ابن کنول نے ہماری سماجی برائیوں کو بے لاگ و لپیٹ بیان کیا ہے۔ اگر ہمیں ہماری کمزوریوں کا ٹھیک ٹھیک علم ہو جاتا تو ہم بلاشبہ طاقتور بن جائیں گے۔ جناب وقار ناصری صاحب نے اپنے مضمون: عطیہ فیضی، ایک بھولی بسری داستان' سے ہمارے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ عطیہ فیضی کی داستان کا ایک ایک ورق شاہد ہے کہ اب سے ایک صدی پہلے اس عورت نے، عورت کی تعلیم، ان کے حقوق آزادی اور معاشرے میں ان کی عزت افزائی کی آواز اٹھائی۔

ڈاکٹر فلک فیروز

کشمیر یونیورسٹی، سری نگر

مئی 2014 'اردو دنیا' میں کلدیپ نیر سے شفیع ایوب صاحب کا انٹرویو کافی دلچسپ ہے۔ احتجاج کی منفرد آواز: فیض، (حنان خان) کا مضمون کافی محنت سے تیار کیا گیا تھا۔ احتشام الحق صاحب کا مضمون شمارے کی جان ثابت ہوا۔ مذکورہ مضمون میں مضمون نگار نے کافی بلیغ اشارے کیے ہیں کہ کن بنیادوں پر موجودہ دور میں اردو زبان کو برتنے اور اسے update کرنے کی ضرورت ہے نیز اس مضمون سے اس بات کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کتنے ایسے وسائل ہیں جن سے ہم اردو کو زیادہ مضبوط پلیٹ فارم دے سکیں۔ صغرا مہدی کے حوالے سے نگار عظیم کا مضمون کافی معلوماتی ثابت ہوا لیکن ان کی افسانہ نگاری پر کوئی بات مضمون میں شامل نہیں جس سے مضمون کا رنگ کچھ پھیکا پھیکا نظر آیا۔ حالانکہ صغرا مہدی تانیثیت کی منفرد آواز ہیں، ان کی افسانہ نگاری میں جگہ جگہ ایسے بلیغ اشارے ملتے ہیں جو نئی تہذیبی تبدیلیوں کا حوالہ ہے۔

صادق علی انصاری

198 اے، شیخ سرائے، سیتاپور، یوپی

رسالہ 'اردو دنیا' مئی 2014 پڑھا جو اپنے آپ میں ایک دستاویز ہے۔ کلدیپ نیر کا انٹرویو رسالے کی جان ہے۔ فیض اور مولانا حسرت موہانی پر مضامین اچھے اور معیار کے عین مطابق ہیں۔ جناب ابن کنول کا 'بوستانِ خیال کے تناظر میں سماجی برائیاں' ایک بہتر جائزہ ہے۔ ایک بھولی بسری داستان کے تحت وقار ناصری کا مضمون عطیہ فیضی پڑھا جو بہت اختصار سے لکھ کر کام چلا لیا گیا۔ اس ضمن میں متعدد نام بھی آتے ہیں۔ لیکن میں تفصیل پر نہ جاتے ہوئے یہ ضرور عرض کرنا چاہوں گا کہ عطیہ فیضی کا مضمون حکیم محمد افتخار علی صدیقی جگر بسوانی (1871 - 1958) کے تذکرے کے بغیر نامکمل ہے۔ حضرت جگر بسوانی امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ یہ ضلع سیتاپور کی تحصیل بسواں کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے عطیہ فیضی کے لیے اپنی شادی شدہ زندگی برباد کر لی اور ان کی ایک بیٹی بگن ان سے ناراض ہو کر شوہر کے ہمراہ پاکستان چلی گئی۔

جرار احمد

ایم اے اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مئی کا اردو دنیا ہمیشہ کی طرح بہت معلوماتی ہے۔ کلدیپ نیر صاحب کا انٹرویو پڑھ کر بہت خوشی ہوئی گرچہ پاکستان اور ہندوستان کی دوستی کی راہ پرخار ہے، مگر جب تک نیر صاحب زندہ ہیں میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس دوستی کی راہ کو ہموار کرنے کی سعی کرتے رہیں گے۔ احتشام الحق صاحب کا 'اعلیٰ تعلیم کے مسائل' پر جو مضمون ہے، وہ یقیناً ایک بہت ہی اہم موضوع ہے اور اس پر یکسوئی سے غور وخوض کی ضرورت ہے۔ اکادمیوں کے لیے ان کا مشورہ اردو کی بقا اور ترویج واشاعت کے لیے بہت ہی مفید ہے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم صدیقی

شفاخانہ، کلینک سینٹر، ایم جی روڈ قنوج

ماہنامہ 'اردو دنیا' کافی عرصے سے پڑھ رہا ہوں۔ آپ کی قیادت اور رفقا کی کوششوں سے رسالہ خوب سے خوب تر کی جانب گامزن ہے۔ 'آپ کی بات' عنوان کے تحت اردو کے عظیم علم داں حضرات کے خطوط بہ غور پڑھتا ہوں اور چونکہ اپنے جذبات کے اظہار کے لیے اس پایے کے الفاظ اور ان کو تحریر میں لانے سے قاصر محسوس کرتا ہوں لہٰذا کبھی آپ کو مبارک یا رسالے تعریف کے چند الفاظ بھیجنے کی جرأت نہ کر سکا۔ لیکن مجھ جیسے ہزاروں ادب نواز لوگ ہیں جو رسالے کی ادبی خدمات کے معترف ہیں۔ میری جانب سے بھی اتنے بہتر رسالے کے لیے مبارکباد قبول کریں۔

ایم اے کلیم

فیض منزل، ایف سی آئی، خلیل پورہ روڈ، پھلواری شریف، پٹنہ

رسالہ 'اردو دنیا' اتنی خوبصورت شکل میں شائع ہو رہا ہے کہ دیکھ کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ رسالے کا پہلا صفحہ پرکشش، چھپائی خوبصورت اور زیادہ تر مضامین اپنے معیار کے مطابق۔ دیکھ کر اور پھر پڑھ کر بہت مسرت ہوتی ہے۔ دل سے دعائیں نکلتی ہیں کہ اللہ اس رسالے کو لمبی حیات عطا کرے۔

معین الدین شمسی

حاجی جمیل احمد روڈ، بھنڈاری ڈیہہ، گریڈیہہ

ایک ساتھ ماہ اپریل و مئی 2014 'اردو دنیا' کے دونوں شمارے ہمدست ہوئے۔ شمارے کے جملہ مشمولات معیاری، بہتر اور معلوماتی ہیں اور ہوتے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔ قومی کونسل سائبر ٹیکنالوجی کو اردو کتابوں کی اشاعت سے جوڑتے ہوئے ایک انوکھا اقدام یہ کیا کہ اپنی تمام مطبوعات انٹرنیٹ پر آن لائن مہیا کرادی ہیں۔ مئی کے شمارے میں کور اسٹوریز کے تحت محمد عارف اقبال کا 'اردو کتابوں کی فروخت کا منظرنامہ' اور علیم صبا نویدی کا 'تمل ناڈو میں اردو کتابوں کی اشاعت' معلوماتی، متاثر کن، جامع و قیع اور کمال فن کا ایک نادر نمونہ ہے۔ بلاشبہ ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے بجا طور پر فرمایا ہے کہ ''اگر ہمیں اردو سے محبت ہے تو ہمیں اسے پورے طور پر اپنانا ہوگا اس کی کتابوں سمیت!'' اس ضمن میں قوم اردو سے میری التجا ہے کہ کم ازکم ہر فرد ایک ایک رسالہ ہر ماہ خرید کر خود پڑھیں بچوں کو پڑھائیں۔ اردو پڑھنے کی تلقین احباب سے کرتے رہیں۔

رسالہ 'اردو دنیا' تمام اردو داں افراد کے لیے بے بہا اور انمول تحفے سے کم نہیں۔ بلاشبہ اردو زبان کی ترویج واشاعت کے لیے قومی اردو کونسل کی جانب سے اٹھائے گئے اقدامات وخدمات کو سنہرے حرفوں سے لکھا جانا چاہیے۔ کیونکہ کلاسیکی ادب کی اشاعت، نصابی ضروریات کی تکمیل، سائنس وٹکنالوجی، قومی علمی سرمایے کی حفاظت، عمرانیات، ثقافت اور معاشرت اور کمپیوٹر کی دنیا سے اہل اردو کو مکمل طور پر جوڑنے کی کوشش، مشاعرے، کانفرنس، ورکشاپ کے علاوہ مختلف علمی وتکنیکی پروجکٹوں کی معاونت کے ذریعے NCPUL بیش بہا کارِنمایاں انجام دے رہی ہیں۔

■

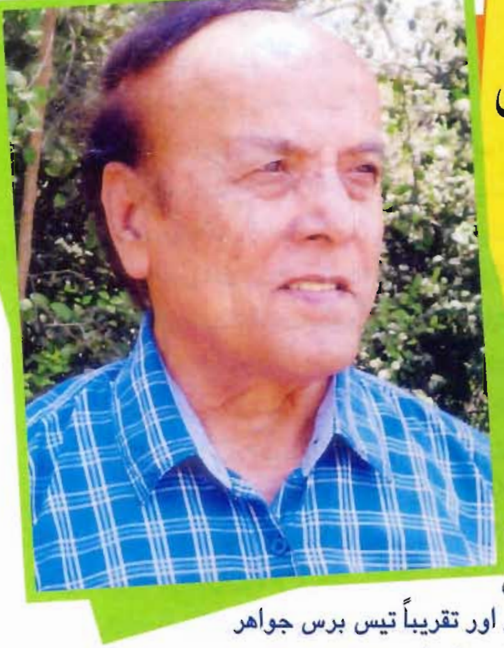

اکثر تنقیدی مضامین دراصل تنقیدی انشائیے ہیں

نصیر احمد خاں

معید رشیدی

(پروفیسر نصیر احمد خاں کا مارہرہ شریف (اتر پردیش) کے ایک معزز پڑھے لکھے گھرانے سے تعلق ہے۔ ابتدائی دینی اور دنیاوی تعلیم کے بعد علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے گریجویشن اور امتیاز کے ساتھ اردو ادب میں ایم اے کیا۔ بمبئی یونی ورسٹی سے سمر اسکول کرنے کے بعد علم لسان کا شوق انھیں پونہ لے گیا جہاں لسانیات کی تعلیم کے اعلا مرکز، دکن کالج سے دوسرا ایم اے کیا۔ پی ایچ ڈی کے بعد پہلا تقرر شعبۂ اردو کشمیر یونی ورسٹی میں ہوا، پھر مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے وہاں سے دہلی چلے آئے اور تقریباً تیس برس جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی کے ہندستانی زبانوں کے مرکز سے وابستہ رہے۔ اسی دوران مرکز کے دو مرتبہ چیئرپرسن بھی رہے۔ سینئر پروفیسر کی حیثیت سے سبکدوش ہونے کے بعد یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کے ایمرٹس فیلو بنائے گئے۔ اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونی ورسٹی (اگنو) نئی دہلی میں سینئر صلاح کار اور رابطہ کار کی حیثیت سے کام کیا۔ اس دوران وہاں شعبۂ اردو قائم کیا۔ سرٹی فکیٹ، ڈپلوما اور گریجویشن پروگراموں کے کور سیز تن تنہا ترتیب دیے اور ان کے لیے بارہ کتابیں مرتب کرکے شائع کیں۔ ہندستان کے مختلف صوبوں میں 28 مخصوص اردو اسٹڈی سینٹرز قائم کیے جہاں ہزاروں کی تعداد میں طلبا آج اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ آج کل آپ اردو ایڈیٹر کے طور پر اگنو ہی سے وابستہ ہیں۔

پروفیسر نصیر احمد خاں کی زیرِ نگرانی 110 ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریوں کے لیے مقالے لکھے گئے ہیں۔ تقریباً سبھی فارغ التحصیل طلبا مختلف اداروں اور یونی ورسٹیوں میں برسرروز گار ہیں۔ حال ہی میں سی آئی آئی ایل، میسور میں ان کے ایک طالب علم کا بحیثیت وائس چانسلر تقرر ہوا ہے۔ آپ نے علمی اور ادبی سرگرمیوں کے تحت کئی ممالک کے دورے کیے ہیں جن میں امریکہ، کناڈا، برطانیہ، جرمنی، فرانس، ہنگری، روس اور ازبکستان خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں اردو قواعد، ادبی اسلوبیات، اردو انشائیہ، اردو لسانیات، اردو کی بولیاں اور جدید ہندی اردو لغت جو تقریباً ساڑھے تین ہزار صفحات پر مشتمل ہے اہم ہیں۔ مزید برآں اردو لغت بھی مکمل ہو چکی ہے جو دنیا میں اپنی نوعیت کی پہلی صوتی لغت ہے انگریزی میں اردو زبان و ادب کی تاریخ جلد ہی منظرِ عام پر آرہی ہے۔ زبان، ادب، قواعد، شاعری، فکشن، غیر افسانوی نثر، تنقید، مہجری ادب کے عنوانات کے تحت آٹھ جلدوں میں اردو زبان و ادب کی تاریخ کے ایک پروجیکٹ پر کام چل رہا ہے جس کے جلد ہی منظر عام پر آنے کی توقع ہے۔ آپ نے مادری زبان کے ذریعے ایک ووکیشنل تربیتی پروگرام بھی تیار کیا ہے جس کے ذریعے مادری زبان والوں کے لیے روزگار کے مواقع فراہم ہوں گے۔ اس سلسلے میں اترپردیش حکومت اور وزارت اقلیتی امور، حکومت ہند سے مذاکرات جاری ہیں۔ اردو میں پچاس ووکیشنل کورسیز کی فراہمی کے لیے ڈائریکٹر آئی او این ایس اور اگنو سے بات چل رہی ہے۔

اردو تعلیم و تدریس کی موجودہ صورتِ حال پر بات کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ ہمیں اپنے نصابوں پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ پوسٹ گریجویٹ کے نصابوں کے موضوعات میں تیس فی صد تکرار ہے جو وقت کا زیاں ہے۔ ان کی جگہ ایسے نئے کورسوں کو متعارف کرانا چاہیے جو وقت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوں اور روزگار کی ضمانت دیتے ہوں۔ نصاب میں کون کون سے نئے کورسیز شامل ہونے چاہیے، اس کا جواب دیتے ہوئے آپ نے کہا " میں نے اپنے ایک مضمون میں تفصیل سے ذکر کیا ہے جو آپ کی 'اردو دنیا' میں بھی چھپا ہے۔ چند کورسیز یہ ہیں: اسلوبیات، مہجری ادب، اردو کے سماجی و تہذیبی ادارے، فیچر رائٹنگ، اسکرپٹ رائٹنگ، صحافت، ترجمہ کی تیکنیک، اردو ادب میں عورت وغیرہ۔ ان میں سے بیشتر کورسیز جواہر لال نہرو یونی ورسٹی اور اگنو کے نصابوں میں شامل ہو چکے ہیں۔" آپ نے اس بات پر بھی زور دیا کہ یونی ورسٹی کے بڑے شعبوں میں ماہرِ دکنیات اور ماہرِ لسانیات کے ایک ایک استاد کا تقرر ضروری ہے تاکہ طلبا دکنیات اور لسانی شعور کو بھی اپنے علم کا حصہ بنا سکیں۔) حال ہی میں جواں سال ادیب و شاعر معید رشیدی نے ان سے 'اردو دنیا' کے لیے خصوصی انٹرویو لیا ہے جو اردو دنیا کے قارئین کی نذر کیا جارہا ہے:

معید رشیدی: زیادہ تر اردو والے اپنی ذات میں کھوئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

نصیر احمد خان: انسانی سوچ کے تین محور ہوتے ہیں؛ فرد، سماج اور نظریہ۔ نظریہ قائم کرنا اعلیٰ ترین سوچ کہلاتی ہے۔ اردو والوں کی سوچ فرد میں پھنسی ہوئی ہے۔ ہم صرف فرد کے بارے میں سوچتے ہیں خواہ وہ اپنی ذات ہو یا مصلحت کے تحت کسی دوسرے کی ذات۔ ہمارے یہاں 'میں' اتنی زیادہ ہے کہ اس نے ہم اردو والوں کو بھیڑ بکریاں بنا کر رکھ دیا ہے۔ زوال پزیر معاشرے کی یہی علامت ہوتی ہے۔

م ر: اردو میں تحقیق کی صورتِ حال پر کچھ اظہارِ خیال کیجیے۔

نصیر احمد خان: تحقیق کیا ہے؟ جو نہیں ہے وہ ہے اور اسے اس طرح کھوج نکالنا کہ اس میں صراحت، وضاحت، معروضیت اور قطعیت چاروں باتیں ایک نظام کی طابع ہو کر سامنے آ جائیں۔ ہمارے یہاں لکھے جانے والے اکثر تحقیقی مقالے اس کی ضد ہیں۔ کیا، کیوں، کتنا اور کیسے ان سوالوں کے گرد تحقیق گھومتی ہے اور ان کے جوابات میں کوئی نتیجہ اخذ کرتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں کسی سوال کا صحیح جواب نہیں ہوتا۔ ہمارے اکثر تحقیقی مقالے حیات اور کارناموں میں الجھے رہتے ہیں۔ یہ اُس شاعر یا ادیب پر تحقیق کا ایک موضوع تو ہو سکتا ہے جو پہلی دفعہ دریافت ہوا ہو لیکن میر، غالب، یا اقبال کو لے کر حیات اور کارنامہ تحقیق کا موضوع نہیں بن سکتا کیونکہ اِن حضرات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اردو تحقیق میں ہم اپنے کو دہرا رہے ہیں۔ بیشتر یونی ورسٹیوں میں پی ایچ ڈی نوکری حاصل کرنے کے لیے کرائی جاتی ہیں۔ تحقیق میں ہماری ایک بدشعاری یہ ہے کہ ہم اب تک تحقیق کی زبان کے معیار کا تعین تک نہیں کر سکے۔ تحقیق ایک بے حد سنجیدہ عمل ہے لیکن ہم اکثر شاعرانہ ڈکشن سے اُسے دیکھتے ہیں اور استعاراتی لہجے میں بات کرتے ہیں۔ کلیم الدین احمد کے جملے دیکھیے: ''اردو غزل ایک نیم وحشی صنفِ سخن ہے''

یا ''اردو تنقید معشوق کی موہوم کمر ہے''۔ خورشید الاسلام کے مشہور جملے یہ ہیں ''شبلی پہلے یونانی ہیں جو ہندستان میں پیدا ہوئے'' 'یا'' شبلی اگر شاعر نہ ہوتے تو مصور ہوتے'' یہ جملے بے حد بلیغ ہیں لیکن تحقیق کی سنجیدگی ایسے جملوں کی اجازت نہیں دیتی۔ ہمارے یہاں آل احمد سرور اور محمد حسن جیسے قد آور دانشور اور تنقید نگار بھی اپنی تحریروں میں لسانی چٹخاروں سے نہ بچ سکے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ سیمیناروں اور کانفرنسوں میں جب مقالے پڑھے جاتے ہیں تو بیچ بیچ میں مشاعروں جیسی داد، خیال پر نہیں، پھڑکتے ہوئے جملوں پر ملتی ہے۔ آج کل لکھے جانے والے اکثر مضامین تنقیدی انشائیے ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں غیر سنجیدگی کا یہ عالم ہے کہ سیمیناروں میں پڑھے جانے والے مضامین دورانِ سفر یا منعقد ہونے والے شہر میں دورانِ قیام رات یا صبح کے کسی حصے میں لکھے یا مکمل کیے جاتے ہیں۔ سب سے بیہودہ بات یہ ہے کہ میر پر لکھا گیا مضمون نام بدل کر فانی پر پڑھ دیا جاتا ہے اور مومن کی شاعری کا مضمون حسرت موہانی پر جبکہ ہونا یہ چاہیے کہ فیض اور مجروح کے اسالیب جو بظاہر ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں، اپنی شناختوں کے بیان میں الگ ہونے چاہیے۔ دراصل ہمارے پاس چند الفاظ، تراکیب، مرکبات اور فقرے ہوتے ہیں جنھیں ہم ایک دوسرے پر ٹھوکتے رہتے ہیں۔

م ر: یونی ورسٹیوں میں ہونے والی تحقیق پر آپ کا کیا خیال ہے؟

نصیر احمد خان: یونی ورسٹیوں میں تحقیق منصوبہ بند طریقے سے ہونی چاہیے۔ یونی ورسٹیاں ایسے موضوعات کا انتخاب کریں جو Problemetic ہوں اور ہمیں نہ صرف کسی نتیجے پر پہنچائیں بلکہ ہماری حسیت میں بھی اضافہ کریں۔ ہمارے یہاں نظریہ سازی کے لیے بڑی تحقیق اس لیے نہیں ہو پا رہی ہے کہ ہم بنیادی ریسرچ سے ہی محروم ہیں۔ میں نے اپنی چیئرمین شپ میں یہ طے کیا تھا کہ 18 ویں صدی کے شعرا کو لے کر ان کی حیات، عہد اور فن پر طلبا سے ایم فل کے لیے تحقیقی مقالے لکھواؤں گا۔ نتیجتاً آج اٹھارہویں صدی کے تمام اردو شعرا پر جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی میں مواد موجود ہے۔ جس کی بنیاد پر کوئی بڑی تحقیق ہو سکتی ہے۔ NCPUL کو چاہیے کہ ہندستان کی تمام یونی ورسٹیوں کی تحقیقی سرگرمیوں کا DATA اپنے یہاں محفوظ رکھے تاکہ جانکاری کے علاوہ رابطہ کاری میں بھی آسانی ہو۔

م ر: آپ نے انگریزی زبان میں اردو زبان و ادب کی تاریخ لکھی ہے۔ اب اس تاریخ کو آپ آٹھ جلدوں میں اردو میں لکھ رہے ہیں اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

نصیر احمد خان: اوّل تو اردو میں ایسی کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی ہے جس میں اردو زبان اور اردو ادب دونوں شامل ہوں۔ دوسرے میں نے اردو کی تاریخ ہندستان کی مشترکہ تہذیب کے پس منظر میں لکھی ہے جو غالباً بالکل نئی Approach ہے۔ ہماری زبان اسی تہذیب کی دین ہے اور ادب بھی ایک حد تک اسی شناخت کا حصہ ہے۔ اردو کو مشترکہ تہذیب کی علامت کہا جاتا ہے۔ یہ اعزاز

ہندستان کی کسی دوسری زبان کو حاصل نہیں ہے۔اس کے علاوہ اردو کی مرکزی حیثیت ہے، دوسری زبانیں علاقائی کردار رکھتی ہیں۔ اردو اپنی مرکزیت کی وجہ سے نہ صرف ہندستانی بلکہ سارک ممالک میں رابطے کی زبان بن گئی ہے۔

م ر: اردو کا تعلیمی معیار بہت گر چکا ہے اس کی کیا وجہ ہے۔

نصیر احمد خان: اس کی بنیادی وجہ نا اہل لوگوں کا تقرر ہے۔ سنا ہے یونی ورسٹیوں کی تقرریوں میں اب پیسے بھی چل رہے ہیں۔ اللہ اپنا رحم کرے۔ درس گاہیں مندروں اور مسجدوں کی طرح مقدس ہوتی ہیں۔ایک میں حق کی تلاش ہوتی ہے اور دوسرے میں حق کی پوجا۔ یونیورسٹیاں اور کالج بھی عبادت گاہیں ہیں مسجد اور مندر کی طرح انھیں بھی بدکاروں سے بچا کر رکھنا چاہیے۔ دوسری وجہ ہمارے یہاں کمٹمنٹ کی کمی ہے اور تیسرے شاعری زدہ ذہن ہمیں آگے سوچنے ہی نہیں دیتے۔ اکثر لوگ شعر کی صحیح قرات اور فہم کو اردو دانی کی معراج سمجھتے ہیں جبکہ ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں''۔ اردو کو مادری زبان ہونے کی وجہ سے گھر کی لونڈی سمجھنے کے بجائے دوسرے علوم کی طرح ایک ڈسپلن کے طور پر لینا چاہیے۔

م ر: ہمارے سیمینار تفریح طبع کا سامان ہو کر رہ گئے ہیں۔ زیادہ تر سیمیناروں میں سنجیدہ باتیں نہیں ہوتیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

نصیر احمد خان: اس پر ہم پیچھے بحث کر چکے ہیں... دراصل ہم اردو والے ذہنی قبض کا شکار ہیں اور علمی معاملات میں بالکل سنجیدہ نہیں۔ ہر شخص ہر موضوع پر اپنے کو ماہر سمجھتا ہے۔ منتظمین کو اس کی فکر رہتی ہے کہ مجمع کیسے اکٹھا ہو۔ سیمینار میں جتنے زیادہ لوگ ہوں گے اُسے اتنا ہی کامیاب سمجھا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں میں نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے مسائل پر ایک سیمینار کیا تھا سیمینار میں ان حضرات کو مدعو کیا گیا تھا۔ جو موضوع پر دسترس رکھتے ہوں۔ غیر متعلق لوگوں کو بولنے کی اجازت نہیں تھی اور تماش بینوں کو ہال سے دور رکھا گیا تھا۔ اس پر کافی اعتراضات ہوئے لیکن میں اپنی جگہ صحیح تھا کیونکہ ایک سنجیدہ موضوع پر سنجیدہ بحث کے لیے ماہرین کو مدعو کیا گیا تھا تا کہ بحث و مباحثے کے بعد کسی نتیجے پر پہنچ کر اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ یہی سیمینار کا مقصد تھا اور بس۔

م ر: آج کل اردو میں مغربی نظریات پر کافی بحث ہوتی ہے۔ہم اپنے ادب میں مشرقی انداز فکر سے دور بھاگ رہے ہیں۔اس کی کیا وجہ ہے؟

نصیر احمد خان: ادب میں مغرب پسندی اچھی بات ہے کیونکہ چراغ سے ہی چراغ جلائے جاتے ہیں لیکن مغرب پرست ہو کر اپنی سوچوں پر مغربی پہرے بٹھانے کے میں خلاف ہوں۔ اس سے غلامی کی بھی بو آتی ہے۔ ہر نظریہ اپنے سیاق سے قائم ہوتا ہے لیکن مشرقی سیاق کو نظر انداز کر کے مغربی اصول نقد سے اردو ادب کی تفہیم و تشریح کرنا میرے خیال میں مناسب نہیں ہے۔ ہم نے مغرب کی حقیقت پسندی کے تصور کے چکر میں ناول کے مقابلے میں اپنی داستانوں کو اس لیے رد کر دیا تھا کہ اس میں مافوق الفطرت عناصر ہوتے ہیں۔ پھر آج پورے مغرب میں ہیری پوٹر کی دھوم کیوں ہے؟ اس کے علاوہ ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ داستانیں نہ صرف ہماری تہذیب کی عکاس ہیں بلکہ تاریخی ریکارڈ بھی۔ میرا یہ بھی یقین ہے کہ داستانوں کو پڑھے اور اس کے بیانیہ کو

پروفیسر نصیر احمد خاں: حالات وکوائف

نام: نصیر احمد خاں **تاریخ پیدائش:** یکم جنوری 1944

وطن اور جائے پیدائش: مارہرہ شریف، ضلع ایٹہ، اتر پردیش (وطن)، پیدائش (مین پوری)

تعلیم: ایم اے (لسانیات، دکن کالج، پونہ)، ایم اے (اردو ادب، پی ایچ ڈی) مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ) سمر اسکول لسانیات (ممبئی)

درس و تدریس: شعبۂ اردو (کشمیر یونی ورسٹی، سری نگر)، شعبۂ لسانیات (مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ)، ہندستانی زبانوں کا مرکز (جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی)، اسکول آف ہیومیٹیز (سبکدوش ہونے کے بعد)، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونی ورسٹی، نئی دہلی۔

پہلی تخلیق کاوش: افسانہ (1965) **کتابیں:** (1) اردو کی بولیاں اور کرخنداری، 1979 (2) لسانیات کیا ہے (ترجمہ: 1983) (3) اردو لسانیات، 1987 (4) ادبی اسلوبیات، 1989 (5) آزادی کے بعد اردو انشائیہ 1990 (6) اردو ساخت کے بنیادی عناصر، 1991 (7) اردو In two weeks : ریڈنگ اینڈ رائٹنگ، 1995 (8) اردو کا مہجری ادب (یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کا میجر پروجیکٹ، 1996، (9) اردو اور ہندی کا لسانی رشتہ (یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کا میجر پروجیکٹ، 2003 (10) جدید ہندی اردو لغت، 2006، (11) انگریزی، ہندی اور اردو میں انسانی و سماجی علوم کی اصطلاحات کی فرہنگ، 2007، (12) اردو زبان و ادب کی تاریخ، 2009، (13) ترجمہ کا فن، 2010، (14) عصری اردو شاعری، 2010 (15) عصری اردو فکشن، 2010، (16) اردو کا غیر افسانوی ادب، 2011، (17) اردو شاعری کا ارتقا، 2011، (18) اردو فکشن کا ارتقا، 2012، (19) اردو زبان و ادب کی تاریخ (انگریزی: زیرِ طبع)، (20) اردو کی صوتی لغت (زیرِ طبع)، (21) اردو کا سرٹی فکیٹ کورس (ہندی اور انگریزی میں: زیرِ طبع)، (22) اردو زبان کی تاریخ (زیرِ ترتیب)، (23) اردو کی ترویج و اشاعت کے تہذیبی ادارے (زیرِ ترتیب)، (24) اردو زبان و ادب کی تاریخ کے پروجیکٹ پر کام چل رہا ہے (آٹھ جلدیں)۔

دیگر مصروفیات: علمی و ادبی سرگرمیوں کے علاوہ اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونی ورسٹی، نئی دہلی میں شعبۂ اردو قایم کیا۔ سرٹی فکیٹ، ڈپلوما اور بی اے (آنرز) کے پروگرام شروع کرائے۔ ملک گیر پیمانے پر اردو کے 28 خصوصی اسٹڈی سینٹر قائم کیے جہاں ہزاروں طلبا اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں چیر پرسن کی حیثیت سے ہندی میں ترجمہ میں ایم فل اور اردو میں ماس میڈیا کے پوسٹ گریجویٹ کورسیز متعارف کرائے۔ سینٹر میں تامل چیئر قائم کی۔ اردو اور ہندی کورسوں کی جدید کاری کی۔ کبیر یادگاری توسیعی خطبوں کا اہتمام کیا۔ اس کے علاوہ ان کے زیرِ نگرانی ایک سو نو اردو طلبا نے ایم فل/ پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں، خواجہ معین الدین چشتی عربی فارسی اردو یونیورسٹی کے بانی سرپرستوں میں شمار ہوتا ہے۔ IGNOU سے ایک MOU سائن کرایا تا کہ IGNOU کی طرز پر مدارس کے طلبہ کے لیے بھی Vocational Cources کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔ UGC سے ایک خطیر رقم اس کام کے لیے مختص کرائی۔

بیرونی ممالک کا سفر: امریکہ، کناڈا، برطانیہ، ہنگری، جرمنی، فرانس، روس، ازبکستان اور تاجکستان ممالک کے کئی دورے کیے۔

سمجھے بغیر ہم اردو کے لسانی مزاج کو نہیں سمجھ سکتے اور نہ ہی اپنی لسانی لکنت پر قابو پا سکتے ہیں۔ یہاں! مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ پچھلے دنوں جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی میں دریدا سے اس کی ادبی تھیوری پر سوال کیا گیا تھا تو اس نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''آج آپ اس نظریے پر بحث کر رہے ہیں۔ جسے میں پچاس برس پہلے ہی بھول چکا ہوں۔

م ر: اردو کے حوالے سے لسانیات کے علم پر کچھ روشنی ڈالیے؟

نصیر احمد خان: لسانیات زبانوں کا علم ہے۔ جس زبان کو لے کر آپ یونی ورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اگر اس کی لسانی نزاکتوں اور مزاج سے ناواقف ہیں تو بلا شبہ آپ کے علم حاصل کرنے میں کوئی کمی ہے۔ اردو کے طالب علموں کے اندر لسانی شعور نہیں ہے۔ آج اس علم کی ناواقفیت کی وجہ ہی سے صورتِ حال اتنی بگڑ گئی ہے کہ استاد مُتنوّع کو مُتنوُ ع تلفظ کرتے ہوئے بھی شرم محسوس نہیں کرتے۔ میرے خیال میں یونی ورسٹیوں کے شعبہ اردو میں لسانیات کا ایک استاد ضرور ہونا چاہیے تا کہ نصاب میں زبان کے حصے کو قواعد اور اسلوب کے حوالے سے قاعدے سے سمجھایا جا سکے۔

م ر: ہمارے یہاں املا کا بھی ایک مسئلہ ہے؟

نصیر احمد خان: اردو زبان کے تلفظ اور املا کا برا حال ہے۔ اردو زبان کروڑوں لوگوں کے درمیان بولی، سمجھی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے لیکن ہمارے پاس کوئی صوتی لغت نہیں ہے حوالہ جاتی قواعد نہیں ہے۔ پہلی اور دوسری زبان پڑھانے کے فرق کو سمجھتے ہوئے زبان سکھانے کے طریقہ کار نہیں ہیں۔ اس سے بڑھ کر ہماری بے حسی اور کیا ہوگی کہ ہم زبان اور بولی کی سائنٹی فک توجیح نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس زبان کے علاقائی، سماجی اور لسانی لہجوں کو سمجھنے کا شعور بھی نہیں ہے ہم اپنے املا کی طرف بھی غیر سنجیدہ ہیں۔ کچھ آوازیں تو ایسی ہیں جو املا میں اکثر لکھی ہی نہیں جاتیں۔ املا میں بعض جگہوں پر حرف صحیح اور حرفِ علّت کا فرق نہیں ہوتا، جیسے احسان اور میاں میں <اُسے اور ی > وغیرہ۔ اگر ہم < ی > آواز کو لفظ کے درمیان دو نقطوں کے نیچے کھڑا الف اور اؤ کے لیے واو کے اوپر الٹا پیش لگانے کو لکھنے کا لازمی حصہ بنالیں اور اس پر سختی سے عمل کریں تو بیس فیصد ہم اپنی املا کی کوتاہیوں پر قابو پا سکتے ہیں۔ یہ کام NCPUL اپنے پبلیکیشن ڈویزن کو ہدایت دے کر بڑی آسانی سے کر سکتا ہے۔ اس طرح پانچ پانچ سال بعد ایک ایک بے ضابطگی کو لے کر چلیں تو تیس چالیس سال میں نوے فیصد سے زیادہ رسم الخط کی کوتاہیوں پر قابو پا سکتے ہیں۔ ایک زبان کے املا کو درست کرنے کے لیے یہ وقفہ کم ہے۔ کیا ہم اپنے بزرگوں سے بھی گئے گزرے ہیں جنھوں نے صدیوں پہلے لسانی کوتاہیوں کو درست کیا تھا۔

م ر: اردو عربی فارسی یونی ورسٹی (لکھنؤ) کے آپ بانی سرپرستوں میں سے ہیں۔ کیا آپ وہاں کی کارکردگیوں سے مطمئن ہیں۔

نصیر احمد خان: وہاں کے وائس چانسلر میرے دوست ہیں جو بے حد فعال ہیں۔ انھوں نے بہت کم وقت میں یونی ورسٹی بنا کر کھڑی کر دی جس کی انھیں دل سے مبارک باد دینی چاہیے اور قوم کو ان کی قدر کرنی

> **تحقیق کیا ہے؟ جو نہیں ہے وہ ہے اور اسے اس طرح کھوج نکالنا کہ اس میں صراحت، وضاحت، معروضیت اور قطعیت چاروں باتیں ایک نظام کی طابع ہو کر سامنے آ جائیں۔ ہمارے یہاں لکھے جانے والے اکثر تحقیقی مقالے اس کی ضد ہیں۔ کیا، کیوں، کتنا اور کیسے ان سوالوں کے گرد تحقیق گھومتی ہے اور ان کے جوابات میں کوئی نتیجہ اخذ کرتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں کسی سوال کا صحیح جواب نہیں ہوتا۔ ہمارے اکثر تحقیقی مقالے حیات اور کارناموں میں الجھے رہتے ہیں۔**

چاہیے۔ یونی ورسٹی کی اپنی عمارت ہے، اپنا نصاب ہے، اپنے استاد ہیں۔ درس و تدریس کے علاوہ امتحانات بھی شروع ہو گئے ہیں۔ یہ سب کام چار پانچ برسوں میں ہوا جو کمال کی بات ہے۔ میری کوششوں سے یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن سے ادارے کو ایک خطیر رقم بھی ملی ہے۔ اگنو سے ایم او یو بھی سائن ہوا ہے۔ اب میری خواہش ہے کہ وہاں روایتی تعلیم کے ساتھ ایسے ووکیشنل تربیتی مراکز بھی قائم کیے جائیں جو خصوصاً مدرسوں کے طالب علموں کو اعلیٰ تعلیم کے ساتھ روزگار کی ضمانت بھی دیں۔ ہم لوگوں نے ایگزیکیٹو کونسل سے اس پروگرام کی منظوری لے لی ہے۔ اس کے علاوہ کونسل سے مرکز برائے لسانی تحقیق کے قیام کو بھی منظور کرالیا ہے۔ یہ ہندستان میں اپنی نوعیت کا واحد مرکز ہوگا جہاں اردو زبان و قواعد اور ان سے متعلق مختلف موضوعات پر اعلیٰ تحقیق ہوگی۔

م ر: اردو زبان کی ترقی کے لیے این سی پی یو ایل کو آپ کی نظر میں اور کیا کرنا چاہیے۔

نصیر احمد خان: اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے آپ کا ادارہ کئی کام کر رہا ہے؛ جیسے کتابوں کی اشاعت، ترویج و اشاعت کے لیے مالی تعاون اور کمپیوٹر کورسیز وغیرہ اگر آپ حروف شناسی کو ایک مہم کے طور پر لیں اور اردو کے اپنے سرٹی فکیٹ اور ڈپلوما کورسیز درست کر لیں تو اردو کے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

م ر: آپ نے اردو کی صوتی لغت مرتب کی ہے جو شاید اپنی نوعیت کے اعتبار سے دنیا کی پہلی لغت ہے۔ اس پر کچھ اظہارِ خیال کیجیے۔

نصیر احمد خان: صوتی لغت چھپنے کے بعد ہی معلوم ہوگا کہ یہ آپ لوگوں کے لیے کتنی مفید ہے۔ اس کو مرتب کرتے وقت میں نے جن باتوں کو مدِنظر رکھا ہے وہ یہ ہیں:

(1) اردو زبان کے معیاری تلفظ کی نشان دہی
(2) آوازوں اور حروف کے درمیان رشتوں کی وضاحت
(3) اردو کے صوتی نظام کی تشکیل
(4) املا میں نظر انداز ہونے والی آوازوں کی پہچان
(5) تلفظ کے درمیان الفاظ کے تلفظ میں تغیر و تبدل
(6) مخارج اور طریقِ ادائگی کے اعتبار سے آوازوں کی تشریح
(7) معنوں کی ترجیح!
(8) آوازوں کی رکنوں اور رکنوں کی لفظوں میں تقسیم
(9) الفاظ کے مآخذ
(10) الفاظ کی نحوی حیثیت وغیرہ

م ر: اردو والوں کے لیے کوئی پیغام

نصیر احمد خان: اردو والوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ مادری زبان کہنے والے تعلیم یافتہ لوگ اگر اردو لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتے تو وہ آدھے جاہل ہیں کیونکہ تاریخ، ادب، مذہب، تہذیب اور شناخت کا ہمارا آدھا علم تو مادری زبان میں ہوتا ہے۔ اگر آپ اپنی بنیادوں سے ہی ناواقف ہوں گے تو آپ کا تعلیم یافتہ ہونا چہ معنی دارد!

■

Moid Rasheedi, Research Asst. NCPUL,
FC 33/9,Institutional Aria, Jasola, New Delhi -110025

Prof. Naseer Ahmad Khan, House No.8,
Masjid Compound, Defence Enclave,
Vasant Kunj Road, New Delhi - 110037

مظفر حسین سید

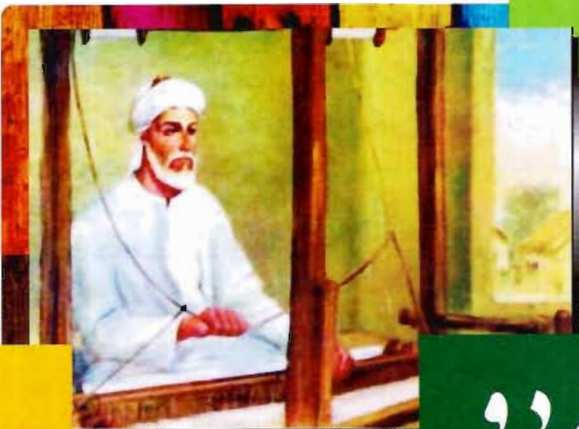

سنت کبیر داس

ہندوستانیت اور اردو

اردو زبان و ادب میں ہندوستانیت کو ڈھونڈنا ایسا ہی ہے جیسے سمندر میں سمندر کو تلاش کرنا۔ یہ عظیم زبان ہندوستانیت کی ہی تخلیق ہے۔ چنانچہ اس کا ادب بھی دنیا کی اُس عظیم تر تہذیبی و ثقافتی وراثت سے الگ نہیں رہ سکتا جسے دنیا ہندوستانی مشترکہ تہذیب کے نام سے جانتی پہچانتی ہے۔ زیرنظر کور اسٹوری میں اردو کے وسیع و عریض شعری اور نثری سرمایے پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر اردو کے ضمیر میں ہندوستانی خمیر کی کیمیاگری کو سمجھنے کی چھوٹی سی کوشش کی گئی ہے۔ اس جائزے میں نثری ادب کا حصہ شعری ادب کے مقابلے میں دبا ہوا ضرور ہے۔ لیکن شعری ادب سے متعلق مضامین میں وہ بیش تر امور بیان ہوگئے ہیں جن کا اطلاق بحیثیت مجموعی تمام اردو ادب پر ہوتا ہے۔ اس کاوش پر آپ کے تاثرات کا ہمیں انتظار رہے گا۔ (ادارہ)

زیرنظر موضوع دلچسپ بھی ہے بامعنیٰ بھی اور قدرے پیچیدہ بھی۔ دلچسپ اس طرح کہ ہندوستان جنت نشان کی سب سے دلنشیں و شیریں زبان کو ہندوستانی خلقیے کی علامت قرار دیا گیا، بامعنیٰ اس طور کہ اس کو براہِ راست 'ہندوستانیت' کے کثیرالجہت و بلیغ تصور سے منسلک کیا گیا ہے، اور پیچیدہ اس اعتبار سے کہ بات ارتقا سے شروع ہوکرفروغ تک پہنچتی ہے، تاہم اس عنوان کا یہ پہلو غیرواضح رہ گیا ہے کہ دراصل ہندوستانیت، کا وجود بلکہ اس کی پیدائش ہی ازخود اردو کی رہین احسان ہے۔ 'ہندوستانیت' سے اردو کا گہرا رشتہ ہی نہیں بلکہ یہ زبان ہی اُس مشترکہ ثقافت کی تولید ونمو کا باعث اصل ہے، جسے 'ہندوسانیت' کے وسیع المشرب عنوان سے موسوم کیا گیا ہے، اس مفہوم کوگر یوں عبارت کریں کہ ہندوستانیت اور اردو لازم وملزوم ہیں، یک جان دو قالب ہیں، ایک دوجے کے بغیر دونوں کا تصور ہی ممکن نہیں، تو یہ نظریہ نہ تو مبالغے پرمبنی ہوگا، نہ منطقی حدود سے متجاوز، یوں بھی کہ ان دونوں کا حسین امتزاج و اشتراک ہی روشن خیالی، رواداری، حب دانش، حقیقی جستجوئے علم، نیز تلاش حق کا سرچشمہ ہے، یہی اوصاف بے مثل اردوتہذیب کے مزاج کا بنیادی عنصر اور ہندوستانیت کی اصل روح ہیں۔

اب سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ اپنی اصل کے اعتبار سے ہندوستانیت کیا ہے اور یہ اصطلاح کس طرح وجود پذیر ہوئی۔ جید عالم و دانشور سید عابد حسین نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف 'ہندوستان کا قومی تمدن' میں ہندوستان کی قومی تہذیب و ہمہ جہت ثقافت کی جوتعریف متعین کی ہے، اس کا بہترین ممکن عنوان 'ہندوستانیت' ہی ہوسکتا ہے۔ اس ضمن میں عظیم شاعرودانشور رابندرناتھ ٹیگور نے ہندوستانی معاشرے کی عظمت کے ادراک، نیز اس کی رنگارنگ ثقافت کی روح تک رسائی کے وسیلے کے طور پر اس ملک کی تاریخ کے صدیوں پرمحیط ادوار کے ذہنی سفر کی وکالت کی ہے۔ تاہم مذکورہ بالا ہردو مفکرین کے نظریات کی روشنی میں ہندوستانیت کا ماخذ واضح طور پر ابھر کر سامنے نہیں آتا۔

اس مرحلے پر ایک مختصر سی لسانی بحث لازم ہے کہ اوّلاً لفظ 'ہندوستان' کس طور پر وجود میں آیا، اور اس کے ساتھ یہ کہ لفظ 'ہندو' کا منبع کیا ہے۔ ایک دلچسپ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ لفظ 'ہندو' اس ملک کی آریائی لفظیات میں کہیں موجود نہیں تھا، قبل ازآمد اسلام یہاں کی اکثریت کے مذہب کا نام ویدی عقیدے یا آریائی ملک تو ہوسکتا تھا۔ تاہم 'ہندومت' یا ہندو مذہب' کے وہ معنیٰ جو آج مستعمل ہیں، ہرگز موجود نہ تھے۔ اس ذیل میں ناقابل تردید استناد تو شاید دستیاب نہ ہو، لیکن قیاساً یہی باور کیا جاسکتا ہے کہ جب عرب اس سرزمین پر شمال مغرب کی سمت سے وارد ہوئے اور دریائے سندھ کے کنارے خیمہ زن ہوئے تو انھوں نے لفظ سندھو کو اپنی سہولت ادائی کے لیے بدل کر 'ہندو' کردیا، اور یہاں کے باشندوں کے لیے یہی نام تجویز کردیا، اس طرح اس مسلک کی مذہبی اکثریت کو ایک نیا نام حاصل ہوا، اور اسے ایسا قبول عام حاصل ہوا کہ آج شاید علم قدیم کے بڑے سے بڑے عالم کو بھی یہ یاد نہ ہو کہ لفظ 'ہندو' عربوں سے مستعار ہے۔ بعد ازاں اس لفظ کو ترکوں اور ایرانیوں نے بھی برقرار رکھا۔ اور پھر اس کی مناسبت سے اس سرزمین کو 'ہندوستان' کا نیا نام تفویض ہوا۔ شاید اس صراحت کی ضرورت نہیں کہ لفظ 'ہندوستان' بہ نفیس نفیس فارسی الاصل ہے، اس کے معنیٰ ہیں، ہندوؤں کا مسکن، ان کا علاقہ یا ان کا ملک۔ صدیوں بعد اس لفظ کو خود ہندی دانوں نے یوں اپنایا کہ اسے بدل کر 'ہندوستان' کردیا، یعنی ہندوؤں کا استھان (جگہ)— فارسی کی جانشین کی حیثیت سے اردو نے لفظ ہندوستان کو اپنایا، رائج کیا اور بتدریج اسے ایک علامت بھی بنادیا اور پھر اسی لفظ ہندوستان کی بنیاد پر لفظ ہندوستانیت کا وجود ہوا، اور ایک نیا تخیل، نیا تصور، نیا خلقیہ مجسم ہوا۔ تو یہ ہے 'ہندوسانیت' کا ماخذ اور اس کی اصل اس طرح 'ہندوستانیت' کی بحث کہیں سے کہیں تک

پہنچ گئی، درحقیقت یہ گفتگو ثقافتی نوعیت کی ضرور ہے، مگر اس کا تجزیہ لسانی مبحث سے فرار حاصل نہیں کرسکتا۔

اب ایک انتہائی دلچسپ، بامعنی اور برمحل حوالہ۔ جے پور کے تاریخ ساز سالانہ ادبی میلے میں گزشتہ برس یا اس سے قبل کے برس ایک اجلاس کا عنوان تھا 'اردو میں ہندوستان' ذرا غور فرمایئے کہ مہتممین و محرکین جلسہ نے ایک عمومی فقرے 'ہندوستان میں اردو' نہیں بلکہ اردو میں 'ہندوستان' کو موضوع قرار دیا۔ یہ دوسرے الفاظ میں اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ اردو کتنی وسیع المعنیٰ اور کثیرالجہت شے ہے، جس کے دامن میں ہندوستان بستا ہے، سوچیے، سر دھنیے اور داد دیجیے۔ ان دانشوروں کی فہم و جرأت کی جنھوں نے اس موضوع کا انتخاب کیا۔ اس اجلاس میں کلیدی خطبہ ہندی کے مشہور ادیب اشوک باجپئی نے پیش کیا تھا، انھوں نے اس موقعے پر جس دانشورانہ ایمانداری کا ثبوت دیا، اور جس طرح اردو کی ہمہ گیریت کا اعتراف اور اس کی دلنشینی کا اقرار کیا، وہ انداز خود قابل داد تھا۔ اور اسی پر آیت نہیں، اس اجلاس کے شرکائے بحث، جن میں مشرق و مغرب کے کثیرلسانی ادبا وعلما شریک تھے، ان سب نے یک زبان اردو کی، عصری افادیت و ہمہ جہت معنویت کی تلاش نو کی جوسعی جہری کی وہ اپنی مثال آپ تھی۔

بحیثیت ثقافت وتمدن 'ہندوستانیت' کے مواخذ اور بنیادوں کی تلاش، جستجوئے تحقیق کو اکبر اعظم تک پہنچاتی ہے اور داراشکوہ کے فکر وفلسفہ سے گزر کر بہادر شاہ ظفر تک آتی ہے، مغلوں کی حقیقت پسندی تھی کہ انھوں نے اپنی قلمرو کو 'سلطنت مغلیہ' کے شانہ بہ شانہ 'مملکت ہندوستان' قرار دیا اور غالباً پہلی بار ایک متحدہ ہندوستان کی تشکیل کی، اور پھر اسی کاوش کے بطن سے پیدا ہونے والی مغل تہذیب صدیوں کا سفر کرکے اردو تہذیب میں ڈھل گئی۔ ہندوستانیت دراصل اسی شجر کا ثمر ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی معاشرہ جیسا نیرنگ وگوناگوں ہے، اس کی مثال عموی طور پر یک معاشرتی دنیا میں نظر نہیں آتی، عرب سے ایران تک اور یوروپ سے چین اور جاپان تک، بیشتر ممالک کے سماج ایک ہی رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں، جب کہ یہاں ایک دوسرا ہی عالم ہے، ایک ہندوستان میں نہ جانے کتنے ہندوستان بستے ہیں اور ایک ہندوستانی معاشرہ نہ جانے کتنے معاشروں کے امتزاج سے وجود میں آیا ہے۔ وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کا فلسفہ یہی ہے، اور اردو ثقافت (پڑھیے، ہندوستانیت) اس کی سب سے جلی عبارت اور روشن علامت۔ کیا کسی اور معاشرت میں ایسی مثالیں دستیاب ہوسکتی ہیں کہ ایک مذہب کے معبد مرکزی کا سنگ بنیاد کسی دوسرے مذہب کا صوفی رکھے (دربار صاحب)، ایک مذہب کے مصحف میں دوسرے مذہب کے عارف کا کلام شامل ہو (گروگرنتھ صاحب) اور اس مشترکہ کلام کے اکثر داعی بھی سکھ نہیں مسلمان رہے ہوں، آخری سکھ گرو کا شاہکار فارسی زبان میں ہو (ظفرنامہ) کیا کوئی اور معاشرہ جس میں سجان رائے کھتری اور چندر بھان برہمن نام کے فارسی عالم ہوں، کیا کوئی اور مشترکہ تہذیب ہے جس میں بھگوان کرشن کے بھگت شعرا میں ملک محمد جائسی اور رس کھان نمایاں ہوں، اور پیغمبر اسلام، رسول اکرمؐ کے نعت گو حضرات میں متعدد غیر مسلم شعرا پیش پیش ہوں، برج بھاشا کے عظیم شاعر کا نام عبدالرحیم خان خاناں ہو، اور پنجابی کے سب سے بڑے شاعر کا نام وارث شاہ ہو— ایسا کوئی معاشرہ ہے جس میں فارسی کی اولین (ہندوستانی) لغت کے مولف کا نام ٹیک چند بہار ہو، اردو زبان کی اولین تاریخ کے مرتب ہونے کا شرف رام بابو سکسینہ جیسے عالم کو حاصل ہو۔ آریہ سماج، کی انجیل 'ستیارتھ پرکاش' اردو میں تصنیف کی گئی ہو، اردو کے جید عالم کا نام ماسٹر مہیش پرساد ہو، کانگریس ہی نہیں ہندو مہاسبھا کا تشہیری اور تبلیغی سرمایہ اوّل اوّل اردو میں تیار کیا گیا ہو، قبل از آزادیِ وطن اردو کے تمام بڑے اخبارات میں سے نصف غیر مسلم مالکان و مدیران کے تحت رہے ہوں— اس فہرست میں اگر اردو کے غیر مسلم شعرا کے اسمائے گرامی شامل کردیے جائیں تو یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا جائے گا، اس لیے صرف چند نام درج کیے جارہے ہیں اور زیادہ تر گفتگو اشاروں میں کی گئی ہے۔ دور حاضر میں بھی عبدالرحمٰن شاستری اور غلام دستگیر جیسے سنسکرت زبان و ادب کے علما نظر آتے ہوں، یہ مثالیں کس تہذیب اور کس معاشرے میں پائی جاسکتی ہیں؟ الغرض یہ سلسلہ لامتناہی ہے اور ایک علاحدہ مقالے کا متقاضی۔ یہاں ایک جملہ معترضہ پیش کیا جاسکتا ہے کہ مذکورہ قصوں میں سے اکثر داستان پارینہ ہیں، تاہم یہ ہمارا بیش قیمت اثاثہ ہے اور راقم الحروف اس نکتے پر مصر ہے کہ چنگاریاں ابھی باقی ہیں اور سازگار ماحول میں شعلہ بن کر نمایاں ہوسکتی ہیں، کاش یہ روشن روایات، یہ زندہ باقیات قائم رہیں، دراصل آج ہمارا سب سے بڑا تہذیبی مسئلہ یہی ہے۔

> اردو کی بدقسمتی یہ ہے کہ آج ملک میں اس کا اپنا علاقہ کوئی نہیں، اور خوش قسمتی یہ ہے کہ سارا ہندوستان اُس کا ہے، یہی اس کی کمزوری ہے، اور یہی اس کی طاقت۔ التماساً عرض ہے کہ اردو کی یہی ہمہ گیریت اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ بحیثیت زبان یہی 'ہندوستانیت' کی علامت ہے۔

یہاں ایک معنیٰ خیز حقیقت کا ذکر لازم ہے، کہ انحطاطِ سلطنت مغلیہ کے دوران اور اس کے زوال کے بعد بھی دہلی، لکھنؤ، اورنگ آباد، عظیم آباد اور مرشد آباد جیسے تہذیبی مراکز کی معاشرت خالص ہندوستانی تھی، ان کے باشندے اپنی بستیوں کو اردو کی بستیاں کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے، ان کی تہذیب ہندو مسلم آداب کے امتزاج کی رہین منت تھی۔ اُس دور کے امرا و روسا نہ ہندو تھے،

نہ مسلمان تھے، وہ صرف امرا و روسا تھے، ان کی حویلیاں، ان کے دیوان خانے، ان کے معاشرے کا پردہ، ان کا طرز بود و باش، ان کا لباس اور بڑی حد تک آداب خورد و نوش یکساں تھے، وہ سب ایک زبان (اردو) بولتے تھے، اور اس ایک زبان میں شعر کہتے تھے۔ ادبا و قلمکار اسی ایک زبان میں تصنیف و تالیف کرتے تھے، اسی زبان میں اخبار نکالتے تھے، اسی زبان میں پھبتیاں کستے تھے، اسی میں طعن و تشنیع کرتے تھے، اسی میں لطیفے سناتے تھے اور اس میں ہرزہ سرائی کے مرتکب ہوتے تھے، غرض سب کچھ مشترک تھا اور یہ ماحول اعلیٰ طبقے کے علاوہ بڑی حد تک متوسط طبقے تک قائم و دائم تھا، یہ تمام اقدار 'ہندوستانیت' کے جذبے پر مبنی تھیں، یہ مسئلہ مبارکہ کم و بیش آزادیِ وطن کی سوغات کے حصول اور تقسیم وطن کے سانحے تک جاری و ساری رہا، البتہ اس روشن روایت کا ایک نیم روشن پہلو یہ تھا کہ یہ تہذیب (پڑھیے، اردو تہذیب) اور ہندوستانیت کا یہ نادر نمونہ صرف شہروں و قصبات تک محدود تھا۔ اس کی رسائی دیہی علاقوں تک نہ تھی، اور اس کے سبب اردو کی رسائی بھی دیہات تک نہ تھی، غالباً اردو کا سب سے کمزور پہلو یہی ہے، جس طرح ملک کے گوشے گوشے تک اودھی، برج، بھوجپوری، میتھلی اور دیگر علاقائی زبانوں کی پہنچ ہے، وہ اردو کی نہ تھی، نہ آج ہے، غالباً اس کم رسائی کا شاخسانہ ہے کہ اردو کا دامن لوک گیتوں، لوک کہانیوں اور کبیر جیسے شعرا کے کلام سے خالی ہے، کیونکہ اس سمت میں اردو کے علما و دانشوروں نے کوئی سعیِ بامعنی کبھی نہیں کی، شاید اسی لیے اردو سے کہیں کم عمر ہندی زبان نے نہ صرف برج، اودھی اور ہریانوی کو اپنے دامن میں سمیٹا بلکہ ان کے سرمایے کو اپنا سرمایہ قرار دے کر اپنے ادب کو مالا مال کرلیا، شاید یہی وجہ رہی کہ اردو کی آغوش میں نظیر اکبرآبادی کے سوا کوئی بڑا عوامی شاعر نہ پیدا ہوا، نہ پلا بڑھا۔ یہ کمزوری اردو زبان و ادب کی تو ہے ہی، اس تمدن اور ثقافت کی بھی ہے، 'ہندوستانیت' کے نام پر اردو جس کی علمبردار ہے، یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ مگر شاید اب بہت دیر ہوچکی ہے۔ اردو تہذیب خالصتاً شہری تھی، ہے اور شاید یہ خطاب اسے ہمیشہ کے لیے مل چکا ہے، اسے ستم آرائی خیال کیا جائے، مگر سچ یہی ہے کہ آج کے انگریزی گزیدہ اور مغرب زدہ ماحول میں بھی اردو بولنے والوں کو مہذب اور ٹھیٹھ ہندی بولنے والوں کو گنوار سمجھا جاتا ہے۔ مشاعرے آج بھی ایک خاص آداب معاشرت و ایک خاص تہذیب کی علامت ہیں، برقی ذرائع ابلاغ سے پردۂ سیمیں تک اردو کا بول بالا ہے۔ ہندی کے بڑے بڑے ادیب اور اخبار نویس اپنی زبان میں اردو کی (غلط سلط سہی) آمیزش کرکے خود کو اردو تہذیب کا نمائندہ ثابت کرنے کی سعیِ مسلسل کرتے رہتے ہیں، اور سیاست دانوں کے ہاتھ کا تو اردو زبان کھلونا ہے۔ یہ سب کچھ نمائشی اور غیر حقیقی ہی کیوں نہ ہو، مگر کہیں نہ کہیں اردو کے لیے ایک نرم گوشے کا مظہر ہے، خواہ در پردہ ہو، یہ 'اردو کلچر' کی بالادستی کا اعتراف ہے، خاکستر میں بچی ہوئی یہ چنگاریاں ہی ہندوستانیت کی بقا کی بڑی حد تک ضامن ہیں۔

ایک ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اردو کو ایک غیر ہندوستانی نام (اصلاً ترکی الاصل) تفویض کردیا گیا، جو اس کی 'ہندوستانیت' پر انگشت نمائی کرنے کا بہانہ بن گیا اور یاران میکدہ کی اردو دشمنی کا ایک حیلہ ہاتھ لگ گیا۔ یہ اس بحث سے گریز کرتے ہوئے کہ 'ہندوی' اور 'ہندی' کا قضیہ کیا تھا، نیز اس دلکش عوامی زبان کو ایک عسکری خطاب سے کب اور کیوں سرفراز کردیا گیا، یہ عاجز قلم یہ ضرور عرض کرنا چاہتا ہے کہ اردو کے لیے بہترین نام (اگر لفظ 'ہندی' کو ترک کرنا ہی تھا) 'ہندوستانی' تھا۔ کاش یہ ممکن ہوا ہوتا تو آج ہماری 'ہندوستانیت' مزید مالا مال ہوتی، اور اردو دشمنی کا قصہ ہی پاک ہوجاتا۔

تمام تر افتاد زمانہ اور نامساعدت حالات کے باوصف اردو کو آج بھی یہ فخر حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کی واحد ملک گیر زبان یعنی رابطے کی زبان (لنگوا افرانکا) ہے، یہاں انگریزی کا ذکر تو سیاق و سباق سے خارج ہے، قومی زبان ہندی کی رسائی بھی ملک کے تمام گوشوں تک نہیں۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہندوستان کے مغرب اور جنوب میں لوگ اپنی مادری زبان کے علاوہ اردو پڑھنا اور سیکھنا پسند کرتے ہیں، اور یہ تمام ناموافق حالات اور سرکاری و سرمایہ دارانہ سرپرستی کی کمی کے باوجود ہے، کیا یہ بات کم اہم ہے۔ اردو کی بدقسمتی یہ ہے کہ آج ملک میں اس کا اپنا علاقہ کوئی نہیں، اور خوش قسمتی یہ ہے کہ سارا ہندوستان اُس کا ہے، یہی اس کی کمزوری ہے، اور یہی اس کی طاقت۔ اتماماً عرض ہے کہ اردو کی یہی ہمہ گیریت اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ بحیثیت زبان یہی 'ہندوستانیت' کی علامت ہے۔

ہر شر میں خیر کا پہلو مضمر ہوتا ہے۔ یہی معاملہ اردو کے ساتھ بھی ہے، آسمانوں میں اس کی بربادیوں کے چرچے، جس قدر ہوتے ہیں، اسی قدر اس کی نشو و نما ہوتی ہے۔ آج اردو کے اخبارات، برقی ذرائع ابلاغ، غرض تمام وسائل مقبولیت میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے اس کے قارئین و ناظرین (توقع عام کے برعکس) بجائے گھٹنے کے بڑھ رہے ہیں، ہر دن، ہر روز بڑھ رہے ہیں۔ ہندوستان کی حدود کے باہر اب اردو خود کو عالمی زبان ثابت کرنے پر آمادہ ہے، دنیا کا کوئی ایسا گوشہ نہیں، جہاں تک اردو کی رسائی نہ ہو، اور یہ وہ اعزاز و امتیاز ہے جو ہندوستان کی کسی دیگر زبان کو حاصل نہیں— یعنی کہ اردو 'ہندوستانیت' سے ماورا 'عالمگیریت' کی جانب رواں دواں ہے۔ یہ ایک فال نیک ہے، اب اردو کی منزل ہندوستانیت سے کہیں آگے آفاقیت ہے، سردست یہ دیوانے کا خواب سہی، مگر اس کی تعبیر ناممکن نہیں۔

■

Dr Muzaffar Husain Syed (M.H. Syed)29/11,
Sir Syed Road, Darya Ganj, New Delhi - 110002

شائستہ فاخری

اردو شاعری میں جھلکتا ہندوستان

معاشرہ، تہذیب اور ادب کسی بھی ملک کی وہ وراثت ہوتے ہیں، جو وقت کی کیفیت سے بلند ہو کر صدیوں کا سفر طے کرتے ہوئے صدیوں کے سفر کے لیے گام زن رہتے ہیں تہذیب زندگی اور ذہن کا باہمی عمل ہے۔ ہر تہذیب اپنی خود روحیثیت میں منفرد روح کی حامل ہے اور اگر وہ ایک مرتبہ زوال پذیر ہو جائے تو اس میں دوبارہ حرارت پیدا نہیں کی جاسکتی۔ دنیا کی کوئی بھی تہذیب اپنی معنویت کی بنا پر ہی جانی پہچانی جاتی ہے۔ لفظ تہذیب میں اتنی وسعت ہے جتنی زندگی کی معنوی کائنات میں۔ اسے صرف کردار سازی اور قدر شناسی تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستانیت یعنی ہندوستانی تہذیب میں فرد سماجی اور روحانی تربیت کا درس ہے۔ اس میں مذہب کو ضم کر لیا گیا ہے چونکہ تہذیب یافتہ معاشرہ ہی اعلیٰ ادب کی تخلیق کر سکتا ہے۔ اس لیے قدیم ہندوستانی ادب کی جڑیں مذہب کی زمین پر پروان چڑھی ہیں۔

سوال اٹھتا ہے، مذہب یعنی دھرم کیا ہے؟

میمانسک کہتا ہے، جو کرم کے صحیح یا غلط مارگ کو بتائے وہ دھرم ہے۔ ہندوستانی ادب کا مقصد بھی 'موکچھ' یا 'مکتی' ہی تھا۔ مکتی انسان کو صحیح مارگ دکھا کر آواگمن کے چکر سے باہر نکالتی ہے۔ انسان ایک مذہبی مخلوق ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ انسان ایک تہذیبی مخلوق بھی ہے۔ وہ مجموعی طور پر جسمانی خواہشات کے میلے میں زندگی گزارنے کا عادی ہوتا ہے اور انھیں کے مابین ادب کی کونپلیں پھوٹتی اور فروغ پاتی ہیں۔

اگر قدیم ہندوستانی ادب پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو وہ ویدانت سے شروع ہوتا ہے۔ برہمن، آرڑ یک، اپنشد کے دور کو پار کرتا ہوا، پرانوں کے عہد سے نکلتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ ادب سے مذہبیت دور ہونے لگتی ہے اور تخلیقیت حاوی ہونے لگتی ہے۔ یہی وہ کال تھا جب سنسکرت زبان نے وقت کے دامن میں بے شمار قیمتی گوہر ڈالے اور سنسکرت ادب کو ایک کلاسک ادب کا درجہ دلایا، جس نے ہندوستانی تہذیب کو بھی بھرپور متاثر کیا۔

امیر خسرو کی تصانیف میں ہندوستانی تہذیب و فلسفہ، یہاں کا قدرتی اور جغرافیائی حسن، گاؤں دیہات کے مناظر، علاقائی بولی ٹھولی، رسم و رواج کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ اس سے قبل حب الوطنی کا تصور اردو شاعری سے ناپید تھا۔ انسان کی شناخت اس کے قبیلے سے ہوتی تھی۔ پہلی بار امیر خسرو نے ہی ہندوؤں کے عقیدے اور ان کی رسموں کو اپنے انداز میں بیان کیا۔ ہندوستان کی روحانیت کو ہندوی الفاظ کا جامہ پہنا کر قدیم ہندو عقائد و فلسفے کو نئی تازگی دی۔ دوسری طرف ان کی شاعری میں ہندوستانی عوام کی زندگی کی دھڑکن بھی شامل رہی۔ شرنگار اور ویوگ کی یہ چھاپ امیر خسرو کی ہی دین ہے:

چھاپ تلک سب چھینی رے موسے نیناں ملا کے
بات عجب کہہ دینی رے موسے نیناں ملا کے
گوری گوری بیا، ہری ہری چوڑیاں
بیاں پکڑ ہر لینھی رے موسے نیناں ملا کے
خسرو نظام کے بل بل جائے
موہے سہاگن کینھی رے موسے نیناں ملا کے
چھاپ تلک سب چھینی رے موسے نیناں ملا کے
بات عجب کہہ دینی رے موسے نیناں ملا کے

1857 کی جنگِ آزادی ملک کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے، جب سیاسی منظرنامہ بھی بدل رہا تھا اور ادبی رجحان میں بھی تبدیلیاں آرہی تھیں۔ یہ تبدیلیاں وقت کے ساتھ ساتھ رفتار پکڑتی گئیں۔ ہندوستانیت کا یہ آہنگ نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں خوب نمایاں ہے۔ بنجارہ نامہ کے یہ بند دیکھیے، جو ہندوستان کی کسی بھی مقامی تہذیب کا منظر پیش کرتا ہے:

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گوئیں پلّا سر بھارا
کیا گیہوں چاول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں کیا انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

فراق صاحب ہمارے عہد کے ان شاعروں میں ہیں، جنھوں نے بیسویں صدی کی اردو شاعری کو اپنی غزلوں سے مزین کیا۔ آپ کے یہاں بھی ہندوستانیت کا خوب خوب رنگ ملتا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ عمل وقت کی رفتار کے ساتھ شدت اختیار کرتا گیا۔

ادیبوں اور شاعروں نے اسے موضوعِ قلم بنانا شروع کیا۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ عمل شدت اختیار کرتا گیا۔ کہیں نظریہ ملا کہیں فلسفہ، کہیں الفاظ ملے اور کہیں فکر۔ اردو ہی نہیں ہر ہندوستانی زبان میں ہندوستانیت چھانے لگی۔ کہیں علامتی انداز میں قلم اٹھے تو کہیں اپنی بات دوٹوک کہنے کے لیے سیدھے سیدھے ہندوستانی 'بمبوں' کو شاعری میں اتارا گیا۔

اگر آزادی کے بعد کی شاعری کا ہم مطالعہ کریں تو، تاپا مایا، تیاگ ویراگ، بن باس، رام کرشن گوپی، ہولی، پھاگن، لال گلال، چوبارا، پنگھٹ، الاؤ، مرگھٹ، شمشان، چیتر، ساون، جیٹھ، اساڑھ، جیسے خالص ہندوستانی نہ صرف الفاظ بلکہ اس کے پس منظر کو بھی اردو شاعری میں ڈھالا گیا۔ جس کے رنگ مختلف اشعار میں دیکھے جاسکتے ہیں:

امیر خسرو کی تصانیف میں ہندوستانی تہذیب و فلسفہ، یہاں کا قدرتی اور جغرافیائی حسن، گاؤں دیہات کے مناظر، علاقائی بولی ٹھولی، رسم و رواج کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ اس سے قبل حب الوطنی کا تصوراردو شاعری سے ناپید تھا۔ انسان کی شناخت اس کے قبیلے سے ہوتی تھی۔ پہلی بار امیر خسرو نے ہی ہندوؤں کے عقیدے اور ان کی رسموں کو اپنے انداز میں بیان کیا۔ہندوستان کی روحانیت کو ہندوی الفاظ کا جامہ پہنا کر قدیم ہندو عقائد وفلسفے کو نئی تازگی دی۔ دوسری طرف ان کی شاعری میں ہندوستانی عوام کی زندگی کی دھڑکن بھی شامل رہی۔

یوگ ہی سنسار کا شنگار ہے
روپ ہے تالاب کا نیرج کی دین (کرشن موہن)

سادھنا کے روپ میں تھی واسنا
جوگ میں بھی من نہ جوگی بن سکا (کرشن مراری)

ہم جوگ لے کر اور بھی برباد ہوگئے
آتی ہیں اپسرائیں بھی چھونے کو اب بدن (نور بجنوری)

وہ ننھی سی خواہش اب بھی دل کو جلائے رکھتی ہے
جس کے تیاگ کی خاطر میں نے کتنے ہی بن باس لیے
(رفعت سروش)

رگ رگ میں خواہشوں کا دہکتا ہوا الاؤ
آنکھوں میں ایک سونا بدن رات اور میں
(عبدالسلام اطہر)

مڑ کر دیکھا بھیڑ لگی تھی گھاٹ پہ رونے والوں کی
میں تو اپنی چتا جلا کر تنہا رونے نکلا تھا
(اثر فیض آبادی)

ہندوستانی تہذیب میں مہمان نوازی کو خاصی اہمیت دی گئی ہے یہاں تک کہ 'اتتھی دیو وبھو' کہہ کر مہمان کو دیوتا کے مانند بتایا گیا۔ اس خیال کو عنوان چشتی نے کچھ اس ڈھنگ سے اپنے شعر میں پرویا ہے:

عجیب شخص ہے کیا زندگی گذارتا ہے
وہ دشمنوں کی بھی اب آرتی اتارتا ہے

دیوداسی کا تصور خالص ہندوستانی تہذیب کی اپنی دین ہے۔ جس میں کوئی کنیا مندر میں خود کو دیوتا کے آگے سمرپت کردیتی ہے اور پھر زندگی بھر اس کا باہری دنیا سے تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ وہ مندر میں رقص کے ذریعے دیوتاؤں کو خوش کرتی تھی۔ اپنے شروعاتی دور میں دیوداسی معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھی اور پوجی جاتی تھی۔ شاعروں نے دیوداسی کا تصور اپنے کلام میں کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

فراز آج شکستہ پڑا ہوں بت کی طرح
میں دیوتا تھا کبھی ایک دیوداسی کا (احمد فراز)

ناامیدی کے آکاش پہ چمکا ہے آشا کا ستارہ
مندر میں ایک دیوی سج کر آئی ناچ دکھانے (میراجی)

فنا اور بقا کا تصور ہر قوم اور مذہب میں اپنے اپنے طریقے سے رہا ہے۔ ہمیشگی اس ذات کو حاصل ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اور موت اس ذات میں واصل ہوجانے کا نام ہے۔ چنانچہ مر کر فانی انسان کو بقا حاصل ہوجاتی ہے۔ 'موکچھ' اور 'مکتی' کا یہ تصور ہزاروں برس پہلے وید سے شروع ہوا۔ ایک لمبے سفر کے بعد تخلیقی ادب کا آج بھی یہ ایک اہم عنصر ہے۔

ہندوستانیت کی بنیاد میں اتریں تو موکچھ اور مکتی کا یہ فلسفہ آج بھی جاری وساری ہے۔ اردو شاعری میں اس کا خوب رنگ ملتا ہے:

انتر یامی کے درشن کو انتر گیانی جانے
صہبا جی بن باس سے کوئی رام نہیں بن جائے
(صہبا اختر)

چھوڑ کے سنگھرشوں کے جمگھٹ توڑ کے آشا کے رشتے
گوتم بدھ کے سائے میں بیٹھا ہے سنیاس لیے
(رفعت سروش)

میرے ہی ہونٹوں سے لگا ہے نیلے زہر کا پیالا
میں ہی وہ ہوں جس کی چتا سے گھر گھر ہوا اجالا
(منیر نیازی)

اکثر خواہش نے ضد کی ہے تانڈو ناچ رچاؤں میں
اکثر دل یہ کہتا ہے کہ گوتم بدھ بن جاؤں میں
(مختار شمیم)

ہندومت اور بدھ دھرم میں آواگمن کا تصور ایک چکر کے مانند ہے جس میں جسم تو جل کر خاک ہو جاتا ہے مگر روح نیا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ پھر وہی زندگی اور موت، پھر ایک بار جسم خاک ہو گیا، پھر روح کو دنیا میں دوبارہ آنا پڑا۔ یہ ایک تسلسل ہے، جو قائم رہتا ہے، یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کی اہمیت آج بھی کم و بیش اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی قدیم وقت میں رکھتی تھی:

یہ بات طے ہے کہ پت جھڑ میں ہے اجڑنا بھی
کہ ہے زمین سے اپنی انھیں اکھڑنا بھی
(محسن جلگانوی)

(یہاں شاعر نے اپنی بات ہندوستانی 'بمب' کا سہارا لے کر کہی ہے۔)

ہندوستانیت کی بات چلے اور موسموں اور رنگوں کا ذکر نہ آئے یہ کیسے ممکن ہے۔ چیتر، ویشاکھ، جیٹھ، اساڑھ، ساون، بھادو، ماگھ، پھاگن، یعنی سال کے بارہ مہینے اور ہولی کے رنگ دیوالی کے دیے، رام کی لیلا، کرشن کی راس لیلا، کتنے رنگ، کتنے موسم، چند اشعار ان کی نذر:

سکھی ری چیت رت آئی سہائی
اجھوں امید میری بر نہ آئی (محمد افضل)

ساون ایک مہینے قیصر آنسو جیون بھر
ان آنکھوں کے آگے بادل بے اوقات لگے (قیصر الجعفری)

پھر ساون رت کی پون چلی تم یاد آئے
پھر پتوں کی پازیب بجی تم یاد آئے (ناصر کاظمی)

بدلتے موسموں کا زہر پی لوں
میں شنکر بن کے بھی کچھ دن تو جی لوں (مہدی پرتاپ گڑھی)

گلاب، بیلا، مونگرا، یعنی الگ الگ پھول اور ان پھولوں کی الگ خوشبو، رنگ، تاثیر۔ سرحدوں کی کیفیت بھی ٹھیک اسی طرح ہے۔ الگ الگ ملک اور الگ الگ ملکوں کی تہذیب اور ثقافتی رنگ و بو مگر تاثیر ملکوں کی نہیں مٹی کی ہوتی ہے۔ جو اتنی دیرپا اور دائمی رہتی ہے کہ مٹائے نہیں مٹتی، بجھائے نہیں بجھتی۔ قندیل کی طرح روشن رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہزاروں ہزار برس پرانی ہندوستانی مٹی میں جو مذہبیت اور روحانیت کی تاثیر پیدا ہوئی تھی، وہ آج بھی قائم ہے۔ قبا بدل جانے سے جسم نہیں بدلا کرتے۔ بدلتے دور کے ساتھ مٹی نہیں بدلا کرتی۔

ہمارے ملک کے بودھ بھکشو اور جینی سنت کئی سو برس پہلے اپنی ہندوستانی مٹی کی اسی تاثیر کو فروغ دینے

کے لیے دوسرے ملکوں کا دورہ کیا کرتے تھے اور آج بھی ہمارے پڑوسی ملک نیپال، بھوٹان، بنگلا دیش اور سری لنکا میں ہندوستانی تہذیب اور اس کی تاثیر نمایاں شکل میں دیکھی جا سکتی ہے۔ پاکستان ہمارے ملک کی مٹی کا ایک ٹکڑا ہے، جو الگ ہوتے ہوئے بھی یہاں کی مٹی کی تاثیر پوری طرح خود میں ضم کیے ہے۔ ہاں افغانستان ایسا ہوتے ہوئے بھی ہم سے اسی طرح جدا ہے جیسے جسم کا کوئی حصہ نکال کر کسی ضرورت مند انسان کے جسم کا حصہ بنا دیا جائے۔ وہ خاص حصہ اپنا ہوتے ہوئے بھی اپنا نہیں رہ جاتا۔ افغانستان کی مٹی کی تاثیر ہندوستانی مٹی کی تاثیر سے جدا ہو گئی۔ وجہ وہاں کا جغرافیہ اور تیزی سے پروان چڑھ رہی وہاں کی نئی تہذیب ہے۔

اب سوال اٹھتا ہے کہ مٹی کی تاثیر سے کیا مراد ہے؟ مٹی کی تاثیر کے لیے کوئی ایک یا دو عناصر کام نہیں کرتے بلکہ مجموعی شکل میں ایک تصویر ابھرتی ہے اور وہ تصویر اس ملک کی اپنی ذاتی دھروہر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر پنگھٹ اور چوبارے کا تصور خالص اپنا ہے۔ گھاس پر شیر خوار بچے کو لٹا کر پتھر کوٹتی مزدورنی اپنے ملک میں دیکھی جا سکتی ہے۔ دور دور تک پھیلے ریگستان میں لال ہرے، نیلے پیلے، چیختے رنگوں میں گول گھاگھرے پہنے ننگے پاؤں چاندی کی موٹی موٹی سیکڑ ڈالے سر پر سامانوں کا بوجھا اٹھائے چہرے پر لمبا گھونگھٹ ڈال کر چلتی پھرتی عورتوں کا تصور ہمارا ہے۔ اپنی ہندوستانیت کا حصہ ہے۔ ساون کے جھولے جھولتی لڑکیاں اور لہلہاتی فصلوں کو کاٹتے ہوئے مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کرتی ہوئی خوشیوں اور امنگوں سے بھرپور لوک گیت گاتی ہوئی عورتیں ہمارے ملک کی ہی پہچان ہیں۔ ہر دو فرلانگ پر بولی ٹھولی اور لہجہ بدلنے کا ہنر ہماری مٹی کی تاثیر کو آتا ہے۔ قدیم وقت سے آج تک ہمارے ملک کی مٹی جاڑا گرمی برسات تین موسموں سے ہمیں سیراب کرتی رہتی ہے۔...یہی ہوتی ہے ہندوستانیت اور یہی ہے ہمارے ہندوستان کی مٹی کی تاثیر جو صدیوں کا سفر طے کر کے یہاں تک آئی اور اسی رنگ و بو اور تاثیر کے ساتھ صدیوں کا سفر طے کرتی ہوئی پوری دنیا میں اپنی ایک الگ پہچان بنائے ہوئے ہے۔ سچ مچ 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'۔ اب ہم چند اشعار کے ذریعے اپنی بات کو واضح کرنا چاہیں گے۔ ناصر شہزاد کے ایک شعر میں گوپیاں گوکل اور بنسی کی تلمیحات یکجا ہیں:

گوپیاں ہی کسی گوکل میں نہیں
بنسیوں سے یہ ندا آئی ہے

سر پر گاگر، ناک میں نتھ، پاؤں میں جھانجھر کہاں
ڈھونڈتے ہو شہر میں تم گاؤں کا منظر کہاں
(ساحر ہوشیارپوری)

جل دائے چاند نکل آ بھی کہ اس نے اب کے
چاندنی رات میں پنگھٹ پہ بلایا ہے مجھے
(باقر نقوی)

جب بیٹیاں رخصت ہوتی ہیں تو گھر چوبارے کیسے سونے پڑ جاتے ہیں اس کا منظر جاوید اختر صاحب نے کچھ یوں کھینچا ہے:

سونے سونے گھروں میں باس بسی ہے پھولوں کی
آنکھوں دیکھا حال سنا کر روتے ہیں چوبارے بھی

رفعت سروش کے اس شعر میں ہندوستانیت کا رنگ بھرپور طریقے سے ابھرا ہے:

کچی گاگر پھوٹ نہ جائے نازک شیشہ ٹوٹ نہ جائے
جیون کی پگ ڈنڈی پر چلتا ہوں احساس لیے

اپنا ہندوستان پوری دنیا میں واحد ملک ہے جہاں مٹی کو ماں کا درجہ دے کر اسے بھارت ماتا کہا جاتا ہے۔ ماں کے پاکیزہ تصور سے ملک کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے جمیل مظہری صاحب نے یوں کہا ہے:

او ماتا او بھارت ماتا تجھ پہ خدا کی رحمت ماتا
سندر تو ہریالی تو ہے دھانی آنچلی والی تو ہے
پھول کھلائیں تیری ہوائیں ہن برسائیں تیری گھٹائیں
شہد کی نہریں دودھ کی دھاریں گودی میں جنت کی بہاریں
جگ دیتا ہے تجھ کو دعائیں ہم تیرا گن کس طرح نہ گائیں

■

Dr. Shaesta Fakhri, C-9 Radio Colony
Auckland Road, Allahabad - 211001 (UP)

شاداب عالم

اردو کی شعری روایات اور ہندوستانی عناصر

اردو شعری روایت کی عظیم الشان تخلیقی کائنات میں ہندوستانی فکر وفلسفے کی روح کس طرح عکس ریز ہوتی رہی ہے اور ہندوستانیت کی صورت گری اس میں کس انداز سے ہوئی ہے، اسے ٹھیک طرح سمجھنے کے لیے ہمیں کئی صدیوں پر محیط سرمایۂ شعر وسخن کو الٹ پلٹ کر دیکھنا ہوگا، کسی مختصر مضمون میں اس کے لیے گنجائش نہیں، تاہم اتنی بات تو ماضی بعید کی تاریخ کی ورق گردانی کیے بغیر بھی پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اردو یا ہندوی شاعری کا تمام تر سرمایہ جو دکن اور شمالی ہند میں گزشتہ سات آٹھ صدیوں میں سامنے آیا، تقریباً تمام اصناف میں اس کی پہچان اہم ترین نقطۂ حوالہ اس میں جاری و ساری ہندوستانی روح اور ہندوستانی فکر رہی ہے۔ اگرچہ عرب وعجم کے دیگر اثرات عربی وعجمی سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اردو شاعری نے جب اپنی زبان کھولی، اور موزوں کلام، جذبات کی ترجمانی کے لیے الفاظ کا جامہ پہن کر سامنے آیا تو آنکھیں کھولتے ہی اسے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں بات کہنے کے مختلف طریقے نظر آئے اور وہ ہندوستانی معاشرہ دکھائی دیا جس میں کئی رنگوں کی آمیزش تھی۔ اس نے اپنا لباس یہاں کی وضع پر قطع کیا۔ شاعری کے پیکر کی اس طرح تزئین کی کہ اس میں 'جلوہ صد رنگ' نظر آئے چنانچہ دور تشکیل میں اردو شاعری کی اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی جو کئی حیثیتوں سے غیر ملکی تھیں سماج اور ہندوستانی معاشرے کی عکاس بن گئیں۔ ادبی بنیاد پر ہر صنف نے اپنے کو ہندوستان کی مختلف زمانوں کی اصل روح سے ہم آہنگ کیا اور ہندوستانی شادی بیاہ کے رسوم، ہندوستانی نظریات وعقائد کو اپنے سانچے میں ڈھالا اور خود ان کے سانچے میں ڈھل گئی۔

اردو کی شعری کائنات اپنے ارتقائی سفر کے کسی بھی دور میں ہندوستانی فکر اور تہذیبی زندگی کی نقش گری اور مصوری کے فرض سے غافل نہیں رہی ہے۔ اس کا اندازہ اردو کی داستانوں، قصے کہانیوں کے علاوہ بیانیہ شعری اصناف قصائد ومراثی وغیرہ سے کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس مضمون میں ان شعرا پر بطور خاص نظر مرکوز رکھی گئی ہے جن کے یہاں ہندوستانیت کا غلبہ رہا ہے۔

نظیر اکبرآبادی ہندوستان کی ادبی تاریخ کے واحد عوامی شاعر ہیں جنھوں نے دور حاضر کی عوامی شاعری کے لیے راہیں اور سمتیں متعین کیں اور جنھوں نے اٹھارہویں صدی میں مشترکہ کلچر، قومی یکجہتی کے تصورات کو اپنی شاعری میں جگہ دی جو تقریباً ہزار ہا سال کی تاریخی وراثت پر محیط ہے:

دنیا میں بادشاہ ہے سو وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

نظیر نے ہندوستان کی عوامی زندگی کے تقریباً ہر گوشے کو اپنے یہاں جگہ دی ہے۔ خصوصاً فرقہ وارانہ یکجہتی ان کا موضوع ہے ان کے یہاں دیوالی، راکھی، رسم کتھا، کنھیا جی کا جنم نظم کے سانچے میں ملتا ہے:

ہو تم میں بھی اور ہم میں بھی ہولی کی ہے جو کچھ
سن کر یہ نظیر اس نے ہنس کر یہ کہا سچ ہے
ہولی میں یہی دھومیں لگتی ہیں بہت بھلیاں

نظیر نے اپنی شاعری میں ہندو مسلم جذبات کا ایسا نازک توازن قائم رکھا ہے جس پر مذہبی تفریق کا بڑے سے بڑا حامی اور بڑے سے بڑا متعصب بھی اعتراض نہیں کرسکتا:

جھگڑا نہ کرے ملت و مذہب کا کوئی یاں
جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آں
زنار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآں
عاشق تو قلندر ہے نہ ہندو نہ مسلماں
کافر نہ کوئی صاحب اسلام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

اردو شاعری نے مشترکہ تہذیب کی وارث کی حیثیت سے اتفاق، اتحاد اور ریگانگت کی قندیلیں روشن کیں اور قومی یکجہتی کی تشکیل وتعمیر میں موثر کردار ادا کیا۔ پہلی جنگ آزادی (1857) کے بعد تاریخی صداقت بن کر ابھرنے لگی لیکن اس سے بھی بڑا کارنامہ اردو کے ہاتھ انجام پایا اور وہ یہ کہ اردو شاعری نے اس دور کشاکش میں قومیت، وطنیت اور حب الوطنی کے شعور کو پروان چڑایا جس کی نظیر ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ادب میں مشکل سے ہی مل سکے گی۔

1869 سے حالی اور آزاد کے مجتہدانہ اور انقلابی

اردو شاعری نے جب اپنی زبان کھولی، اور موزوں کلام، جذبات کی ترجمانی کے لیے الفاظ کا جامہ پہن کر سامنے آیا تو آنکھیں کھولتے ہی اسے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں بات کہنے کے مختلف طریقے نظر آئے اور وہ ہندوستانی معاشرہ دکھائی دیا جس میں کئی رنگوں کی آمیزش تھی۔ اس نے اپنا لباس یہاں کی وضع پر قطع کیا۔ شاعری کے پیکر کی اس طرح تزئین کی کہ اس میں 'جلوہ صد رنگ' نظر آئے چنانچہ دور تشکیل میں اردو شاعری کی اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی جو کئی حیثیتوں سے غیرملکی تھیں سماج اور ہندوستانی معاشرے کی عکاس بن گئیں۔ ادبی بنیاد پر ہرصنف نے اپنے کو ہندوستان کی مختلف زبانوں کی اصل روح سے ہم آہنگ کیا اور ہندوستانی شادی بیاہ کے رسوم، ہندوستانی نظریات و عقائد کو اپنے سانچے میں ڈھالا اور خود ان کے سانچے میں ڈھل گئی۔

اقدام نے وضاحت کے ساتھ براہِ راست بات کہنے کا ڈھنگ سکھا دیا تھا کیونکہ وہ فکری سرمایہ جو غزلوں میں علامتوں کے ذریعے پیش ہورہا تھا۔ اب سارا فکری سرمایہ نظموں کی طرف منتقل ہوگیا تھا لیکن تاریخی تسلسل بہرحال منقطع نہیں ہوا اور غزل میں بھی ظاہر ہوتا رہا۔

حالی کی اہم ترین مثنوی 'حب وطن' جس میں وطنیت کے جدید شعور اور ہندوستانیوں کو ایک متحدہ قوم ہونے کا احساس دلایا گیا اور واضح الفاظ میں قومی یکجہتی کا سنگ بنیاد نظر آتا ہے:

اے وطن اے مرے بہشت بریں
کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
کیا زمانے کو تو عزیز نہیں
اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں
جن و انسان کی حیات ہے تو
مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو
تیری اک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

اس وطنیت اور حب الوطنی کے شعور کے لیے قومی یکجہتی ناگزیر ہے۔ اس یکجہتی کو حالی مضبوط دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کا تصور ہمہ گیر بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو
بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو
سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

''اردو میں حالی نے پہلی بار 'لفظ قوم' کو اہل ملک کے معنی میں استعمال کر کے ہندوستانی قوم کا تصور پیش کیا۔''

اقبال کے مجموعی تخلیقی کارناموں کے بجائے محض ان کی حب الوطنی اور ہندوستانی فکر و فلسفے، قدیم مذہبی و روحانی میراث و روایات سے باخبر اور تہذیبی و تمدنی دریاؤں میں شناوری کا ذکر مقصود ہو تو یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اردو کی پوری شعری روایت میں ان سے قبل ان کا کوئی حریف دریافت کرپانا تقریباً ناممکن ہے۔

اقبال نے مختلف انداز میں ہندوستانیت کو اپنے کلام میں جگہ دی اور 'ترانہ ہندی' لکھ کر تو انھوں نے اپنی حب الوطنی کو معراج پر پہنچا دیا۔ آج بھی تقریباً سو سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد اقبال کا پیش کیا ہوا نظریہ اور قومی یکجہتی کا تصور اسی طرح روشن اور تابناک ہے اور شاید ماہ وسال کی ہزار ہا گردشیں بھی اس تصور کی عظمت کو کم نہیں کرسکتیں۔ یہ تاریخ کا المیہ ہے کہ ہندوستان کا قومی گیت 'ترانہ ہندی' نہیں ہے جب کہ ہندوستان میں اقبال کو سارا ملک ان کے 'ترانۂ ہندی' کی وجہ سے اور اس کی دھن کی وجہ سے جانتا ہے۔ جو لوگ اقبال کا نام نہیں جانتے وہ بھی ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' قومی گیت کی حیثیت سے جانتے ہیں:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا

'ہندوستانی بچوں کا قومی گیت' اقبال کے قومی تصورات کو مخصوص طریقے سے پیش کرتا ہے۔ اس مختصری نظم میں اقبال ہندوستان کے پورے تاریخی شعور کو سمیٹ کر پیش کرتے ہیں:

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

اقبال کے 'نیا شوالہ' میں ہندوستانیت کا شعور روحانی بھی ہے اور تہذیبی بھی وہ نہ کھویا جاسکتا ہے اور نہ ہی حاصل کیا جاسکتا ہے:

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اقبال اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان جو رشتۂ وحدت ہے اس کی بنیاد ہندوستانی تہذیب ہے۔ شاید یہی وجہ رہی ہوگی کہ انھوں نے 'رام' پر بڑی خوبصورت نظم لکھی اور 'رام' کو صرف ہندوستان کے تناظر میں نہیں بلکہ عالمی تناظر میں دیکھا ہے اور ان کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے انھیں انسانیت، صداقت اور شجاعت میں بے نظیر بھی بتایا:

'رام'

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند
یہ ہندیوں کے فکرِ فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بامِ ہند
اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نامِ ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تراز سحر ہے زمانے میں شامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوشِ محبت میں فرد تھا

سرور جہان آبادی کی شاعری اردو ادب میں یقیناً اہمیت رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں وطنی شعور اور قومی یکجہتی کے تصورات کو مضبوط بنانے میں بھی اس دور میں اقبال کے علاوہ کوئی بھی سرور کا مدمقابل نظر نہیں آتا۔ انھوں نے شاعری کی وہ شاہراہ تعمیر کی جو چکبست، جوش اور بعد کے تمام شعرا کے لیے نشانِ راہ بن گئی۔ حب الوطنی سرور کی نظموں کا اہم موضوع ہے۔ فراق نے اسی لیے سرور کو اردو

اردو میں رامائن

کا سب سے بڑا قومی شاعر قرار دیا۔ 'مادرِ ہند' میں سرور وطن کو ہندوستان کے قدیم تصور کے مطابق لکشمی، سرسوتی اور درگا کہہ کر یاد کرتے ہیں:

لکشمی تو ہے زمانے میں اجالا ہے ترا
ہر کنول کا پھول پانی میں شوالہ ہے ترا
سرسوتی کا روپ ہے درگا کا ہے اوتار تو
نطق و دانش کی ہے دیوی مادرِ غمخوار تو

سرور کی حب الوطنی مذہبی امتیازات کو مٹا کر پورے ہندوستان کو دیکھتی ہے لیکن ہندوستانی تہذیب کے خد و خال کا شعور واحساس رکھنے کی بنا پر سرور ہر مذہب کو اس کی جگہ پر رکھتے ہیں:

'عروس حب وطن' میں کہتے ہیں:

حوروں پہ میں مروں تو جہنم نصیب ہو
کافر ہوں میں جو مجھ کو بتوں کی ہو آرزو
ناقوس اور اذاں میں نہیں قید کفر و دیں
ان کے لیے کہ جن کا پرستش کدہ ہے تو
گنگا نہائے شیخ اگر تیرا اذن ہو
تیرا اشارہ ہو تو برہمن کرے وضو

فراق کی نظمیں، غزلیں اور رباعیاں ہندوستانی کلچر کی قدیم روح کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری کی لفظیات اور فضا میں ہندی اور سنسکرت شاعری کے حوالے سے ہندوستانی تہذیب کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ الفاظ کے استعمال سے ہندوستانیت یا ہندو دیومالا کا تاثر قائم کرنے کا عمل متعدد قدیم شعرا کی غزلوں میں بھی ملتا ہے مگر اس سلسلے میں فراق کا امتیاز ہے کہ وہ محض لفظ یا اس کے مشتقات تک ہی خود کو محدود نہیں رکھتے ہیں بلکہ وہ کبھی کبھی ایسے حسی پیکر تراشتے ہیں جن کے ایک حصے سے اسلامی روایت کا پس منظر ابھرتا ہے تو دوسرے حصے سے ہندو دیومالا کا:

سکوت توڑ کہ قُم کی صدا ہے تیری صدا
نظر اٹھا کہ ان آنکھوں کا رس ہے سنجیون

اردو کے فنکاروں نے ہندوستانی صنمیات اور دیومالا کی طرف اشارے کیے ہیں کیونکہ یہ ان کے اجتماعی لاشعور میں سرایت کر گئے تھے۔ فراق کہتے ہیں:

شیو کا وِش پان تو سنا ہوگا
میں بھی اے یار پی گیا آنسو
ہر لیا ہے کسی نے سیتا کو
زندگی ہے کہ رام کا بن باس
رشک دل کیکئی کا فتنہ ہے بدن
سیتا کے برہ کا کوئی شعلہ ہے بدن
رادھا کی نگاہ کا چھلاوا ہے کوئی
یا کرشن کی بانسری کا لہرا ہے بدن

فراق ادب کی آفاقیت اور بین الاقوامیت کے قائل تھے۔ وہ جس قومی مزاج کی بات کرتے تھے وہ کچھ اس طرح کا تھا۔ وہ کہتے ہیں:

''ہندو زندگی جذباتی رشتوں (Assocation) سے مالامال ہے ان Associations کو اپنا لینے سے مسلمان بہتر بن جائے گا گھٹیا مسلمان نہیں بنے گا۔ یا اسلام کے جذباتی رشتوں کو اپنا کر ہندو بہتر ہندو بنے گا۔ گھٹیا ہندو نہیں بنے گا۔''

''ہندو زندگی جذباتی رشتوں (Assocation) سے مالامال ہے ان Associations کو اپنا لینے سے مسلمان بہتر بن جائے گا گھٹیا مسلمان نہیں بنے گا۔ یا اسلام کے جذباتی رشتوں کو اپنا کر ہندو بہتر ہندو بنے گا۔ گھٹیا ہندو نہیں بنے گا۔''

فراق کے یہاں روایت سے جو رابطہ ملتا ہے وہ احترام کا رابطہ ہے انھوں نے اسلامی کلچر کے عناصر کے ساتھ ہندوستانی یا مقامی سیاق وسباق کو ابھارا یا نمایاں کیا ہے۔ فراق جس قومی مزاج کا ذکر کرتے تھے اس کے نہ بن پانے سے ہمیں کیا کیا نقصانات ہوئے ہیں۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ بلاشبہ سیاست اور معاشرت جن تفرقوں کو بڑھاتی ہے۔ مذہب، اخلاق اور وحانیت انھیں کم کرتے ہیں اور سیاست میں بھی جب مقاصد کا اتحاد ایک ہی ڈگر پر چلنے پر مجبور کرتا ہے تو دوریاں اور فاصلے کم ہوتے نظر آتے ہیں جیسا کہ جنگ آزادی کے ضمن میں حب وطن اور قوم پرستی کے گہرے ادراک سے وحدت کا تصور پیدا ہوا۔ سیاست تو ثقافت میں آئی درار سے فائدہ اٹھانے والی قوت ہے۔ پریم چند نے ترقی پسند تحریک کے پہلے اجتماع کی صدارت کرتے ہوئے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ ''ادب سیاست کے آگے چلنے والی مشعل ہے کیونکہ ادب کا تعلق ثقافت سے ہے۔''

اردو شاعری کو ہندوستان کے مختلف مذہبی مکتبہ ہائے فکر کے افراد نے اپنی کاوشوں کا میدان بنایا۔ 'رامائن' بھی لکھی گئی اور 'مد و جزرِ اسلام' بھی۔ لیکن ان مذہبی نظموں کا ایک شعر بھی بطور مثال نہیں پیش کیا جاسکتا جس پر مذہبی منافرت یا تفریق پسندی کا لیبل لگایا جاسکے۔ اردو شعرا نے اپنی روایات کو برقرار رکھا بلکہ وطنی شعور کے پھول کھلائے اتفاق اور یکجہتی کی خوشبو نے ملکی فضا کو معطر کیا ملک میں ان عناصر کی حمایت بھی کی اور رہنمائی بھی کی جو متحدہ قومیت اور مشترکہ کلچر کے علمبردار تھے:

سرزمین ہند پر اقوامِ عالم کے فراق
قافلے بستے گئے ہندوستاں بنتا گیا

■

Dr. Shadab Alam, 128, Kaveri Hostel, JNU, New Delhi - 110067

راشد انور راشد

اردو غزل اور ہندوستانی تہذیب

تہذیب کی تشکیل اور ارتقا کا معاملہ اتنا آسان نہیں جتنا بظاہر دکھائی دیتا ہے۔ ایک مخصوص مزاج صدیوں کا سفر طے کر کے مخصوص ذہن میں تبدیل ہوتا ہے اور ایک مخصوص ذہن صدیوں کا سفر طے کر کے تہذیبی نشو ونما کے امکانات کو نمایاں کرتا ہے۔ ہندوستانی مزاج کو موضوع گفتگو بنایا جائے تو ہمیں قدیم، عہد وسطیٰ اور جدید عہد کی ہندوستانی تاریخ کو پیش نگاہ رکھنا ہوگا جس چیز کو ہم ہندوستانیت سے تعبیر کریں گے اس کی تعمیر و تشکیل میں مختلف عناصر کارفرما ہوں گے۔ ہندوستانی تہذیب کی تشکیل میں جتنا حصہ ویدی تہذیب، بودھی تہذیب، پورانک تہذیب، شومت اور وشنومت کا ہے، اس سے کم حصہ اسلامی تہذیب کا نہیں ہے۔ وہ اسلامی تہذیب جو عرب اور ایران کی مشترکہ تہذیب کے ساتھ مسلم حکمرانوں کے ساتھ ہندوستان میں وارد ہوئی۔ وہ ہندوستان کی پیش رو تہذیب کے ساتھ مل کر مشترک ہندوستانی تہذیب میں تبدیل ہوتی ہے اور تصوف کے ساتھ بھگتی تحریک کا ملا جلا روپ مشترک ہندوستانی تہذیب کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ پہلے مزاج کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس میں ذہنی تصورات کی خاص اہمیت ہوتی ہے اور یہی تصورات فرد کے خیال کو متاثر کرتے ہیں۔ ساتھ ہی اس کے افعال کے بھی محرک بنتے ہیں۔ اس کے بعد مزاج عامہ کی تشکیلی منزل آتی ہے جس کی بنا پر فرد کا انفرادی احساس، افراد کے مجموعی محسوسات میں تبدیل ہو جاتا ہے اور یہیں سے اخذ و استفادے کا سلسلہ پروان چڑھنے لگتا ہے۔ آگے چل کر بعض دوسری چیزیں بھی مجموعی محسوسات میں شامل ہوتی چلی جاتی ہیں اور صدیوں کا سفر طے کرنے کے بعد مشترک ذہن اور مزاج کی تشکیل ہو پاتی ہے۔ ہندوستانیت کی تعمیر و تشکیل میں یہی تصور کارفرما رہا ہے۔ مخصوص ماحول نے ہمیشہ ہی ایک خاص نوع کی ذہنی فضا تشکیل دی ہے۔ یہاں کے لوگوں نے ابتدا سے ہی حیات و کائنات کے بنیادی مسائل پر غور و فکر کرنے کی گنجائش نکالی اور کثرت میں وحدت کے تصور کو فروغ دیا۔ اتحاد پسندی اور رواداری شروع سے ہی ہندوستانی مزاج کا حصہ رہی ہے۔ ہندوستانی مزاج، فکر اور تہذیب کے بنیادی پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے سید عابد حسین نے لکھا ہے:

''ہندوستانی فکر میں فلسفیانہ غور و فکر اور مذہبی مراقبہ دونوں کی شان پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں مذہب اور فلسفہ ابتدا سے زندگی کا رمز بن گیا۔ اپنی دوسری خصوصیت کی بدولت ہندوستانی ذہن ہمیشہ کائنات کی تعبیر میں اور نظام فکر کی تعمیر میں متعدد اور مختلف مظاہر کو ایک کلیے کے تحت میں لا کر ان میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔''

کثرت میں وحدت کا یہی تصور ابتدا سے ہی ہندوستانی تہذیب، فلسفہ، ادب اور فنونِ لطیفہ میں لازم و ملزوم کی حیثیت سے شامل رہا۔ اسی بنا پر ہندوستانی تہذیب کی انفرادیت بھی قائم ہوتی ہے۔ مختلف تہذیبوں کے اثرات کو اپنے اندر شامل کرنے کی خوبی شروع سے ہی ہندوستانی مزاج میں شامل رہی ہے۔ مختلف وقتوں میں مختلف قوموں نے اس ملک کو اپنا مسکن بنایا اور ان کے مشترکہ اختلاط سے رفتہ رفتہ ہندوستانی ذہن و تہذیب کی ایک صورت مستحکم ہوتی چلی گئی۔ ہندوستانی مزاج اور اس ذہن کی بنیاد میں اگر رواداری، ذہنی ہم آہنگی، مصالحت، مفاہمت اور محبت موجود ہے تو یہ چیزیں صدیوں کے ذہنی سفر کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اس وسیع و عریض ملک میں صدیوں سے مختلف قومیں آباد ہیں۔ ان کے رہن سہن، طور طریقے اور عادت و اطوار میں حیرت انگیز تضاد ہے۔ اس کے باوجود لوگوں میں آپسی اتحاد موجود ہے۔ اخذ و استفادے کا رجحان ہندوستانی مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے جس کی بنا پر ایک دوسرے سے پوری طرح مختلف ہوتے ہوئے بھی ہندوستانیوں نے ہر عہد میں مفاہمت اور مصالحت کی راہ تلاش کر لی ہے اور یہ بنیادی خوبی ہندوستانی مزاج کی بوقلمونیوں کو مزید نمایاں کرتی ہے۔ درمیانی راہ تلاش کرنا یا کسی بھی چیز میں برائی کا پہلو تلاش کرنے کے بجائے اس کے مثبت یا بدلے ہوئے تصور کو اہمیت دینا ہندوستانی مزاج اور ذہن کی بنیادی خوبیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ جنس کی مثال سامنے کی ہے۔ جنس کے حوالے سے عام طور پر شہوانیت اور ہوس کے جذبات ابھرتے ہیں، لیکن ہندوستانی ذہن اور مزاج نے اس میں بھی طہارت اور تقدس کے رشتے قائم کر لیے ہیں۔ گوپی چند نارنگ ہندوستانی ذہن کی اس خاصیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ہندوستانی مزاج سخت گیر نہیں۔ وہ کسی ایسی چیز کی جو اس کے قریب مستحسن اور مناسب نہ ہو، شدت سے مذمت یا مخالفت نہیں کرتا بلکہ اس کے برے اثرات سے بچنے کے لیے دوسرے پہلو نکال لیتا ہے۔ چنانچہ لذت پرستی کا سدِّ باب کرنے کے لیے جنس کی طرح طرح سے تطہیر و تقدیس کر دی گئی۔ ہندوستان میں جنسی اتصال کا

اس وسیع و عریض ملک میں صدیوں سے مختلف قومیں آباد ہیں۔ ان کے رہن سہن، طور طریقے اور عادت و اطوار میں حیرت انگیز تضاد ہے۔ اس کے باوجود لوگو ںمیں آپسی اتحاد موجود ہے۔ اخذ و استفادے کا رجحان ہندوستانی مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے جس کی بنا پر ایک دوسرے سے پوری طرح مختلف ہوتے ہوئے بھی ہندوستانیوں نے ہر عہد میں مفاہمت اور مصالحت کی راہ تلاش کرلی ہے اور یہ بنیادی خوبی ہندوستانی مزاج کی بوقلمونیوں کو مزید نمایاں کرتی ہے۔ درمیانی راہ تلاش کرنا یا کسی بھی چیز میں برائی کا پہلو تلاش کرنے کے بجائے اس کے مثبت یا بدلے ہوئے تصور کو اہمیت دینا ہندوستانی مزاج اور ذہن کی بنیادی خوبیوں کو ظاہر کرتا ہے۔

تصور ہوس پرستی اور عریانی کا نہیں بلکہ تقدیس اور طہارت کا ہے۔ قوت تولید کی پرستش یہاں دراوڑیوں کے زمانے سے شوشکتی کی عقیدت کی شکل میں پائی جاتی ہے جس کا آریائی روپ بعد کو رادھا کرشن یا کرشن اور گوپیوں کی راس لیلا کے حد درجہ عشق انگیز رومانی تصورات میں ظاہر ہوا۔ جنس کی تطہیر کے اس رجحان کی سب سے زیادہ کارفرمائی مذہب کے بعد موسیقی، رقص، مصوری، سنگ تراشی، نیم سنسکرت کاویہ یا بعد کی بھاشاؤں کے شعر و ادب میں ملتی ہے۔''

جنسی طہارت کے اس تصور نے آگے چل کر شعر و ادب میں اپنے اثرات مرتب کیے۔ یہاں تک کہ اردو غزل جو فارسی غزل سے براہِ راست متاثر تھی۔ رفتہ رفتہ ہندوستانی ذہن و مزاج کے سانچے میں ڈھلتی چلی گئی اور غزل میں جنسی تصورات کو بھی پیش کیا گیا تو اس میں ایک خاص نوع کی شگفتگی اور پاکیزگی کو خاص اہمیت دی گئی۔ یہ سب کچھ اتفاقی طور پر نہیں ہوا تھا۔ جس ماحول میں اردو غزل نے آنکھیں کھولیں وہ زمانہ ایک مشترکہ تہذیب کے فروغ کا زمانہ تھا، لہٰذا یہ کیسے ممکن تھا کہ اردو غزل، ہندوستانی تہذیب کے ان اثرات سے محفوظ رہ پاتی۔ ابتدائی عہد میں اردو غزل نے فارسی غزل کی پیروی ضرور کی، لیکن جلد ہی ہندوستانی مزاج اردو غزلوں میں اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگا۔ غزل میں چونکہ عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، لہٰذا اس عشق کی نوعیت سے جب تک ہم اچھی طرح واقف نہیں ہوں گے، غزل کے فن کو سمجھنے میں ہمیں دشواری پیش آئے گی۔ اسلامی تصوف میں تصورِ عشق کی شمولیت اتنی آسان نہ تھی، لیکن صوفیائے کرام نے مذہبی اور اخلاقی بندشوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور رفتہ رفتہ ایسی گنجائش نکال پانے میں کامیاب ہوگئے جو ہندوستانی تہذیب کے مزاج میں شروع سے ہی شامل تھی۔ تصوف اور بھگتی تحریک کے زیر اثر عشق سے متعلق جذبات اور کیفیات نے جب عوامی سطح پر قبولیت کی سند حاصل کرلی تو شاعری میں معاملاتِ عشق کے بیان کا مرحلہ خود بخود آسان ہوتا چلا گیا۔ کلاسیکی اردو غزلوں میں تصوف اور بھگتی تحریک کے اثرات نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ولی، درد، سراج، سودا، میر، قائم، یقین، غالب اور دوسرے شعرا کے غزلیہ اشعار میں ہندوستانی فکر اور مزاج کی نشاندہی آسانی کے ساتھ کی جاسکتی ہے:

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسنِ بے حجاب اس کا
بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا (ولی)

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پاسکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے (درد)

سب جگت ڈھونڈھ پھرا پیو کو نہ پایا ہرگز
دل کے گوشے میں مکاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا (سراج)

اس قدر سادہ و پرکار کہیں دیکھا ہے
بے نمود اتنا نمودار کہیں دیکھا ہے (سودا)

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس کا ہی ذرہ ظہور تھا (میر)

جلوہ کس جا پہ نہیں اس بتِ ہرجائی کا
یہ پریشاں نظری جرم ہے بینائی کا (قائم)

کس قدر بوقلموں جلوہ ہے محبوب اپنا
کوئی بھی اس کی تجلی نہیں تکرار کے ساتھ (ناسخ)

مخلوق ہوں یا خالقِ مخلوق نما ہوں
معلوم نہیں مجھ کو کہ میں کون ہوں کیا ہوں (مصحفی)

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں مجھ کو
کوئی آئینہ خانہ، کارخانہ ہے خدائی کا (آتش)

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں (غالب)

سب اس میں محو اور وہ سب سے علاحدہ
آئینے میں ہے آب نہ آئینہ آب میں (شیفتہ)

شعلہ ہے وہی، شمع وہی، ماہ وہی ہے
خورشید وہی، نورِ سحرگاہ وہی ہے (ظفر)

ان اشعار میں ہندوستانی تہذیب کے رموز پوشیدہ ہیں، کیونکہ یہ اشعار محض اسلامی تصوف کے ہی ترجمان نہیں بلکہ ان میں ہندوستان کی قدیم تہذیبوں کے اثرات بھی شامل ہیں۔ غزل کا شاعر اپنے اجتماعی حافظے کا استعمال کرتے ہوئے تحت الشعور کی باریکیوں اور نیرنگیوں کو اشعار میں نمایاں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کلاسیکی غزل کے جن شعرا کے نمائندہ اشعار زیر بحث آئے، ان میں اجتماعی حافظے اور تحت الشعور کی باریکیوں اور نیرنگیوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ اسلامی تصوف کے ساتھ بھگتی تحریک کے ملے جلے اثرات کے سبب اردو غزل کے شاعروں کو ایک مختلف فضا میسر آئی۔ انھوں نے ہندوستانی فکر اور فلسفے کے بنیادی عناصر کو اپنے اجتماعی حافظے کے ذریعے غزل کا حصہ بنایا اور اچھی خاصی تعداد میں ایسے اشعار کہے گئے جن میں ہندوستانی فکر اور فلسفے کی رمق موجود ہے۔ ان تمام اشعار میں شاعرانہ خیال اور شاعرانہ بیان کی سطحیں مختلف ہیں، اس کے باوجود فکر اور فلسفے کی سطح پر یکسانیت نظر آتی ہے اور اشعار میں ہندوستانی تہذیب، فکر اور فلسفے کا فن کارانہ اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان میں ویدی تہذیب، بودھی تہذیب، اسلامی تصوف اور بھگتی تحریک کے علیحدہ اثرات کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی، کیونکہ ان تمام تصورات کی باہمی آمیزش سے ہندوستانی تہذیب کا وجود عمل میں آیا اور غزل کے شاعروں نے اسی فکر اور فلسفے کو اپنے اشعار میں نمایاں کرنے کی کوشش کی۔ غزل کے شعرا نے ہر عہد میں کسی نہ کسی نظریے کی اتباع میں شعر کہنے کی کوشش کی ہے۔ یہ اتباع کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ شعور، شعرا کو وراثت میں ملا جس کا اظہار انھوں نے فکری سطح پر جاری رکھا۔ اردو غزل کے شعرا نے اگر وحدت الوجود کے فلسفے کو اپنی شاعری میں اجاگر کیا تو بنیادی طور پر یہ اسی فلسفے کی ایک شکل تھی جو قدیم ہندوستانی فلسفے میں پہلے سے موجود اور رائج تھی۔

اسلامی تصوف کے ساتھ بھگتی تحریک کا جو سلسلہ پروان چڑھا، ان میں موضوعات کی سطح پر یکسانیت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ غزل کے شعرا نے وہی موضوعات اپنے اشعار میں پیش کیے جنھیں سنتوں اور بھگتوں نے اپنے خیالات میں بار بار ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ عرفان ذات، تسلیم خودی اور اس سے متعلق دوسرے نظریات بھی دراصل وحدت الوجود کے ہی فلسفے سے متعلق ہیں اور علیحدہ طور پر انھیں سمجھنے کے بجائے مجموعی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش زیادہ بامعنی ثابت ہوتی ہے۔ درج بالا سطور میں جتنے اشعار بھی مثال کے طور پر پیش کیے گئے ہیں، ان میں حقیقی وجود کا اطلاق، ذات مطلق پر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ہندوستانی فلسفے اور فکر کی اساس ہے۔ اردو غزل کے شاعروں نے اپنے عشقیہ اشعار میں زندگی کو جس طرح اجاگر کیا ہے وہ فارسی کی عشقیہ شاعری سے بالکل علیحدہ ہے۔ غزل کے شعرا جہاں ایک طرف بھگتی کے تصور عشق اور درد وسوز کی بنا پر ہندوستانی مزاج سے زیادہ قریب معلوم ہوتے ہیں، وہیں شعرا کا فلسفیانہ آہنگ انھیں گیتا اور اپنشد کے تفکرانہ خیالات سے قریب کر دیتا ہے۔ ان معنوں میں اردو غزل کے شعرا ہندوستانی ماحول اور مزاج کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں اور تصور عشق کی انوکھی کیفیات ان کی شاعری میں چار چاند لگا دیتی ہے۔

یہاں اس پہلو کو بہ طور خاص ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ تصور حسن و جمال نے خالص ہندوستانی فضا اور ماحول میں ہی ارتقا کی منزلیں طے کی ہیں۔ بلاشبہ اردو غزل نے فارسی غزل کی تقلید میں نہ صرف مضامین کو ہو بہو اپنانے کی کوشش کی بلکہ محبوب کے ایرانی تصور کو ہی قابلِ اعتنا سمجھا۔ ابتدا ہی میں یہی روش اختیار کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن رفتہ رفتہ اردو غزل نے ہندوستانی ماحول اور مزاج کے اعتبار سے اپنا ذہن ترتیب دینا شروع کیا۔ نتیجے کے طور پر ہندی اور ایرانی رویوں کا مشترک روپ رواج پانے لگا اور اعتدال کی راہ ہی غزل کی انفرادی راہ قرار پائی۔ فارسی غزل میں محبوب کے حوالے سے تذکیر کا صیغہ استعمال کیا جاتا رہا، لیکن دکن میں جب اردو شاعری کا فروغ ہوا تو وہاں فارسی شاعری کا اثر قبول کرنے کے بجائے مقامی زبانوں میں کی جانے والی شاعری کو زیادہ اہمیت دی گئی جس کی بنا پر 'دکنی غزل'، فارسی غزل کے اثرات سے محفوظ رہی اور کسی نہ کسی سطح پر اس غزل میں ہندوستانی رنگ ومزاج کی کارفرمائی دیکھنے کو ملنے لگی۔ آگے چل کر ولی دکنی نے اپنی شاعری میں محبوب کے ہند ایرانی تصور کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ محبوب کا ہند ایرانی تصور ہی اردو غزل میں قبول عام کی سند حاصل کر سکتا تھا کیونکہ ہندوستانی مزاج کی بدولت مجازی عشق میں بھی طہارت اور پاکیزگی کا تصور کارفرما تھا، اور اس کا بلا جھجک اظہار اسلامی تہذیب کے منافی تھا۔ لہٰذا ایک مشترکہ صورت ہی قابل قبول ٹھہری جس کی ابتدا ولی سے ہوتی ہے اور جو ہر عہد میں جاری وساری رہی۔ تصور حسن و جمال کو غزل کے شاعروں نے جلابخشی اور حسن کے ہندوستانی تصور کو اپنی غزلوں میں اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ درمیان میں لکھنوی شعرا نے تصور حسن و جمال کو بوالہوسی اور ابتذال پسندی کے قریب پہنچا دیا تھا، لیکن خوش قسمتی سے اردو غزل نے جلد ہی لکھنوی شاعری کی عریانی، سطحیت، لفاظی اور مبالغہ آمیزی سے کنارہ کشی کر لی اور تصور حسن و جمال میں انھیں نمونوں کو اپنے لیے اہم جانا جن میں ایک خاص قسم کی شائستگی شامل تھی۔ ذیل کے عشقیہ اشعار سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو غزل میں محبوب کا تصور، فارسی غزل کے تصور سے قدرے مختلف ہے۔ اس میں ہندوستانی تہذیب کی رنگارنگی شامل ہے۔ اس میں ہندوستانی مٹی کی بوباس موجود ہے۔ اس کے ذہن و مزاج میں ہندوستان کا کلچر، یہاں کی مخصوص تہذیب اپنی اہمیت کا احساس کراتی ہے:

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین، غزالاں سوں کہوں گا (قلی قطب شاہ)

تجھ عشق میں دل جل جل کر جوگی کی لیا صورت
یک بار اے موہن چھاتی سوں لگاتی جا (ولی)

مشتاق ہوں میں تیری فصاحت کا ولیکن
رانجھا کے نصیبوں میں کہاں ہیر کی آواز (سراج)

گلی اکیلی ہے اور یہ اندھیری راتیں ہیں
اگر ملو تو سجن سو طرح کی باتیں ہیں (آبرو)

اس نازنیں کی باتیں کیا کیا پیاریاں ہیں
پلکیں ہیں جس کی چھریاں آنکھیں کٹاریاں ہیں (مصحفی)

انکھڑیاں جادو ہیں پلکیں برچھیاں، بھالا نگاہ
بانکی چتون ہائے تیری دل کو کیا کیا جائے ہے (جرأت)

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو (مومن)

ان اشعار سے واضح ہوجاتا ہے کہ کلاسیکی غزل کے تمام اہم شاعروں نے ہندوستانی ذہن اور مزاج کو اپنی شاعری میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ اردو غزل کے بیشتر شعرا نے محبوب کا تصور پیش کرنے کے دوران انھیں کیفیات کی ترجمانی کی جو بچپن سے لے کر عہد جوانی اور پھر بعد کے زمانے تک ذہن و دل میں محفوظ رہے۔ اردو غزل میں محبوب کا تصور کبھی یکساں نہیں رہا۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی آتی گئی لیکن جو بھی تصور کارفرما رہا اس میں ہندوستانیت کی گہری چھاپ ہمیشہ حاوی رہی۔ اس وحدت کا نتیجہ ہے کہ سخت سے سخت آزمائشوں کے دور میں بھی غزل کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ غزل نے ہر طرح کے ماحول میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کی۔ اعتدال کا دامن تھامے رکھا، میانہ روی کو اہمیت دی اور ایسا انداز اختیار کیا کہ سخت سے سخت آزمائشوں میں بھی امکانات کی راہیں مسدود نہیں ہوئیں اور غزل کے شیدائیوں میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔

اردو غزل نے ہندوستانی ذہن و تہذیب کو اگر اپنے اندر رچایا اور بسایا تو صرف اس بنا پر کہ وہ تمام عناصر اس کے اپنے مزاج سے میل کھاتے تھے۔ رفتہ رفتہ غزل میں نہ صرف ہندوستان کی مٹی، آب و ہوا، موسم، چرند، پرند، پھول، ندی، جنگل، پہاڑ، کھیت کھلیان وغیرہ کا ذکر ہونے لگا بلکہ ہندوستانی تلمیحات کی پیش کش بھی رفتہ رفتہ غزل میں رواج پانے لگی۔ تلمیحات کے علاوہ کہاوتوں، مثلوں اور محاوروں میں بھی ہندوستانی مزاج کی جھلک آسانی کے ساتھ دیکھی جاسکتی ہے۔ اجتماعی حافظے میں ماضی کی جو روایات محفوظ ہوتی ہیں، انھیں ہی تلمیحات کا درجہ حاصل ہو پاتا ہے۔ اردو غزل کے شاعروں نے اپنے غزلیہ اشعار میں جہاں ہندو تیوہاروں سے متعلق تشبیہات کو فن کاری کے ساتھ استعمال کیا وہیں ہندو مذہب سے متعلق تلازمات کو بھی نظرانداز کرنے کی غلطی نہیں کی۔ شعرا نے غزلیہ اشعار میں دیگر ہندوستانی معاشرتی شعبوں کو بھی نمایاں کیا۔ ساتھ ہی ہندوستانی نباتات، چرند پرند، موسم، دریا، اور دیگر ہندوستانی پہلوؤں کو بھی غزل کے اشعار میں اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ اس نوع کے اشعار اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ غزل کے شاعروں نے ہندوستانی تہذیب کے متنوع پہلوؤں کو ہمیشہ ہی اپنے پیش نگاہ رکھا اور انھیں بڑے سلیقے سے غزلیہ اشعار میں نمایاں کیا۔ مختلف اشعار کی مدد سے ان کیفیات کو سمجھنے میں آسانی ہوگی:

تری زلفاں کے حلقے میں رہے یوں نقش رخ روشن
کہ جیسے ہند کے بھیتر لگیں دیوے دیوالی میں (ولی)

برج میں ہے دھوم ہوری کی ولیکن تجھ بغیر
یہ گلال اڑتا نہیں بھڑکے ہے اب تن من میں آگ (سودا)

سرخ و سپید رنگ سے ہوتا ہے آشکار
وہ جسم نازنیں ہے عبیر و گلال کا (آتش)

ہے تماشہ گاہ سوزِ تازہ ہر یک عضو تن
جوں چراغانِ دوالی صف بہ صف جلتا ہوں میں (غالب)

واں تو ہے زرد پوش یہاں میں ہوں زرد رنگ
واں تیرے گھر بسنت ہے یاں میرے گھر بسنت (مومن)

رخسار یار حلقۂ کاکل میں ہے عیاں
یا چاند ہے سراج اماوس کی رات کا (سراج)

گلے میں گیروی کفنی ہے اب میر
تمھاری میرزائی ہوچکی بس (میر)

گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب 'اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب' میں مختلف عنوانات کے تحت ایسے اشعار کثرت سے نقل کیے ہیں جن میں ہندوستانی تہذیب کی بہترین ترجمانی کی گئی ہے۔ اوپر جتنے بھی اشعار موضوع بحث آئے ہیں۔ وہ سب غزل کے کلاسیکی سرمایے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی غزل کے کلاسیکی شعرا نے ہندوستانی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کو خاطر خواہ اہمیت دی۔

بیسویں صدی میں اردو غزل مختلف تغیرات سے دوچار ہوتی رہی، اس صدی کی ابتدائی تین دہائیوں میں اردوغزل اپنے احیائی دور سے گزرتی رہی۔ حالی کے بعد اقبال، اکبر، حسرت، اصغر، یگانہ، فانی اور دیگر شاعروں نے غزل کو نت نئی تبدیلیوں سے ہم آہنگ کیا۔ ان سب کی مشترکہ کاوشوں سے غزل کو اس کا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل ہوا اور غزل میں زندگی اور کائنات کے متعدد پہلوؤں کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔ اسی عہد میں ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوئی جس کے تحت نظموں کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جانے لگا اور غزل کی شدید مخالفت کی گئی۔ ترقی پسندوں نے اس بات پر زور دیا کہ بدلتے ہوئے زمانے کا ساتھ غزل نہیں دے سکتی اور اسی لیے بلا جھجک اس کی گردن ماردینی چاہیے۔ لیکن ایسے نازک دور میں بھی غزل کا جادو برقرار رہا اور اس نے تمام تر مخالفتوں کا سامنا کرتے ہوئے بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ اپنے آپ کو کامیابی کے ساتھ تبدیل کیا۔ فیض، مجروح اور مخدوم وغیرہ نے اس ضمن میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ غزل کا سلسلہ کامیابی کے ساتھ اس عہد میں بھی جاری رہا لیکن اس پورے مرحلے میں ہندوستانی تہذیب کی ترجمانی پر خاص توجہ نہیں دی جاسکی۔ چونکہ غزل کو اس کا کھویا ہوا وقار واپس دلانا تھا اور ترقی پسند عہد میں نظم کے شانہ بہ شانہ غزل کو بھی نمایاں کرنا تھا، لہٰذا غزل کے فن کو زیادہ سے زیادہ نکھارنے اور اس کی فن کارانہ پیش کش کو نشان زد کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اس بنا پر ہندوستانی تہذیب کے متنوع پہلوؤں کو غزل میں اس طرح پیش نہیں کیا جاسکا، جس کی روایت پیش رو غزلوں میں موجود تھی، لیکن ترقی پسند تحریک کے دوران ہی ایک ایسی فضا ہموار ہونے لگی تھی جو غزل کی نکھار کے لیے بے حد خوش گوار تھی۔ جدید شاعری کے آغاز نے اردو غزل کے شاعروں کو ایک بار پھر ہندوستانی تہذیب کی مستحکم بنیادوں کو اجاگر کرنے کی سازگار فضا فراہم کی۔

جدید غزل کے تحت شاعروں نے اپنے اشعار میں ہندوستانی ماحول، رہن سہن، موسم، چرند پرند، اور ہندوستانی تہذیب کے رنگارنگ پہلوؤں کو نمایاں کیا۔ اس طرح جدید غزل کے ذریعے اس روایت کا سلسلہ جوڑنے کی کوشش کی گئی جو 19 ویں صدی کے آخری دور بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں بعض وجوہات کے سبب ٹوٹ چکا تھا۔ جدید غزل میں اشعار کے ذریعے ہندوستانی تہذیب اور ماحول کی ایک جھلک دیکھتے چلیں:

چھن چھن کے آرہی ہے گپھاؤں سے روشنی
تن پر وہی لباس ہوں پیروں کی چھاؤں کے (زیب غوری)

سارا منظر ہے اجنتا کی گپھاؤں کی طرح
لڑکیاں شہر میں پھرتی ہیں گھٹاؤں کی طرح (زبیر رضوی)

اے مظفر کس لیے بھوپال یاد آنے لگا
کیا سمجھتے تھے کہ دلی میں نہ ہوگا آسماں (مظفر حنفی)

اب نہ وہ گیت، نہ چوپال، نہ پنگھٹ نہ الاؤ
کھوگئے شہر کے ہنگاموں میں حالات مرے (فضیل جعفری)

چتا کی آگ ہوں کیا مجھ میں چُن رہا ہے تو
اٹھا سکے تو مرے استخواں سے آگ اٹھا (مصور سبزواری)

ریت بہہ جائے ہر اک جھیل سے دانش اک دن
صاف پانی میں اگر ہنس کا جوڑا اترے (وہاب دانش)

روح میں رینگتی پھرتی ہے گنہ کی خواہش
اس امربیل کو اب تو کوئی دیوار ملے (ساقی فاروقی)

وہ رنگ رنگ کے چھینٹے پڑے کہ اس کے بعد
کبھی نہ پھر نئے کپڑے پہن کے نکلا میں (انور شعور)

دیکھوں تو مرے جسم پہ شاخیں ہیں نہ پتے
سوچوں تو گھنا پیڑ میں برگد سے زیادہ (اقبال ساجد)

ویسے تو مجموعی طور پر ترقی پسند شاعروں نے ہندوستانی ماحول اور تہذیب کو اپنی غزلوں میں اجاگر کرنے کی جانب زیادہ توجہ نہیں دی، لیکن ترقی پسند شاعروں میں فراق تنہا ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی غزلوں میں ہندوستانی تہذیب کے رنگارنگ پہلوؤں کو تواتر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ فراق نے سنسکرت شاعری کی جمالیات سے خاطر خواہ استفادہ کیا اور ہندی کے نرم الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے اپنی غزلوں کو ندرت بخشی۔ فراق کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب کی رنگارنگی مختلف زاویوں سے نمایاں ہوتی ہے اور یہی فراق کے غزلیہ اشعار کی انفرادیت ہے:

دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی
کہ جگمگا اٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ

چپکے چپکے اٹھ رہا ہے مدھ بھرے سینوں میں درد
دھیمے دھیمے چل رہی ہیں عشق کی پروائیاں

یہ تیرا شعلۂ آواز ہے کہ دیپک راگ
قریب و دور چراغ آج ہوگئے روشن

یہ چاندنی رات، یہ برہ کی پیڑا
جس طرح الٹ گئی ہوں ناگن ڈس کے

انگڑائی میں راج ہنس تولے ہوئے پر
یا دودھ بھرا مان سروور ہے بدن

ہے سینہ کہ سنگیت پچھلے پہر کا
وہ چہرہ کہ اوشا، پشیماں پشیماں

چنچل چنچل جوبن جیسے
ادھ کھلی کلیاں، ادھ سنے راگ

فراق کی شاعری، اردو کی غزلیہ شاعری میں مستثنیٰ قرار دی جاسکتی ہے۔ انھوں نے ہندوستانی لب ولہجہ اور ہندوستانی تہذیب کے مشترکہ احساسِ جمال کو اپنی شاعری میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ انھوں نے اپنے غزلیہ اشعار میں صدیوں کی ہندوستانی تہذیب سے ہمکلام ہونے کی گنجائش نکالی۔

اردو غزل نے ہر عہد میں ہندوستانی مزاج اور ماحول کے اعتبار سے اپنے ذہن اور رویے میں اہم اور واضح تبدیلیاں کی ہیں۔ اردو غزل کا بنیادی ڈھانچہ بلاشبہ فارسی غزل سے متاثر ہے لیکن موضوعات اور پیشکش کی سطح پر اردو غزل نے ہندوستان کے مقامی اثرات کو اشعار میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو غزل نے تخلیقی سطح پر بعض ایسے رموز و علائم بھی اختیار کیے جن کا رشتہ ایرانی تہذیب وثقافت سے رہا ہے، لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اپنے ارتقائی سفر میں اردو غزل نے بہت جلد ہندوستانی تہذیب کو اپنے مزاج سے ہم آہنگ کرنا شروع کردیا اور اشعار کی صورت میں ان اثرات کی کامیاب پیشکش بھی ہر دور میں جاری رہی۔

■

Dr. Rashid Anwar Rashid, Dept of Urdu, Muslim University, Aligarh- 202001 (UP)

خلیق الزماں نصرت

اردو اشعار میں ہندوستانیت

کافی غور وخوض کے بعد یہ بات ذہن میں آئی کہ زبانوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔

آسمانی : جو تقدس مآب ہوتی ہیں۔ صحیفوں کی زبانیں ہوتی ہیں۔ عبرانی، سنسکرت اور عربی زبانوں کو ان میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ آسمانی زبانیں اپنے مذہبی تقدس کی بنا پر زندہ رہتی ہیں۔

سلطانی : یہ وہ زبانیں ہوتی ہیں، حکومتیں اور سرکار دربار جن کی سرپرست اور نگراں ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک سمیت ماضی اور حال میں علی الترتیب فارسی اور ہندی زبانیں سلطانی زبان کے رتبے پر فائز رہی ہیں۔ ان زبانوں کا استعمال سرکار کے خزانے کے عامرہ اور طاقت کے زور سے چلتا ہے۔ اس لیے سرکاری دفاتر میں یہ زبانیں چلتی ہیں۔ مگر وہیں تک محدود بھی رہ جاتی ہیں۔

عوامی : یہ وہ زبانیں ہوتی ہیں جنھیں قوموں کا تمدن باہمی ربط وضبط اور ضرورتوں کا تبادلہ، تہذیبی، ثقافتی عائلی، خاندانی، شادی بیاہ موت ومیت، انفرادی گھریلو، شہری محلّہ واری، علاقہ واری اور اجتماعی تقاریب جیسے عوامل جنم دیتے ہیں۔ ان کو نہ تو آسمانی زبانوں کا تقدس حاصل ہوتا ہے۔ نہ سرکار دربار کی سرپرستی ملتی ہے۔ لیکن عوامی زبانیں فطری اور منطقی طور پر خوب پھولتی پھلتی ہیں۔

یہ زبانیں دیگر زبانوں کے اپنے مزاج سے ہم آہنگی صالح اور صحت مند اجزا جذب کر لیتی ہیں اور عام رابطے کی مقبول زبان بن کر عوام پسندی اور رائج زبان کا تاجِ افتخار حاصل کر لیتی ہے۔ اردو زبان بھی ایک ایسی مقبول زبان ہے جو عروس ہند کے ماتھے پر افتخار کا دمکتا جھومر ہے۔

ماہر القادری کے مطابق:

اس کو قوموں کے تمدن نے کیا ہے پیدا
کون کہتا ہے کہ لشکر کی زباں ہے اردو

پنڈت دتاتریہ کیفی کے خیال میں ار۔دو، سنسکرت اور فارسی زبانوں کا مرکب ہے۔ سنسکرت میں 'ار' کے معنی دل اور فارسی میں 'دو' کے معنی دو / 2 ہیں۔ اس وضاحت سے اردو زبان دو دلوں کے اتحاد کی نشاندہی کرتی ہے۔

مسلمانوں کے دورِ عروج میں جب ان کی سلطنت پورے ہندوستان پر پھیلی تھی، بالعموم فارسی زبان رائج تھی۔ اردو کا ابتدائی دور تھا۔ جب ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کو زوال آیا اور ایک ایک کر کے ان کی ساری چھوٹی بڑی سلطنتیں انگریزوں کے قبضے میں چلی گئیں۔ انگریزوں کے تسلط اور انگریزی زبان کے ہمہ گیر اثرات کے زمانے میں اور فارسی زبان کے پس منظر میں چلے جانے کے بعد ہندو مسلم آبادی میں زبان اور رابطے کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے مل کر اردو زبان کو منتخب کیا۔

اس وقت تک اردو کے علاوہ کسی اور زبان میں اتنی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ ملک میں عوامی رابطے کی مشترکہ زبان (Lingua Franca) بن سکتی۔ اردو خالص ہندوستانی زبان ہے۔ وہ اسی آب و ہوا میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ زبانوں کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ زبانیں اپنی تہذیبی علامتوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ اردو زبان کو جس تہذیب نے جنم دیا ہے وہ ایک مخلوط ہندوستانی تہذیب تھی۔ ابتدائی اردو کے بارے میں کئی نظریے ہیں۔ اردو دکن میں اپنے ابتدائی دور میں تھی اس کو دیکھ کر دکن کو اردو کا خطّہ کہا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ گولکنڈہ اور بیجاپور کی قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتیں ہیں جو شمالی ہندوستان کے مقابلے میں فارسی کے ماحول سے زیادہ آزاد تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے شعرائے دکن میں ہندوستانیت کا کافی ذکر آیا ہے۔ ہندو مسلمان کے تہواروں کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے۔

قلی قطب شاہ 1580 میں تخت پر بیٹھا جس کا یہ شعر آج بھی مشہور ہے:

پیا باج پیالہ پیا جائے نہ
پیا باج یک تل جیا جائے نہ

قلی قطب شاہ کے شعروں میں ہندوستانی ماحول کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ اس میں ہندو اور مسلمان کے تہذیبی تال میل کا ذکر ہے۔ اس کے مطالعے سے ہندوستانی فضا کا جیتا جاگتا روپ سامنے آجاتا ہے۔ اس زمانے میں زیورات کیسے ہوتے تھے۔ لباس کا ملا جلا نقشہ نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ سندور ہندوستانی تہذیب کا ایک حصہ ہے۔ اسے ہندو مسلمان دونوں استعمال کرتے تھے:

پلک کانٹے نین باندیا نہ جاوے خیال تیرے کن
رقم اس خیال مو پیشانی کوں سندو کر ساقی

بسنت کا موسم بڑا پیارا موسم ہوتا ہے۔ اس کا سواگت کرتے ہوئے قلی قطب شاہ کہتے ہیں:

بسنت کھیلیں ہمن ہور ساجنا یوں
کہ اسماں رنگ شفق پایا ہے سارا

ان کے اشعار میں جا بجا ہندوستانی پھولوں، کھیلوں تہواروں اور رسم ورواج کا ذکر ہے۔ دیوی دیوتاؤں کے حوالے ہیں کہنے کا مطلب ابتدا ہی سے اردو شاعری میں ہندوستانیت ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

''دکن میں ایرانی اور ہندوستانی تہذیبی عناصر کے میل سے جس تمدن کا خمیر اٹھا تھا وہ لباس کی تزئین، تراش خراش، رہن سہن کے طریقوں، طرز تعمیر آداب ومعاشرت اور طرز فکر کے اعتبار سے ایک مخلوط تہذیب کا آئینہ دار تھا...... قلی قطب شاہ نے اپنی شاعری میں جہاں اپنے مذہبی خیالات کا اظہار کیا ہے وہاں ہندوستانی طرزِ فکر اور

ہندوستانی کلچر کا اثر نمایاں کیا ہے۔ یعنی محمد علی قطب شاہ اپنی فکر میں خالص ہندوستانی طرزِ فکر کا اظہار کرتا ہے۔''

دکن کے ہی علی صاحب میاں جنھوں نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے ہوئے طنز کے تیر چلائے ہیں:

اپنا گلا ہے، ہاتھ بھی اپنے
اپنی کمر ہے لات بھی اپنے
ہندو مسلم نفاق کیا بولوں
ہونٹ بھی اپنے دانت بھی اپنے

ابراہیم عادل شاہ کی ایک تخلیق 'نورس' میں ایسے گیت ہیں جو ہندو دیومالا سے منتج ہیں، شیو، پاروتی، سرسوتی، اندر وغیرہ کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ اس کے علاوہ شیخ و برہمن کی باتیں اردو شاعری میں بھری پڑی ہیں:

شیخ ہو یا برہمن معبود ہے سب کا وہی
ایک دونوں کی منزل پھیر کچھ راہ کا (نامعلوم)

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے (غالب)

لڑتے ہیں جاکے باہر یہ شیخ اور برہمن
پیتے ہیں میکدے میں ساغر بدل بدل کر (مائل دہلوی)

اردو کی ترقی میں ہندو مسلم دونوں کا ہاتھ ہے۔

سرور جہاں آبادی درگا سہائے نے کہا:

اے آبروِ گنگا اف ری تری صفائی
یہ تیرا حسنِ دل کش، یہ طرز دل ربائی

تو ایک صوفی صفت شاعر محسن کاکوروی نے گنگا کے تعلق سے ایک شعر ایسا کہا کہ شاہکار بن گیا:

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لائی ہے صبا گنگا جل

راہی اور اردو کے دوسرے شعرا نے کربلا کے حالات نظم کیے تو چکبست نے رامائن کا منظوم ترجمہ کیا ہے:

دونوں کے دل بھر آئے ہوا اور ہی سماں
گنگ وجمن کی طرح سے آنسو ہوئے رواں
ہر آنکھ کو نصیب یہ اشکِ وفا کہاں
ان آنسوؤں کا مول اگر ہے تو نقدِ جاں
ہوتی ہے ان کی قدر فقط دل کے راج میں
ایسا گہر نہ تھا کوئی دسرت کے تاج میں

وحشی کانپوری نے اپنی بے مثال نظم 'دروپدی چیر ہرن' کا واقعہ بیان کیا جو ہر ایک ہندوستانی کو ازبر ہے۔ آخری بند دیکھیے:

ساری کھنچنے لگی دیوی کی ادھر طاقت سے
تھان پر تھان ادھر کھلنے لگے سرعت سے
دشمنِ ننگ بہت برسرِ آزار ہوا
چیر بڑھتی ہی گئی تن نہ نمودار ہوا
آخرش چیر کے بڑھنے کا یہ طومار ہوا
وہ جو دربار تھا اک کپڑے کا بازار ہوا

اقبال نے نانک کے عنوان سے یہ نظم لکھی:

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروانہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

نظیر ایک حقیقی شاعر ہیں جو خالص ہندوستانی ہیں۔ نظیر اکبر آبادی اردو ادب میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب،

جہاں نظیر نے آدم، ارسطو امیر حمزہ حضرت سعدی جیسی کئی شخصیتوں کا ذکر کیا ہے وہیں نارائن گنیش، ارجن، تلسی، پاربتی وغیرہ سیکڑوں ہندوؤں کے بھگوان دیوی دیوتاؤں کا ذکر کیا ہے۔یہاں تک کہ پرندے پتنگے اور اڑنے والے کیڑے جو ہندوستان میں عام ہیں اس کابھی ذکر کیا ہے۔ نظم 'ہولی' نظیر اکبر آبادی کی مشہور نظم ہے۔

ہندوستانی زبان، انوکھے موضوعات اور اسلوب وزبان کے ساتھ ابھر، ان کی شاعری میں میلوں، ٹھیلوں، بازاروں، تیوہاروں، تقریبوں، شادی بیاہ کی عکاسی ہے۔ نظیر ہی ایک ایسا شاعر ہے جس نے ہندوستان کی چھوٹی موٹی سبھی خصوصیات کو اپنی شاعری میں داخل کیا ہے۔ انھیں ہندوستانی ہونے پر فخر ہے۔ انھیں اپنی زبان پر بھی فخر ہے۔ اپنی شاعری کے لیے ایسی زبان کو انھوں نے چنا ہے جو اس زمانے میں ہندوستان کی زبان تھی۔ وہ ہندو مسلمان دونوں کی مشترکہ تہذیب کے دلدادہ تھے۔ بلکہ یہ کہنا درست ہے کہ ہندو شعرا نے بھی ہندوستانیت سے لبریز اتنے اشعار نہیں کہے ہوں گے جتنے نظیر نے کہے ہیں۔

مشہور محقق شریف احمد قریشی نے فرہنگ نظیر سے قبل ایک فہرست دے دی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ نظیر نے اپنے کلام میں جہاں حضرت علی کے 40 نام اور القاب استعمال کیے ہیں وہیں سری کرشن کے جو نام اور القاب برج راج، پربنس، مکٹ دھر پال، شیام، کرشن وغیرہ کا اپنے شعروں میں استعمال کیا ہے ان کی تعداد 77 ہے۔

جہاں نظیر نے آدم، ارسطو امیر حمزہ حضرت سعدی جیسی کئی شخصیتوں کا ذکر کیا ہے وہیں نارائن گنیش، ارجن، تلسی، پاربتی وغیرہ سیکڑوں ہندوؤں کے بھگوان دیوی دیوتاؤں کا ذکر کیا ہے۔ یہاں تک کہ پرندے پتنگے اور اڑنے والے کیڑے جو ہندوستان میں عام ہیں اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ نظم 'ہولی' نظیر اکبر آبادی کی مشہور نظم ہے۔ آخری بند ملاحظہ ہو:

ہر آن خوشی میں آپس میں سب ہنس ہنس رنگ چھڑکتے ہیں
رخسار گلابوں سے گلگوں کپڑوں سے رنگ ٹپکتے ہیں
کچھ آگ اور رنگ جھمکتے ہیں کچھ مئے کے جام چھلکتے ہیں
کچھ کودے ہیں کچھ اچھلے ہیں کچھ ہنستے ہیں کچھ بکتے ہیں
یہ طور یہ نقشہ عشرت کا ہر آن بنا یا ہولی نے

اب 1857 کے قریب کی باتیں کرتے ہیں۔ غیرملکی استعماری حکومت کے خلاف 1857 کی تاریخی بغاوت سے عالمگیر جنگ اول اور دوم کے دوران اردو صحافت نے جنم لیا اور چوں کہ اس کے مزاج میں آزادی اور بغاوت کا خمیر شامل تھا، اس لیے اس بار کھل کر نوخیز اردو صحافت نے غیرملکی غاصب حکومت کے خلاف زبردست ذہن سازی کی اور عوامی شعور کو اتنا پائیدار و پختہ کر دیا کہ وہ کسی کی غلامی کو قبول کرنے کا روادار نہ ہوا۔

اردو کے شاعر اور ادیبوں نے اپنے قلم سے انگریزوں کی مخالفت کی۔ سودیشی تحریک چلی تو شاعروں نے اس کی حمایت کی۔ مولانا حسرت موہانی نے تو اس تحریک کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیا تھا۔ اس تحریک کا ان پر اس قدر اثر ہوا کہ انھوں نے ایک اسٹور کھول لیا جس میں صرف ہندوستان میں بنی ہوئی چیزیں بکنے لگیں۔

وطن سے جن کو محبت نہیں وہ کیا جانیں
کہ چیز کون بدیشی ہے کیا سودیشی ہے
(محروم)

جدوجہد آزادی کا ہر وہ عمل چاہے وہ سودیشی تحریک، سوراج سائمن واپس جاؤ، جلیان والا باغ سب کے لیے اردو کے شاعروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔تلک پٹیل، بھگت سنگھ، کی آواز پر اردو والوں نے لبیک کہا ہے:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

ہندوستان نے خلا اور چاند پر کئی راکٹ بھیجے ہیں۔ 22اکتوبر 2008 کو بھی ایک راکٹ (PSLVC II) چاند میں جانے کے لیے چھوڑا گیا۔اسی طرح کا ایک راکٹ ایر مارشل راکیش شرما کے ماتحت 1اپریل 1984 کو 8دنوں کے لیے خلا میں روانہ کیا گیا تھا۔اس وقت کی وزیراعظم اندرا گاندھی نے راکیش شرما سے (جب وہ خلا میں تھے)پوچھا تھا''خلا سے ہندوستان کیسا لگ رہا ہے'' تب راکیش شرما نے برجستہ اپنے جذبات اور اپنی خوشی کا اظہار اسی مصرع سے کیا تھا:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

یہ نظم سب سے پہلے 'زمانہ' کانپور میں ستمبر 1904 کے شمارے میں شائع ہوئی۔اس میں یہ شعر بھی تھا:

پنجاب کیا ،دکن کیا بنگال کیا بمبئی کیا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

آزاد ہندوستان کے پہلے دن ہی پارلیمنٹ میں پڑھا گیا۔اس وقت سے لے کر آج تک یہ قومی ترانہ کے جیسا استعمال ہوتا آرہا ہے۔

کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے کے مصداق آزادی ملی،اس صدی میں صدیوں سے غلام چلے آرہے ہندوستانیوں نے قربانیاں دیں اور آزادی کی مشعل روشن کی گئی، آزادی ملی مگر وہ آزادی نہیں تھی جس کی ہم نے تمنا کی تھی:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

(فیض)

کیوں ہم سے پوچھتے ہو کہ ساکن کہاں کے ہیں
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستان کے ہیں

(محسن زیدی)

اس طرح کے اظہار کا مقصد اردو شاعری نے سماج کے بدلتے ہوئے حالات پہ گہری نظر رکھی ہے۔اردو شاعری میں ہندوستان کی داستان ہے۔عہد بہ عہد مطالعہ کیجیے اور حالات سے واقف ہوتے جایئے۔حب وطن ہر شاعر میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ایک طرف چکبست نے کہا:

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نور حسن ازل عیاں ہے
کیا زیب و زینت اوج عز وشاں ہے

'حب وطن' پر حالی نے نظم کہی:

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو
اٹھو اہل وطن کے دوست بنو
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھ غیر
مرد ہوتو کسی کے کام آؤ
ورنہ 'کھاؤ' پیو چلے جاؤ

آپس کی بھائی چارگی کا احساس ہندوستانیوں میں دلانے کے لیے نظم بڑی کامیاب ہے۔یہ کام حالی کے علاوہ اکبر اقبال، ظفر علی خاں، حسرت موہانی، تلوک چند محروم، مولانا محمد علی جوہر سے ہوتے ہوئے ساغر نظامی تک پہونچا۔

اس طرح ہم نے دیکھا کہ پنڈت سندر لال نے مہاتما گاندھی کو جو لکھا تھا کہ وہ صد فی صد درست ہے۔

''اردو نہ مسلمانوں کی اور نہ کسی اور کی مذہبی زبان ہے اور نہ کبھی تھی وہ صرف اس ملک کے رہنے والوں کی جن میں ہندو مسلمان، عیسائی اور جین شامل ہیں قدرتی اور مادری زبان ہے۔اس کو ترقی دینے میں ہندوؤں نے اتنا ہی حصہ لیا ہے جتنا مسلمانوں نے اور آج تک بہت سے ہندوؤں کو اس پر ایسا ہی فخر ہے جیسا کہ مسلمانوں کو ہے۔''

گذشتہ دو تین صدیوں کا ہندوستانی اردو لٹریچر ہر فرقے کی مشترکہ کوششوں اور ذہنی صلاحیتوں کی کمائی ہے اور اردو ہندوستانی تہذیب اور سماج اور مزاج کا ایک تلازمہ بن گئی ہے۔اس میں ہندوستان کے ماضی کی ادبی اور سماجی تاریخ ہے ۔اردو زبان میں ہندوستانیوں کے بدلتے شعور کی عکاسی، حیات نو کی دھڑکنیں، فکر و جذبے کا آہنگ اور ہر دور کے انقلاب کے لہو کی گرمی شامل ہے۔

■

Khaliquz Aman Nusrat,Kaaenat Publication, Flat No 15, Bld No4, Sai Nagar Colony, Bhivendi - 421302 (MS)

محمد ذاکر

اردو میں ہندوستانیت کا مصور شاعر: نظیر اکبرآبادی

ڈاکٹر محمد ذاکر کا یہ مضمون ان کے کتابچے 'نظیر کا آوازہ بلند' سے ماخوذ ہے۔ محمد ذاکر اردو کے اہم ادیبوں اور مترجمین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی کئی کتابیں منظرعام پر آکر مقبول ہوچکی ہیں جن میں آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب، خواجہ حیدر علی آتش، انتخاب غزلیات آبرو مع مقدمہ قابل ذکر ہیں۔ چالیس برسوں تک وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بحیثیت استاد اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔

اردو زبان اور ہندوستانیت کو نظیر کی شاعری سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ اس موضوع پر محمد ذاکر کا یہ مضمون ان کے شکریے کے ساتھ اردو دنیا کے قارئین کے لیے خاص طور پر پیش کیا جارہا ہے۔

نظیر اکبرآبادی ہندوستان کی گنگا جمنی معاشرت کے نمائندہ تیکھے اردو شاعر ہیں۔

ہندوستان اور ہندوستانیت نظیر کی شاعری کا جوہر اعظم ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ نظیر سے پہلے اور بعد کے اردو شعر و ادب میں ہندوستان اور ہندوستانیت نہ جھلکتے ہوں۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان سولہویں صدی کے شاعر محمد قلی قطب شاہ ہی کی نظموں میں کچھ مخصوص ہندوستانی جلوؤں سے اُس کا والہانہ لگاؤ ظاہر ہے اور بالعموم اردو شعر و ادب میں ہندوستان کی بو باس اور اُس کے سیاسی اور معاشرتی کوائف کے عکس اور ان سے پیدا ہونے والی عام ذہنی فضا موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شغف و انہماک اور عوام سے جو قربت نظیر کے ہاں ہے اور اپنے عہد کے شہر کی زندہ زندگی کی جو وسعت اس کے کلام میں سمائی ہوئی ہے (وہی شہر جس میں کساد بازاری کی وجہ سے نواحِ شہر کا کوئی فلاکت زدہ باسی بھی مداری یا نٹ یا ریچھ والا یا بندر والا بن کر روٹی روزی کے لیے آنکلتا تھا) اور نظیر کا جو رویہ اُس کی نظموں سے مترشح ہوتا ہے وہ اس کا امتیاز ہے۔ اس اعتبار سے باوجود اس حقیقت کے کہ اُس کے ہاں براہِ راست ہلکے پھلکے بیان میں متانت کا پہلو دبا ہوا ہے اس کا پلّہ اردو شعرا میں سب سے بھاری ہے۔

نظیر نے عام آدمی کے جذبوں اور رویوں کی ترجمانی اسی کی زبان میں کرکے اردو شاعری میں ایک روایت کو استحکام بخشنے کی جرأت کی ہے۔ وہ عوام کے جذبوں اور گوشت پوست کے جسموں کی حرارت و حرکت کا شاعر ہے، عوام جنھیں اکثر زعما، عوام کالانعام یا ادنیٰ اور معمولی کہہ کر نظرانداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ وہ ذرا بھی غور کریں تو یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوجائیں کہ ہستی کا یہ تار و پو، یہ کارخانہ ایسے ہی کروڑوں عوام کالانعام، ادنیٰ اور معمولی آدمیوں ہی کی وجہ سے آباد اور زندہ نظر آتا ہے اور وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ جس نہج سے وہ دوسروں پر حکم لگاتے ہیں اُس سے وقیع تر ایک اور نہج بھی ہے جہاں سے وہ اپنی محدود نظر کی وجہ سے خود صفر نظر آسکتے ہیں۔

نظیر وہ شاعر ہے جس کا کلام عوام تک پہنچا اور انھوں نے اسے اپنے سینوں میں محفوظ کرلیا۔ گلیوں اور بازاروں میں اسے زبانی سنا اور سنایا۔ بعد میں بہادر شاہ ظفر کی شخصیت اور ان کے المناک انجام نے بھی ان کی چند غزلوں کو یہ قبول عام بخشا لیکن نظیر غالبًا تنہا شاعر ہے جو عملاً اور عمداً خواص کا نہیں بلکہ عوام کا بن کے رہا۔ اُس کی شخصیت پر اس کی شاعری پردہ نہیں ڈالتی، وہ الفاظ کی کاوش نہیں کرتا کیونکہ وہ جو کچھ کہتا ہے بے ساختہ اور برملا کہتا ہے۔ تصنع خواہ وہ مضمون کا ہو یا زبان کا اُس میں نام کو نہیں۔ وہ حقیقت میں 'آزاد' مرد تھا۔ وہ دنیا میں رہا، دنیا کی چہل پہل پر لکھا بھی بہت مگر فی الحقیقت اُس نے درباروں کی تمنا کبھی نہیں کی، وہ مصاحبت اور ہم جلیسی کے داغ سے محفوظ ہی رہا۔ مفلسی میں قسمت کی شکایت بھی نہیں کی۔ تونگری سے تو شاید اُسے سابقہ ہی نہیں پڑا۔ اپنی کھال میں مست ہونے کی بات شاید اُس پر بخوبی صادق آتی ہے۔

اردو شاعری پر بے شک بازار، خانقاہ اور دربار کی چھاپ ہے، نظیر اکبرآبادی کے ہاں بازار کی چھاپ زیادہ ہے، خانقاہ کی کم اور دربار کی بالکل نہیں۔ خانقاہ بھی صرف اِس اعتبار سے اُس کے کلام میں جگہ پاتی ہے کہ وہاں مجمع خلائق ہوتا ہے۔ کاروبارِ ہستی کا اہم ترین مرکز بازار ہے جہاں آدمی اپنی مختلف النوع سرگرمیوں میں مصروف رہتا ہے۔ بازار نظیر کے ہاں اپنی تمام ہماہمی کے ساتھ موجود ہے اور اسی طرح وہ گھریلو اجتماعات بھی جو خوشی کے مختلف موقعوں پر ہندوستانی گھروں میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔

نظیر کو اس سے دل چسپی نہیں تھی کہ کائنات کی تخلیق کا راز تلاش کرے یا غور کرے کہ روح کیا ہے یا حیات بعد ممات کوئی حقیقی چیز ہے یا نہیں؟ یا فرد اور کائنات کا رشتہ کیا ہے؟ یا یہ کہ یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ یا اسی قبیل کے دوسرے مسائل۔ وہ صومعہ یا گھر کی چاردیواری یا اپنی ذات کے حصار میں اسیر رہ کر محض تخیل کی آنکھ سے کائنات پر نظر نہیں ڈالتا بلکہ ہر رُت اور ہر آن میں گھر سے باہر میلوں میں، باغوں میں، بازاروں میں، زنان خانوں کے اجتماعوں میں بے محابا چلا جاتا ہے اور ایک ایک بات کی تصویر محفوظ کرلیتا ہے۔ اس کی دنیا اس اعتبار سے وسیع ہے اور اسی وسعت کی وجہ سے اس میں روایتی ہی سہی مگر سنجیدگی کی لہر بھی ہے مگر محض ایک لہر، اُتنی ہی دیر کے لیے جتنی دیر کے لیے ایک عام نارمل (Normal)

آدمی، ہستی کے کاروبار میں گھرا ہوا آدمی، باوضو رہ سکتا ہے۔ نظیر خلق میں پہنچ کر اپنی آواز بلند کرتا ہے اس طرح کہ خلق کو محسوس بھی نہ ہو کہ کوئی اور ان سے الگ بول رہا ہے۔ وہ خلق کو اپنے گرد جمع کرنے کا شائق نہیں، کسی منبر پر چڑھ کر وہ لوگوں سے خطاب نہیں کرتا، وہ ان میں نامحسوس طور پر گھل مل جانے کا فن جانتا ہے اور اسے برتتا بھی ہے۔

نظیر ہر گھات کے انسانی تماشے کا دلدادہ ہے۔ ہندوستان اور ہندوستانی عوام کی تصویر کا کون سا رنگ ہے جو اُس کے ہاں نہیں۔ ہندوستان کے موسم، پھل پھول، عمارتیں، ہندوستان کے لوگ، ان کے لباس، پوشاک، ان کے زیور، ان کے پیشے، ان کی تفریحات، ان کے اوہام اور تقریبات اور معتقدات، ان کی رسوم، کہیں حمدِ الٰہی، نعتِ رسول، منقبتِ علی، مدحِ سلیم چشتی یا مدحِ گرونانک شاہ ہو رہی ہے، کہیں کنہیا جی کی راس لیلا رچ رہی ہے، کہیں بچے کی پیدائش پر ڈھول کھڑک رہے ہیں، گیت گائے جا رہے ہیں، کھیل کھلونوں کا گلزار سا کھلا ہے۔ عرسوں کا زور شور، میلوں کی دھوم دھام، کہیں تیرا کی کا میلہ ہے کہیں بلدیو جی کا، کہیں ساحل و دریا، کشتی و گرداب، موج و صدف کی سیر ہے، کہیں برسات کی بہاروں کا بیان، کہیں اکبرآباد کی تعریفیں ہیں، کہیں جمنا جی کی، کہیں روضۂ تاج گنج کی، آندھی اور بھونچال کی آمد آمد، گرمی کا مزہ، چاندنی کا سماں، برسات کی جھڑی، کبھی اُمس اور کبھی نرم نرم پھواریں، سردی کی کپکپی تھرتھری، غرض کل ہندوستانی موسموں کی جھنکاریں، باغوں کا سماں، درختوں پر چڑھتی لہکتی ہوئی بیلیں، پرندوں کی چہکاریں، پھولوں کی قطاریں، حسینوں کی جھولوں پر پینگیں، عاشقوں کا اژدحام اور کامرانی، الھڑ نازنینوں کی چہلیں اور دلستانی، پیرو برنا کی وَشا، غریبوں اور امیروں کے صبح و مسا، طفلی میں معصومیت کے مزے، جوانی کے عیش کا آہنگ اور دھوم دھڑکے، بڑھاپے کا قہر اور کبھی تعلّی، عوام کا دکھ درد، کہیں کساد بازاری، کہیں عیش کی تیاری، برسات میں بھٹیارے کی مصیبت اور لوگوں کے کیچڑ میں سَنے ہوئے پیر، گھر میں، بیزار میں قدم قدم پر پھسلن، بازار میں مداری کی ڈگڈگی کی ڈُگ ڈُگ، بندر بندریا کا ناچ چل چل، رُک رُک، ڈھیلے ڈھالے مَیلے پھٹے کپڑوں میں ریچھ والا، ریچھ کی کشتی کا تماشا، ساتھ ساتھ بچوں کا جھلّڑ، سپیرے کی بین کی دُھن پر سانپ کا پھن پھیلا کر جھومنا، کہیں پود نے اور اَرنے بھینسے کی لڑائی، کہیں بلبلوں کی جنگ، چھپی کے اشاروں پر کبوتروں کی حلقہ زنی، لقا کبوتروں کی کساوٹ، بچوں بڑوں کے کھیل، گلی ڈنڈا، چوسر اور شطرنج کی چالیں، پتنگ کی ٹھمکیاں، اینچ پیچ کبھی ڈھیل کبھی کھینچ، ہولی میں ڈھولک کی مخصوص تال پر تھرکتی ہوئی گاتیں، انوکھے سوانگ، انوکھی ملاقاتیں، کرشن کنھیا کے جنم دن کا آنکھوں دیکھا حال، گھر گھر نہال، دیوالی میں محرابوں پر، دروازوں پر، منڈیروں پر جگمگ کرتے دیوں کی قطاریں تو ہیں ہی، قسم قسم کی مٹھائیوں کے تھال کے تھال چلے چلے آتے ہیں اور ساتھ میں کھانڈ کے کھلونے ہیں اور خاص طور پر شوالوں کے کھانڈ کے بنے نمونے، فتح مند کرداروں کی اپنی مخصوص آن والی کھانڈ کی مورتیاں دوکانوں کے آگے ڈھیر کی ڈھیر سجی ہیں، پھر حسینوں کے بالوں کی گندھاوٹ، چہروں کی جھم جھماوٹ، مسّی کی دھڑی، کاجل کی کھچاوٹ، کبھی مہادیو کی برات، نادیا بیل پر شو جی کی سواری، کہیں عید کی تیاری میں کھلونوں کی بہار، کھانڈ کے بنے ہوئے مع پردوں کے پالکی اٹھائے کہار، باریک رنگین کاغذ کی قندیلیں اور کہیں لکڑی کی روپہلی رنگ کی تلواریں، کہیں شب برات پر چھوٹتی ہوئی آتش بازی جس کا بھنڈار ہی ختم ہونے میں نہیں آتا، کہیں پھُل جھڑی، کہیں گھن چکر، کہیں لٹّو، کہیں اَنار، کہیں مہتابی کہیں شتابی، ہر اک کی بہار الگ، روشنی الگ، چٹاخ پٹاخ الگ— رسمِ دنیا، موقع و دستور— اور پھر غریب، امیر، خواص اور ان سے زیادہ عوام، سب کیفی اور مست!

نظیر وہ شاعر ہے جس کا کلام عوام تک پہنچا اور انھوں نے اسے اپنے سینوں میں محفوظ کرلیا۔ گلیوں اور بازاروں میں اسے زبانی سنا اور سنایا۔ بعد میں بہادر شاہ ظفر کی شخصیت اور ان کے المناک انجام نے بھی ان کی چند غزلوں کو یہ قبول عام بخشا لیکن نظیر غالباً تنہا شاعر ہے جو عملاً اور عمداً خواص کا نہیں بلکہ عوام کا بن کے رہا۔ اُس کی شخصیت پر اس کی شاعری پردہ نہیں ڈالتی، وہ الفاظ کی کاوش نہیں کرتا کیونکہ وہ جو کچھ کہتا ہے بے ساختہ اور برملا کہتا ہے۔

نظیر کی نظمیں پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مشاق فلم ڈائرکٹر فوٹو گرافر ہے جس نے ان سب متحرک نظاروں کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنے کی قسم کھائی ہے۔ کنہیا کے جنم دن کے احوال میں بچے کی پیدائش پر مبارکباد دینے والیوں اور 'جچّا' اور نوزائیدہ کے لیے تحفے تحائف اور کالا دانہ اُتارنے کا بیان دیکھیے یا ذرا برسات کی بہاریں ہی دیکھیے: بادلوں کی گڑگڑاہٹ، بجلی کی جگمگاہٹ، بوندوں کی جھم جھماوٹ، سبزوں کی لہلہاوٹ۔ ان سب سے برستی ہوئی برسات سامنے آجاتی ہے اور پھر خود اسی کے الفاظ میں ''شعروں سے بھی موتیوں کی بوندیں برستیاں ہیں۔'' پھر یہ بھی دیکھیے کہ پانی ایک ہی بادل سے برس رہا ہے مگر جن پر برس رہا ہے وہ ہزار ہیں اور ان ہزاروں کی اِس بارش میں الگ الگ ایک طرفہ کیفیت ہے۔ بچے، بڑے، عورت، مرد، مریض، تندرست، دستکار، نانبائی، بھٹیارے، کمیرے، بے فکرے، شادمان و کامران وصل سے سرشار عاشق، برہ کی ماری جوان نازنین، سب کے حالات جدا، جذبات جدا، اور نظیر کی ان سب پر نظر اور ان کی مختلف دلی کیفیات کے اظہار کے لیے زبان پر زبردست گرفت، ٹھیٹھ بولی کا ٹھاٹھ۔

نظیر کی نظم 'آدمی نامہ' اپنی قسم کی الگ ہی نظم ہے۔ یہ ہندوستان اور ہندوستانیت یا کسی روایتی موضوع تک محدود نہیں بلکہ یہ پورے آدمی کا، پورے انسانی سماج کا احاطہ کرتی ہے، وہ بھی محض ایک محدود تاریخی دور ہی کے آدمی یا سماج کا نہیں بلکہ اس کی معنویت آفاقی رنگ دکھاتی ہے۔ اس میں نظیر آدمی کو ہر محدود نظر اور نظریے سے بے پروا ہو کر دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ آدمی ویسے بھی اس کے ہاں سپاٹ، گھُٹا گھُٹا، ٹھُس اور بے رنگ اکائی نہیں ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ عقلِ محض یا مادّیت پرستی کے محدود نظریے پر مبنی فکر و فلسفے کی یک رُخی یا اس کی منجمد حدود میں رہتے ہوئے آدمی کی کثیر الابعادیت کو، اس کی گوناگوں فطرت کو قطعیت سے سمیٹا بھی نہیں جاسکتا۔ آدمی کی تاریخ اور اس کی سرگرمیوں کے پیش نظر بھی جتنا اُسے سمجھنے کی کوشش کرو اتنا ہی اس کی فطرت کے تضادات پریشان کردیتے ہیں اور ان تضادات کے کما حقہ وقوف و شعور کے بعد یک رُخا اور جذباتی رہنا مشکل، شاید ناممکن ہوجاتا ہے۔ تضادات اور طبائع کے اختلافات کو قائم رکھتے ہوئے انھیں اتنا نہ بڑھنے دینا کہ وہ مستقل آویزش بن کر سماج میں انارکی (Anarchy) یا انتشار کی کبھی نہ ختم ہونے والی صورتِ حال پیدا کردیں، یہی نظم و ضبط مختصراً تہذیب کا حرفِ آغاز ہے اور اس کی انتہائی غرض و غایت بھی۔

ماخذ: نظیر کا آوازہ بلند: محمد ذاکر، سنہ اشاعت : 2003، مطبوعہ: جید پریس، بلی ماران، دہلی

■

Dr. Mohd Zakir,496, Churi Walan, Jama Masjid, Delhi - 110006

نورالحسنین

اردو افسانہ میں ہندوستانیت

ہندوستان جنت نشان، دنیا کے نقشے پر ایک ایسا ملک ہے، جس نے کئی تہذیبوں کو پروان چڑھایا۔ مختلف زبانوں کو جنم دیا، مختلف مذاہب کو اپنی آغوش میں سمیٹا، مختلف رسم ورواج کی پاسداری کی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر یہاں مندروں سے شنکھ کی آوازیں اُبھرتی ہیں تو مسجدوں سے اذانیں گونجتی ہیں۔ گردواروں میں گروبانی عقیدت کی منزلیں طے کرتی ہے تو گرجاؤں سے اہنسا کے پیغام بلند ہوتے ہیں۔

اسی گنگا جمنی تہذیب کے اشتراک سے اُردو زبان پیدا ہوئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے سارے ہندوستان کا رس اپنی مٹھاس میں سمیٹ لیا۔ اُردو شاعری نے فارسی زبان کا گھونگھٹ کاڑھے حضرت امیر خسرو کی اُنگلی تھامی اور ہندوستانی تہذیب و معاشرت اور قومی اتحاد و یکجہتی کے نغمے گائے، یہاں کے باغ و بن، یہاں کی ندیاں، یہاں کے کھیت وکھلیان، یہاں کی حسیناؤں، یہاں کے رانجھاؤں سے دل لگایا، یہاں کے سورماؤں اور یہاں کے اوتاروں کی پرستش کی، یہاں کے سنتوں اور صوفیوں کے مٹھوں اور خانقاہوں میں ڈیرے ڈالے، دکھی دلوں کو جوڑا، کبھی جائسی کی زبان کہلائی تو کبھی کبیر کے دوہوں کا پیغام بنی، عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کا سفر طے کیا۔ نثر کا دامن تھاما تو 'معراج العاشقین' اور 'سب رس' کے حوالے سے دنیائے ادب کے مقابل آکر کھڑی ہوگئی۔

نثری اصناف میں سب سے مقبول صنف، صنفِ افسانہ ہے۔ اس کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہی ہے کہ یہ زمین سے اور زمین پر آباد افراد سے جڑا ہوا ہے۔ افسانہ اپنے اندر بہت کچھ بیان کرنے کی اہلیت اور سب کچھ سمیٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ شاعری اشارہ ہے اور افسانہ عمل۔ یہ کیمرے کے فریز شاٹس نہیں دکھاتا بلکہ مووی کیمرے کی طرح چلتی پھرتی ہنستی گاتی روتی بسورتی زندگی کا احوال پیش کرتا ہے۔ اس لیے اس کا دامن بہت وسیع ہے۔

ہندوستان میں ہندو اور مسلمان ہمیشہ ہی شیر وشکر کی طرح رہے ہیں۔ اس یکجہتی کی تصویریں اُردو افسانے میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں۔ تقریباً ہر افسانہ نگار کے پاس اس موضوع پر کم سے کم ایک افسانہ تو مل ہی جاتا ہے۔ یہ اتحاد جب پختہ ہوجاتا ہے تو مذہب کی دیواریں درمیان سے ہٹ جاتی ہیں اور سچے خلوص کی روشنی چاروں طرف پھیلنے لگتی ہے۔ کلام حیدری کے افسانے 'روشنی کی ضمانت' کا یہ منظر ملاحظہ فرمائیں:

'' پھر میرے باپ نے دیے کو اپنی ہتھیلی پر رکھا اور ہال کی سیڑھیوں سے اُتر رہا ہے... اور ذرا سا گھوم کر چھوٹی سی مسجد کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہے... وہ مسجد کے دروازے میں داخل نہیں ہوتا۔ ہاتھ بڑھا کر روشن دیا مسجد کے آنگن میں رکھ دیتا ہے اور اندھیرے آسمان کے اوپر مسجد کے گرے ہوئے مینار کو دیکھتا ہے...

'' ہے بھگوان!''

اس مسجد میں گنگو کی دیا (مالکن) سینی میں افطار کا سامان رکھ کر گنگو کو پورے رمضان بھر دیا کرتی تھی، اور گنگوا سے موذن صاحب کے حوالے کر دیتا تھا۔

کون جانے...

میں پریاگ کہہ رہا ہوں کہ روزہ افطار کرنے والوں کی دُعاؤں میں گنگو کا کتنا حصہ تھا۔''(1)

دیپاولی کے دیے صرف ہندوؤں کے مکانات ہی میں روشن نہیں ہوتے اور پٹاخے، پھلجھڑیاں، انار، گھر گھر چھوٹتے ہیں۔ قدیم زمانے میں خاص طور پر بسنت کے موقعے پر بیٹیاں سسرال سے مائیکے آتی تھیں۔ آج بھی ایسے ہزاروں خاندان ہیں جن کی بیٹیاں تہواروں کے موقعوں پر اپنے مائیکے آتی ہیں۔ ذکیہ مشہدی جن کا تعلق لکھنو سے بھی رہا ہے اور لکھنو اپنی اس گنگا جمنی تہذیب کے لیے صدیوں سے جانا جاتا ہے۔ لیکن اب وقت بدل گیا ہے۔ دلوں میں وہ خلوص بھی نہیں رہا پھر بھی محبت اور ماضی کی یادیں دلوں کو کریدتی رہتی ہیں۔

افسانہ 'بڈا امری نہیں' کا یہ اقتباس پھر ایک بار اُسی ماحول کی طرف لے جاتا ہے۔

'' اللہ زمانے بعد آپا آئیں تو آج چھوٹی بھاوج کہہ رہی تھی، ''خدا کا شکر ہے کہ لڑکی کو ساتھ نہیں لائیں۔'' اُس کا لہجہ صفیہ کو بے چین کر گیا۔

وہ جان بوجھ کر تہوار کے زمانے میں آئی ہے۔ ہولی، دیوالی دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ مٹّی کے کھلونوں کو وہ خواب میں دیکھتی ہے اور رنگ کی پچکاری کو اور دیہاتی طرز سے سجے گھروندے کو جو اتنا خوبصورت ہوا کرتا تھا اور محبت کی مٹھاس بھری اس سہیلی کو جو اس قدر جاہل تھی کہ میاں کو خط نہیں لکھ پاتی۔ دیوالی تو محبت بھرا تہوار ہے، روشن اور میٹھا۔''(2)

رقص اور موسیقی ہندوستانی روح میں سمائے ہوئے ہیں۔ اُردو افسانہ زندگی کے ان لوازمات سے بے گانہ نہیں ہے۔ جیلانی بانو کے افسانے میں گائیکی اپنے کلاسیکی انداز میں اس طرح سامنے آتی ہے:

'' بھیروی کے سات کومل سُر مل کر ایک رس ساگر بنے اور سارے محل میں بہنے لگے۔ بھیروی کے سُروں کا یہ سمپورن سنگھار روپ اندھیرے میں جھلملانے لگا تو گہری تاریکی میں لپٹا ہوا سورج جیسے بے کل ہو اُٹھا۔''(3)

بھگتی تحریک اور تصوّف بھی ہندوستانی تہذیب کا ایک بڑا سرمایہ ہے۔ یہ عقیدتوں کا وہ سفر ہے جہاں ذات پات، جماعت فرقے اپنی اصلیت سے بے نیاز ہوکر حاضر ہوتے ہیں اور اپنی عقیدتوں کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ اردو میں تصوف مزاج افسانے بڑی تعداد میں لکھے گئے۔ خاص طور پر دکن میں، چونکہ دکن صوفیائے کرام کا پسندیدہ علاقہ رہا ہے اس لیے یہاں عزیز احمد سے

حمید سہروردی اور بیگ احساس سے نورالحسنین تک تصوف مزاج افسانے مل جاتے ہیں۔ ان افسانوں میں کہیں خانقاہوں کی منظر کشی ہے۔کہیں مرشد اور مرید کے معاملات ہیں، کہیں مرشد اپنے مرید کا استحصال کر رہا ہے تو کہیں مرشد اپنے مرید کے حق میں باپ بن کر اُس کی زندگی کے فیصلے کر رہا ہے۔ کہیں اللہ ہو اور حق اللہ کے نعرے ہیں تو کہیں کلمہ اول کی ضرب سے قلب کی اُڑانیں ہیں، کہیں وجد کی کیفیتیں ہیں اور کہیں بند کمروں میں مدھم روشنی میں الہ اللہ کی ضربیں ہیں:

'' خانقاہ عود اور لوبان کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ سارے ہی مشائخین و مریدین درجہ بدرجہ بیٹھے ہوئے تھے۔ دھواں آہستہ آہستہ چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ لا الہ الہ اللہ محمد الرسول اللہ کا ورد زور وشور سے جاری تھا۔ مدھم روشنی میں ایک ساتھ بلند ہونے والی آوازیں عجیب رمز کی کیفیت بخش رہی تھی لیکن زین الدین وہاں ہوتے ہوئے بھی کہیں اور تھا، گو اُس کی زبان ورد کر رہی تھی لیکن دل الہ اللہ کی ضرب سے خالی تھا۔ مشائخین پہلی ضرب سے دوسری ضرب کی طرف رجوع ہوئے اُن کے دل روشن ہوتے جا رہے تھے۔ وہ عجیب سرشاری کی کیفیت میں ضرب لگاتے، الہ اللہ... الہ اللہ... ''(4)

اسی طرح بھگتی تحریک کے زیر اثر گرو اور چیلوں کے آشرم کا احوال بھی اُردو افسانے میں دکھائی دیتا ہے۔ خصوصاً جدیدیت کے زمانے میں ہر افسانہ نگار کسی نہ کسی بابا یا گرو کو بطور علامت ضرور استعمال کرتا تھا اور اُس کے وسیلے سے زندگی کے مختلف فلسفوں سے بحث کرتا تھا۔ ڈاکٹر بیگ احساس کا افسانہ 'خس آتش سوار' بھی ہندوستان کی اُسی روایت کی نشاندہی کرتا ہے:

'' صبح وہ مڈیٹیشن ہال پہنچ گئے۔ حسبِ معمول وہاں بہت سارے چیلے اور چیلیاں موجود تھیں۔

'' وچار کرو۔ اپنے نفس کو پہچاننے کی کوشش کرو۔ اسی میں مکتی ہے۔ سَیم شانتی نفس کو پہچاننے سے ملتی ہے۔ اس کے سوا سب دھوکا ہے۔ مایا جال ہے۔ منش کی ظاہری شکل بھی دھوکا ہے۔ اس لیے آثار و مظاہر میں نہیں کھونا چاہیے۔ اصل آتما ہے۔ شریر ایک خول ہے۔ آتما کو پہچانو منش کی اصلیت کو جانو اور واستوکتا کا گیان حاصل کرو۔ آتما سے پرماتما تک پہنچنے کا راستہ تلاش کرو۔''

'' پھر ہمارے شریر کیا ہیں؟'' گورے چٹے چیلے نے سوال کیا۔

'' ایک سندر خول اور کچھ نہیں۔''

'' ہماری حقیقت کیا ہے؟''

'' کسی کی کوئی حقیقت نہیں۔ حقیقت یا واستوکتا صرف بھگوان ہے۔ سرشٹی کا استھتوا واستوک یا ستیہ نہیں ہے۔ جو کچھ نظر آتا ہے وہ دھوکا ہے۔''

'' آتما کیا ہے؟''

'' آتما کا بھگوان سے الگ کوئی وجود نہیں۔ سرشٹی کے کن کن میں وہ اُپستیت ہے۔''(5)

ہندوستان میں عیسائی بھی موجود ہیں اور اُن کی نمائندگی اردو افسانے میں نہ ہو یہ ناممکن ہے۔ قرۃ العین حیدر کے مختلف افسانوں میں گرجا گھروں کی تفصیل مل جاتی ہے۔ اُردو افسانے نے ہندوستان میں موجود ہر تمدن اور ہر قوم کے رسوم و رواج کو اپنے اندر سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں اگرچہ پارسیوں کی تعداد بہت کم ہے لیکن اس کے باوجود بھی اردو ادیبوں نے اُنھیں فراموش نہیں کیا۔ ڈاکٹر

ہندوستان میں ہندو اور مسلمان ہمیشہ ہی شیر و شکر کی طرح رہے ہیں۔ اس یکجہتی کی تصویریں اُردو افسانے میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں۔ تقریباً ہر افسانہ نگار کے پاس اس موضوع پر کم سے کم ایک افسانہ تو مل ہی جاتا ہے۔ یہ اتحاد جب پختہ ہوجاتا ہے تو مذہب کی دیواریں درمیان سے ہٹ جاتی ہیں اور سچے خلوص کی روشنی چاروں طرف پھیلنے لگتی ہے۔

بیگ احساس نے افسانہ 'دُخمہ' لکھ کر پارسیوں کی مذہبی، معاشرتی زندگیوں کا احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے:

'' صبح ہم دونوں پارسی گٹھ گئے۔ کتا ہمیں دیکھ کر بھونکنے لگا۔

'' ارے بیٹے تم لوگ؟''

'' چاچا کل کسی کا انتقال ہوا تھا؟''

'' ہاں بیٹا۔''

'' دو دو آدمی کیوں قطار بنا کر چلتے ہیں؟''

'' یہی طریقہ ہے، تنہا کوئی نہیں چلتا۔''

'' اُنھوں نے رومال کیوں پکڑ رکھا تھا؟''

'' وہ رومال نہیں اُسے پیوند کہتے ہیں۔''

'' اور یہ گول عمارت؟''

'' یہ 'دخمہ' ہے۔ اس کی چھت درمیان سے اونچی ہوتی ہے۔ چھت پر تین دائرے بنے ہیں۔ مرد کی نعش بیرونی دائرے میں، عورت کی درمیانی دائرے میں اور بچوں کی نعش اندرونی دائرے میں رکھی جاتی ہے۔ تاکہ ان پر تیز دھوپ پڑے اور گِدھوں کو دور سے نظر آجائے۔''

'' چاچا یہ کتا اتنا عجیب کیوں ہے؟'' میری بھانجی نے پوچھا۔

'' اسے 'سگ دید' کہتے ہیں۔ چار آنکھوں والا کتا... اس کی چار آنکھیں نہیں ہیں لیکن آنکھوں پر ایسے نشان ہیں جس سے اس کی چار آنکھیں نظر آتی ہیں۔ یہ سگ دید ہی آدمی کے نیک و بد ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔''

'' کیسے چاچا؟''

'' جب بڑے ہو جاوگے تو خود ہی پتہ چل جائے گا۔'' چاچا نے اُکتا کر کہا۔

'' اور چاچا یہ گِدھ کہاں سے آتے ہیں؟''

'' اگر فرش پر چینی گر جائے تو چونٹیاں کہاں سے آتی ہیں؟'' چاچا نے سوال کیا اور اندر چلے گئے۔''(6)

اُردو افسانے میں ہندوستان کے شب و روز سانسیں لیتے ہیں، پریم چند نے ہندوستانی دیہاتوں کو موضوع بنایا، کرشن چندر نے اگر کشمیر کا نظارہ کرایا تو منٹو نے امرتسر، ممبئی، لاہور، انبالہ، دہلی کے شب و روز کا نقشہ کھینچا، قرۃ العین حیدر لکھنو اور اُتر پردیش کے مختلف مقامات کی سیر کرواتی ہیں۔ جیلانی بانو اور اقبال متین حیدرآباد اور اُس کے مختلف مقامات دکھاتے ہیں، غیاث احمد گدی، سہیل عظیم آبادی، شکیلہ اختر بہار کی سرزمین کو اپنا محور بناتے ہیں۔ اردو افسانوں میں ہندوستان کے موسم بھی ہیں پھل پھول بھی ہیں، باغات بھی ہیں، وہیں، یہاں کے موسموں کا احوال ہے، امیر غریب طبقے بھی ہیں۔ جھونپڑیاں بھی ہیں اور کوٹھیاں بھی ہیں۔ غرض پورا ہندوستان آباد ہے۔

حوالے :

(1) افسانہ: روشنی کی ضمانت، کلام حیدری، کتاب روشنی کی ضمانت، ص 19، مرتبہ ڈاکٹر ارتضی کریم، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی۔

(2) افسانہ... بدّ امری نہیں۔ ذکیہ مشہدی، ماہنامہ آج کل دہلی 32، اپریل 1993 ص

(3) افسانہ... ظلِ سبحانی، جیلانی بانو، کتاب، سچ کے سوا، ص 136 تا 137، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی

(4) افسانہ... تقلیب، نورالحسنین، کتاب، گڑھی میں اُترتی شام، ص 69، وجد میموریل سوسائٹی اورنگ آباد

(5) افسانہ... خس آتش سوار، ڈاکٹر بیگ احساس، کتاب حنظل، ص 40، مکتبہ شعر و حکمت حیدرآباد

(6) افسانہ، دُخمہ، ڈاکٹر بیگ احساس، سہ ماہی نیا ورق ممبئی، ص 85 تا 86، جلد 11 شمارہ 33

■

Noorul Hasnain, 1-12-31, Pragati colony, Ghati, Aurangabad 431001 (M.S)

احسان حسن

اردو نثر کے بنیادی اسالیب

دو چیزیں ہوتی ہیں، کیا کہنا ہے؟ اور کیسے کہنا ہے؟ یہی ''کیسے کہنا ہے'' اسلوب ہے۔ ''کیا کہنا ہے'' مواد کہلاتا ہے۔ اسلوب مواد کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے۔ یہ نثر نگار کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے مواد کے موافق اسلوب کا انتخاب کرے۔ دراصل مواد ہی طے کرتا ہے کہ اس کا اسلوب کیا ہوگا۔ ایک بہادر کی داستانِ جنگ کو بیان کرنے کا اسلوب الگ ہوگا اور ایک عاشق کی داستانِ محبت کو بیان کرنے کا اسلوب الگ۔ اپنے بچے کی یاد میں تڑپتی ایک ماں کے جذبات کو زبان دینے کے لیے جو اسلوب درکار ہوگا، وہ اسلوب ایک عورت کا اپنے مرد کی جدائی کے احساس کی ترجمانی نہ کر سکے گا۔ اسلوب ہی اظہارِ خیال کا ذریعہ ہے۔ کسی خیال اور کسی جذبے کی طرف لوگ کس حد تک توجہ دیں گے یہ اس کے اظہار کے اسلوب پر منحصر ہوتا ہے۔ اسلوب اور مواد دونوں ایک دوسرے کے لیے ہوتے ہیں۔ کسی کے پاس بے شمار خیالات موجود ہیں لیکن اگر وہ ان کے اظہار کی موثر ادا سے محروم ہے تو سب بے کار! اسی طرح اگر کسی کے پاس بے شمار پیرایۂ اظہار ہے اور وہ خیالات سے خالی ہے تو اس کا بھی کوئی مطلب نہیں۔ غرض یہ کہ مواد اور اسلوب میں دونوں کی حیثیت برابر کی ہے، کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔

اردو نثر کا ابتدائی اسلوب 'فارسی زدہ اردو' اور 'مرصع' اسلوب تھا۔ بعد کو دوسرے اسلوب کے طور پر 'عام فہم و سادہ اسلوب' کی بنیاد پڑی۔ رفتہ رفتہ وقت گزرنے کے ساتھ زبان و ادب کے معیار میں تبدیلی آتی گئی جس کا اثر اسلوب پر بھی پڑا۔ مختلف اسالیبِ نثر اور ان کے کئی کئی دھارے وجود میں آئے۔ نثر نگاروں نے اپنے اپنے مزاج اور مذاقِ سخن کے اعتبار سے اسالیب اختیار کیے جو اُن کی ادبی شناخت کا باعث بنے۔ کسی نثر نگار نے کسی خاص اسلوب کی پیروی کرتے ہوئے اسے پروان چڑھایا تو کسی نے کئی کئی اسالیب نثر میں طبع آزمائی کا جوہر دکھایا۔ اسلوب سے نثر نگاروں کی پہچان ہونے لگی۔ لوگوں کو کسی تحریر کے چند جملے سے اُس کے لکھنے والے کا نام معلوم ہونے لگا۔ اردو نثر میں داستان، ناول، افسانہ، مضمون نگاری، طنز و مزاح وغیرہ میں ایک سے بڑھ کر ایک با کمال شخصیتیں اور ان کے کارنامے منظر عام پر آئے۔ کسی ایک صنف میں ہی کئی کئی اسلوب پیدا ہوئے مثلاً افسانے میں ہی کسی کا طنزیہ و مزاحیہ اسلوب رہا تو کسی کا رومانی اسلوب رہا۔ ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی فنکار نے جب الگ الگ موضوعات پر لکھا تو موضوع کے اعتبار سے اسلوب بھی بدل گیا اور اس طرح ایک ہی فنکار کے یہاں ہمیں مختلف اسالیبِ نثر نظر آنے لگے۔ اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے جن لوگوں نے اردو نثر کو فیضیاب کیا اُن میں عطا حسین تحسین، شاہ عالم ثانی، میر امّن، رجب علی بیگ سرور، رتن ناتھ سرشار، محمد حسین آزاد، مرزا غالب، الطاف حسین حالی، سرسید احمد خاں، پریم چند، مولانا ابوالکلام آزاد، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، قرۃ العین حیدر، پروفیسر سید احتشام حسین، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر کلیم الدین احمد، شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا کہ اردو نثر کا ابتدائی اسلوب فارسی زدہ اردو اور مرصع اسلوب تھا اور بعد کو دوسرے اسلوب کے طور پر عام فہم و سادہ اسلوب کی بنیاد پڑی۔ ظاہر ہے اسلوبیاتی تبدیلیوں کی پیمائش کے لیے زمان و مکان کی جستجو لازم ہے اور ان تقاضوں کی پڑتال بھی ضروری ہے جن کے مخصوص اثرات سے لوگوں کے مزاج، فکر اور فطرت میں غیر معمولی تبدیلی آگئی۔ اس لحاظ سے ہماری نظر اٹھارویں صدی عیسوی کے شمالی ہند پر مرکوز ہوتی ہے جہاں سے اردو نثر کے بنیادی اسالیب کی شکل اور سمت واضح ہونے لگتی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں اٹھارویں صدی عیسوی مزید انقلابات کی صدی ہے۔ مغلیہ سلطنت زوال آمادہ صورتِ حال اختیار کر رہی تھی اور انگریزوں کا اقتدار ہندوستان پر بڑھتا جا رہا تھا۔ ماحول میں ایک انتشار سا برپا تھا۔ لوگوں کے دلوں میں بدیسی راج کا خوف گھر کرتا جا رہا تھا۔ ایسے میں خواص اپنے نہاں خانوں سے نکل رہے تھے اور عوام سے مخاطب ہو رہے تھے۔ اُس دور کی سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی تبدیلیوں نے عوام کی اہمیت کو مزید تقویت دے دی جس سے زبانِ اردو جو عوام کی زبان تھی خواص کے لیے بھی وسیلۂ اظہار بننے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں فارسی کا اثر کم ہونے لگا اور اردو زور پکڑنے لگی۔ اِسی دور میں مذہبی تحریکیں بھی زور پکڑتی ہیں۔ صوفیائے کرام نے تبلیغ کے لیے عوامی زبان اردو کا ہی سہارا لیا۔ اردو کو مسلمان، ہندو اور عیسائی عالموں نے مذہبی تصانیف کے لیے استعمال کیا۔ اس صدی کی بیشتر تصانیف اپنے عوامی سروکار کی وجہ سے اردو کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ اٹھارویں صدی میں نہ صرف بائبل کو اردو میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی گئی بلکہ اردو زبان کے قواعد و لغات بھی مرتب ہوئے۔ تمام تر داستانیں اردو میں لکھی گئیں اور عوام کو تفریح و دلچسپی کا سامان فراہم کیا گیا۔ غرض یہ کہ اٹھارویں صدی عیسوی ایک ایسا دور تھا جس میں اردو تقریباً عوامی زبان کے طور پر رائج ہو چکی تھی۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے شمالی ہند میں جو اردو کی نثری تصانیف وجود میں آئی ہیں اُن میں عام طور پر دو طرح کی تصانیف ہیں ایک داستانوی اور دوسری مذہبی۔ داستانوی تصانیف کے ذیل میں جو خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں اُن میں نواب عیسوی خان کی 'قصہ مہر افروز و دلبر'، میر محمد عطا حُسین خاں تحسین کی 'نوطرزِ مرصع'، مہر چند کھتری کی 'نو آئینِ ہندی'، شاہ عالم ثانی کی 'عجائب القصص'، سید حُسین شاہ حقیقت کی 'جذبِ عشق' وغیرہ کے نام آتے

ہیں۔ اسی طرح مذہبی تصانیف کے ذیل میں 'کربل کتھا' از فضل علی فضلی، 'تفسیر مرادیہ' از شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی، 'تفسیر رفیعی' از شاہ محمد رفیع الدین وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اِن تصانیف میں عام طور پر دو طرح کے اسالیب نثر ملتے ہیں، ایک 'فارسی زدہ اُردو نثر کا اسلوب' اور دوسرا 'عام فہم و سادہ اُردو نثر کا اسلوب'۔ 'نوطرزِ مرصع' اور 'کربل کتھا' میں 'فارسی زدہ اردو نثر کا اسلوب' ملتا ہے جب کہ باقی دیگر تصانیف 'عام فہم و سادہ اُردو نثر کا اسلوب' اختیار کیے ہوئے ہیں۔

مواد کے اعتبار سے داستانوی تصانیف میں یکسانیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ کم و بیش سبھی داستانوں میں بادشاہ، بادشاہ کی لااولادی، فقیر کی دعا سے بادشاہ کو اولاد 'بیٹا'، پھر بیٹے پر طلسمی سایہ، ایک وفادار وزیر اور اس کا بیٹا، پریوں کا ملک، پریوں کی شاہزادی، دیو جن، پریوں کی شاہزادی اور بادشاہ کے بیٹے کا عشق، پریوں کی شاہزادی اور بادشاہ کے بیٹے کا نکاح، بڑے بڑے خوبصورت باغ، محل، دلفریب نظارے، نہر، دریا، پہاڑ، لوگوں کے پاس کوئی جادوئی طاقت، جو اکثر بادشاہ کے بیٹے اور پریوں کی شاہزادی کے پاس ہوتی، ایک دو نیک دِل اعلیٰ صفات نصیحت دینے والے کردار اور پھر آخر میں انجام اچھا اور خوشگوار ہوتا ہے۔ اِن داستانوں میں خوابیدہ عمل حاوی ہے۔ لوگ ذاتی زندگی میں جو حاصل نہ کر پاتے تھے اُسے داستانوں کی تصوراتی اور خیالی دنیا میں حاصل کرنا چاہتے تھے۔ داستان گوئی کا عمل اُس دور میں ایک رواج سا بن چکا تھا۔

مذہبی تصانیف میں دین و مذہب کی باتیں پیش کی گئیں۔ اِن میں واقعاتِ کربلا کو ترجیح دی گئی۔ اس کے علاوہ حدیث کی تفسیریں اور کلام اللہ یعنی قرآن پاک کے ترجمے اُردو نثر میں پیش کیے گئے۔ اِس طرح کی تصانیف کی نثر زیادہ عام فہم و سادہ ہے۔ لہجے میں عوامی زبان و بیان اور اُردو کا مزاج نمایاں ہے کیوں کہ اِن کا مقصد عوام سے گفتگو اور عام آدمی تک اپنی بات کو پہنچانا تھا۔ اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے اٹھارویں صدی عیسوی کے شمالی ہند میں تشکیل پانے والی اِن مذہبی تصانیف کا غیر معمولی مقام ہے۔ اُردو نثر کے دوسرے اسلوب 'عام فہم و سادہ نثر' کو رواں دواں بنانے میں اِن کا اہم رول ہے، ابتدائی دور کے ضمن میں اٹھارویں صدی عیسوی کے شمالی ہند میں تشکیل پانے والی بیش تر تصانیف طبع زاد نہ ہوکر فارسی سے اردو میں ترجمے کی شکل میں ہیں۔ عطا حسین تحسین کی مقبول ترین تصنیف 'نو طرزِ مرصع' فارسی تصنیف 'قصہ چہار درویش' سے اخذ کی گئی ہے۔ اسی طرح فضل علی فضلی کی 'کربل کتھا' بھی فارسی تصنیف 'روضۃ الشہدا' کے ترجمے کے طور پر اُردو میں برآمد ہوئی ہے۔ فضلی نے واضح طور پر لکھا ہے کہ فارسی کے الفاظ عورتوں کی سمجھ میں نہ آتے تھے جس سے وہ مجلسوں میں رونے کے ثواب سے محروم رہ جاتی تھیں۔ شاہ عبدالقادر نے 'موضح قرآن' کے نام سے قرآن کا اُردو ترجمہ پیش کیا۔ شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی کی 'تفسیر مرادیہ' قرآن کے تیسویں پارے کی اُردو تفسیر ہے۔ اِس کے علاوہ اُس دور کی جن تصانیف کے متعلق طبع زاد ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے اُن میں بھی کم و بیش کسی مخصوص فارسی تصنیف کا لمس نمایاں ہے۔ اِن ترجموں اور تفسیروں سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ اُس دور میں لوگوں کا رجحان فارسی سے اُردو کی طرف منتقل ہو رہا تھا، بطورِ خاص عوامی رجحان۔ ترجموں سے بلاشبہ اُردو کو آگے بڑھنے اور اپنا راستہ بنانے کے لیے ایک سہارا ملا اور ساتھ ہی ساتھ اِس سے اُردو جاننے والوں،

فورٹ ولیم کالج کی نثری تصانیف ایک خاص مقصد کے ذیل میں تخلیق ہوئی تھیں۔ یہ مقصد تھا کہ انگریزوں کو اتنی اردو سکھا دی جائے جس سے کہ وہ عوام سے ہم کلام ہونے میں کوئی دقت نہ محسوس کریں۔ گویا فورٹ ولیم کالج کی اردو نثر عوامی لب و لہجے کی ترجمان کے طور پر تخلیق کی گئی۔

پڑھنے والوں کی معلومات میں کسی قدر اِضافہ بھی ہوا۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے شمالی ہند کی کچھ تصانیف اُردو نثر کے جدید طرز کی نمائندگی کرتی ہیں اور ان میں سے بعض تو جدید اردو نثر کے موجد کہے جانے والے اِدارے فورٹ ولیم کالج کی کچھ کتابوں سے بہتر نظر آتی ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو نثر کا پودا فورٹ ولیم کالج سے پہلے ہی جڑ پکڑ چکا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کا سربراہ جان گلکرسٹ، سوائے 'نوطرزِ مرصع' کے اس دَور کی کسی تصنیف سے واقف نہیں تھا۔ اُس نے اپنی رپورٹ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ؛

''ابھی ہندوستانی نثر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں ہے جو قدر و قیمت یا صحت کے اعتبار سے اِس قابل ہو کہ میں اپنے شاگردوں کو پڑھنے کے لیے دے سکوں۔ کسی ایسی جگہ سے شہد نکالنا میرے بس کی بات نہیں ہے جہاں مکھیوں کا کوئی چھتہ ہی نہ ہو۔''

(''گلکرسٹ اور اُس کا عہد'' از عتیق صدیقی، ص 150، انجمن ترقی اردو علی گڑھ)

چونکہ فورٹ ولیم کالج میں تصنیف و تالیف کا کام ایک منظم اور مربوط طریقے سے انجام دیا گیا، ایک خاص مقصد کے مدِ نظر تخلیقی عمل ہوا اور اِس ادارے کے سربراہ جان گلکرسٹ کے ہاتھ محض واحد تصنیف، عطا حسین تحسین کی 'نو طرزِ مرصع' لگی تھی، جو گلکرسٹ کے مطابق فورٹ ولیم کالج کے موافق مقصد نہ تھی۔ انھیں وجوہات سے لوگوں نے فورٹ ولیم کالج کے زیرِ سایہ تخلیق پانے والی تصانیف کو زیادہ توجہ دی اور انھیں اُردو نثر کے جدید طرز کی تخلیق کے طور پر قبول کرلیا۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے شمالی ہند میں تشکیل پانے والی نثری تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''ان سب نثری تصانیف کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اردو نثر میں یہ صلاحیت پیدا ہوچکی ہے کہ طویل تحریریں اور قصے بیان کرسکے۔ عجائب القصص کی نثر فورٹ ولیم کالج کے بیش تر مصنفوں سے بہتر ہے۔''

('تاریخ ادب اردو' از ڈاکٹر جمیل جالبی، اٹھارویں صدی، حصہ دوم، جلد دوم، ص986)

اسی ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی ایک دیگر مقام پر لکھتے ہیں؛

''عجائب القصص کی نثر دیکھ کر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اگر فورٹ ولیم کالج کا دبستانِ نثر قائم نہ ہوتا تو بھی بدلے ہوئے تہذیبی و سیاسی پس منظر میں اردو نثر کا ارتقا عجائب القصص کے انداز پر جاری رہتا۔''

('تاریخ ادب اردو' از ڈاکٹر جمیل جالبی، اٹھارویں صدی، حصہ دوم، جلد دوم، ص1115)

دہلی کے بادشاہ شاہ عالم ثانی نے 'عجائب القصص' داستان 93-1792 میں لکھی تھی اور فورٹ ولیم کالج 1800 میں قائم ہوا تھا، سات آٹھ برس کا وقفہ زبان و ادب کے طرزِ تعین میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے وجود میں آنے سے تقریباً دو تین دہائی قبل ایسی تصانیف تخلیق ہوچکی تھیں جن کی نثر کو ہم 'جدید اردو نثر کے اوّلین نمونے' کے طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کی نثری تصانیف ایک خاص مقصد کے ذیل میں تخلیق ہوئی تھیں۔ یہ مقصد تھا کہ انگریزوں کو اتنی اردو سکھا دی جائے جس سے کہ وہ عوام سے ہم کلام ہونے میں کوئی دقت نہ محسوس کریں۔ گویا فورٹ ولیم کالج کی اردو نثر عوامی لب و لہجے کی ترجمان کے طور پر تخلیق کی

گئی۔ غور طلب ہے کہ فورٹ ولیم کالج سے دہائیوں قبل تخلیق پانے والی تمام تر نثری تصانیف مثلاً 'نو آئین ہندی' 1788-89، 'کربل کتھا' 1747-48، 'تفسیر مرادیہ' 1771-72، ''موضح قرآن' 1790-91، 'قصہ و احوالِ روہیلہ' از سید رستم علی بجنوری 1774-81 وغیرہ کے مخاطب عوام تھے۔ اِن تصانیف کا مقصد عام آدمی تک اپنی بات کو پہنچانا تھا۔ دوسری طرف فورٹ ولیم کالج کی نثر کو بھی عوامی گفتگو سے سروکار تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی تحقیق کے زیر اثر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ''عجائب القصص کی نثر فورٹ ولیم کالج کے بیش تر مصنفوں سے بہتر ہے۔'' یعنی کہ 'عجائب القصص' سے کچھ قبل یا اس کے آس پاس تخلیق پانے والی نثر، فورٹ ولیم کالج کے کچھ مصنفوں کی نثر کے مدمقابل ہو سکتی ہے۔ ایسے میں فورٹ ولیم کالج کے ضمن میں مجموعی طور پر یہ کہنا کہ یہ ادارہ 'جدید اردو نثر' کی بنیاد رکھتا ہے، کسی بھی طرح درست نہیں۔ درحقیقت 'جدید اردو نثر' کی بنیاد تو اس ادارے سے کئی دہائی پہلے ہی داستانوی تصانیف کے ذیل میں پڑ چکی تھی۔ اگر جان گلکرسٹ کو اپنے طالب علموں کو اردو سکھانے کے لیے 'نو طرزِ مرصع' کی بجائے 'عجائب القصص' یا 'نو آئین ہندی' دستیاب ہوئی ہوتی تو شاید صورت کچھ اور ہی ہوتی۔ لہٰذا فورٹ ولیم کالج کو اردو نثر کے جدید طرز کی بنیاد ڈالنے والے ادارے کے طور پر دیکھنا مناسب نہیں۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے شمالی ہند میں وجود پانے والی نثری تصانیف کے سلسلے میں جو بات سب سے اہم و بنیادی حیثیت رکھتی ہے وہ ہے، اُس دور کی انقلابی صورتِ حال۔ وہ زمانہ خود میں ایک انتشار لیے ہوئے تھا۔ مدتوں سے چلا آرہا نظام بکھر رہا تھا۔ انگریزوں کی آمد نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا تھا۔ لوگوں میں ایک ڈر تھا کہ اب آگے کیا ہوگا۔ مستقبل کو لے کر ایک پس و پیش کی سی کیفیت تھی کہ آخر کار حاکم کون ہوگا؟ فتح کس کے ہاتھ لگے گی؟ حکومت کون کرے گا؟ ہمارے بادشاہ یا پھر انگریز۔ لوگوں کے اِسی ذہنی رویے نے داستان کے فن کو فروغ عطا کی۔ بے چینی کے عالم میں داستانوں سے سکون کی تلاش کی گئی اور نیند کے عمل کو آسان بنانے کی کوشش ہوئی۔ داستانوں میں ایک ایسی دنیا آباد کی گئی جو ان تمام تر چیزوں کو مہیا کراتی تھی جن کی غیر موجودگی سے آدمی کی عملی و ذاتی زندگی میں تشنگی تھی۔ آدمی اپنی محرومیوں کو خیالی اور تصوراتی طور پر اِن داستانوں کے ذریعے رد کر رہا تھا۔ داستانوں کے مواد، اُن کی افسانویت اور کہانی پن میں اس کی واضح نشاندہی ملتی ہے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے اب جو تبدیلی ہو رہی تھی اُس میں حالات ایک بنیادی وجہ ہے۔ اب لوگوں کے مزاج سے تکلف اور نزاکت رفتہ رفتہ کم ہو رہی تھی۔ لوگوں میں تصنع کی جگہ سیدھا پن آرہا تھا۔ معاشرتی، سیاسی اور معاشی تبدیلیوں نے ذہن کو الجھا دیا تھا۔ ایسے میں یہ فطری تھا کہ لوگ مرصع کاری اور تصنع کی پیچیدگی سے انحراف کریں۔ برجستہ لہجے میں سلیس الفاظ کے ساتھ اپنی بات کہنے کا عمل زور پکڑنے لگا۔ لہٰذا اس دور کی تصانیف میں بھی یہی مزاج اور یہی اندازِ گفتگو اختیار کرنے کی کوشش کی گئی۔ اب جو زبان رائج ہو رہی تھی اس میں فارسی کی دقت پسندی نہ تھی۔ عوامی بول چال اور روزمرہ تخلیقی پیش کش کا حصہ بن رہے تھے۔ اس زبان میں اردو پن نمایاں تھا۔ گویا اب زبانِ اردو اپنے پیروں پر چلنا چاہ رہی تھی اور فارسی کی انگلی چھوڑ رہی تھی۔ داستانوی تصانیف ہوں کہ مذہبی تصانیف زبان و بیان کا یہ معیار اور مزاج یکساں طور پر اُس دور کے نثری ادب میں پیش پیش ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے ضمن میں مجموعی طور پر یہ کہنا کہ یہ ادارہ 'جدید اردو نثر' کی بنیاد رکھتا ہے، کسی بھی طرح درست نہیں۔ درحقیقت 'جدید اردو نثر' کی بنیاد تو اس ادارے سے کئی دہائی پہلے ہی داستانوی تصانیف کے ذیل میں پڑ چکی تھی۔

اس طرح اردو نثر میں اسلوب کے دو دھارے پیدا ہو گئے۔ ایک تو پہلے سے ہی 'فارسی زدہ اردو نثر کا اسلوب' چلا آرہا تھا اور اب دوسرا 'عام فہم و سادہ اردو نثر کا اسلوب' قائم ہو گیا۔ آئندہ دور میں ان دونوں اسالیب نثر کے زیرِ اثر اردو کا دامن غیر معمولی طور پر وسیع ہوا۔ 'فارسی زدہ اردو نثر' نے اردو نثر کے مرصع اسلوب کی روش اختیار کر لی اور 'فسانۂ عجائب'، 'فسانۂ آزاد' جیسی تصانیف تخلیق ہوئیں۔ اس کے بعد بھی اس اسلوب کی پرورش ہوئی رہی اور لوگ اسے دلکشی، دلفریبی اور اردو کی شیرینی و رنگینی سے جوڑ کر دیکھتے رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ مزاجِ زمانہ کے مطابق اس میں مزید ترمیم و اضافے ہوئے اور اردو الفاظ و اردو لہجے کو برتری دیتے ہوئے اس اسلوب میں نثری کارنامے انجام دیے گئے۔ دوسرا 'عام فہم و سادہ اردو نثر کا اسلوب' نثر میں ایک نئے رواج کو جنم دیتا ہے۔ جہاں سادگی، سلاست، روانی اور برجستگی ہے۔ آئندہ دور میں اس اسلوب کو مزید اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اسے اردو کے بنیادی اسلوب کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ اس اسلوب نے اردو زبان میں ایک نئی قوت پیدا کی جس سے اُن مضامین کی بھی پیش کش اردو میں ہوئی جو اس کے پہلے اردو کے مزاج کے موافق نہ سمجھے جاتے تھے۔ اسی اسلوب نے اردو زبان میں معروضیت کی طاقت پیدا کی اور سائنسی مضامین کی تخلیق اردو میں آسان ہو گئی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس میں اردو کی نرمی نہیں ایک سختی ہے، 'عام فہم و سادہ' اسلوب میں نثر نگاروں نے ایک سے بڑھ کر ایک دلکش و شیریں، رواں دواں نثر تحریر کی۔ ہاں، بے ساختگی اور سدھا پن اِس اسلوب کا نمایاں وصف رہا۔

عام زبان میں اردو نثر لکھنے کا یہ رجحان اٹھارویں صدی عیسوی میں آہستہ آہستہ پروان چڑھتا ہے اور انیسویں صدی میں عام طور پر رائج ہو جاتا ہے۔ اٹھارویں صدی پرانے رجحانات کے ختم ہونے اور نئے رجحانات کی پیدائش کی صدی ہے۔ جو کچھ اس صدی میں ہوا اس کی واضح صورت انیسویں صدی میں نظر آتی ہے۔ آج جو اردو نثر ہمیں ملتی ہے وہ صدیوں کی کوشش اور جاں فشانی کا نتیجہ ہے، جس میں شمال اور دکن، مغرب اور مشرق کیا بین الاقوامی اثرات موجود ہیں، خواہ وہ مواد کے اعتبار سے ہوں یا اسلوب کے اعتبار سے۔ اردو کا سفر اپنی رفتار سے جاری ہے، دیکھیے آئندہ دور میں اس کی کیا صورت ہوتی ہے۔

کتابیات:

ادبی تنقید اور اسلوبیات: پروفیسر گوپی چند نارنگ
اسالیبِ نثر پر ایک نظر: مرتبہ ڈاکٹر ضیاء الدین
اردو کے نثری اسالیب: شہاب ظفر اعظمی
ادبی اسلوبیات: نصیر احمد خان
اردو کا ابتدائی زمانہ: شمس الرحمٰن فاروقی
اردو کی نثری داستانیں: پروفیسر گیان چند جین
اردو ادب کی تنقیدی تاریخ: سید احتشام حسین
اردو کے اسالیبِ بیان: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
اردو اسالیبِ نثر: تاریخ و تجزیہ: ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین
اردو نثر کے اسالیب: ڈاکٹر عبدالخالق
اسلوب: سید عابد علی عابد
نثر اور اندازِ نثر: ڈاکٹر سید حامد حسین
اردو نثر کی تعمیر و تشکیل: ڈاکٹر محمد سلیمان

■

Dr.Ehsan Hasan,107A, Javaharganj, Dharahariya, Allahabad-211002 (UP)

عبدالحق

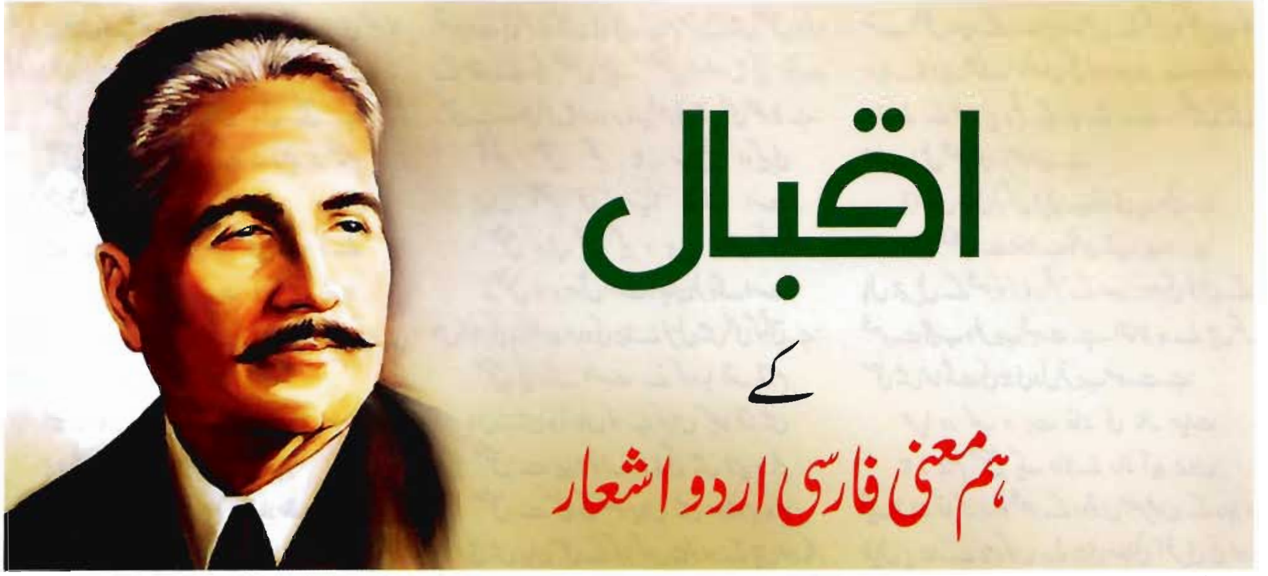

اقبال کے ہم معنی فارسی اردو اشعار

اگر لسانی معجزات کی فہرست بنائی جائے تو اس میں اقبال و غالب کا خوش گوار اضافہ ہوگا۔ ان کی فنی عظمتوں سے قطع نظر ان کا ذولسان ہونا، کسی تخلیقی اعجاز سے کم نہیں ہے۔ اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ فارسی دونوں کی مادری زبان نہیں ہے۔ اقبال کے لیے تو فارسی اردو دونوں غیر مادری ہیں۔ مگر انھیں دونوں زبانوں میں اظہار کی بے پناہ قوت حاصل ہے۔ ان دونوں کی شہرت کا مدار اردو پر ہے۔ اگر چہ دونوں نے فارسی کو ہی ترجیح دی ہے۔ غالب کے نزدیک۔ مجموعہ ٔاردو بے رنگ وفروتر اور فارسی شاعری کو پڑھنے کی تاکید ہے۔ ہاں کلیات میں ایک جگہ اردو کے عرضِ ہنر کا اعتراف ہے:

اے کہ میراثِ خوار من باشی
اندر اردو کہ آں زبانِ نیست

اقبال بھی گیسوئے اردو کو منت پذیر شانہ ہی سمجھتے رہے۔ وہ بھی زبورِ عجم پڑھنے کی تاکید کرتے ہیں۔ نواہائے راز کی ترجمانی کے لیے فارسی کو ترجیح دیتے رہے۔ اشعار وافکار کے اعتبار سے بھی دونوں کے یہاں فارسی کو بھر پور وزن اور وقعت حاصل ہے۔ فنی شان و شکوہ میں بھی وہ سربلند ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود ان کی فارسی شاعری کے اعتراف کے لیے ہمارا انتقادی شعور ابھی تک متحمل نہیں ہوسکا ہے۔ غالب کا فارسی کلام اردو سے تقریباً چھ گنا ضخیم ہے۔ یعنی گیارہ ہزار سے زائد اشعار کا گنجینۂ گراں بہا ہے۔ غالب نے اردو کلام کو انتخاب و اختصار کے عمل سے بھی گزارا ہے۔ اقبال نے بھی تقریباً چالیس فیصد اردو کلام کو متداول مجموعوں سے حذف کیا ہے۔ بڑے قلم کاروں کی تخلیقی نظر کی یہ نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ ان کے انتخابی شعور کی کارفرمائی سے پستی و بلندی کے معیار مقرر ہوتے رہے ہیں۔

دونوں دوزبان شاعر ہیں۔ خیال کا دونوں زبانوں میں دَر آنا ایک فطری عمل ہے۔ دونوں کے یہاں یہ صورت موجود ہے۔

موضوع اقبال سے متعلق ہے۔ اس پر تفصیل سے گفتگو مقصود ہے۔ سر دست کلام اقبال سے صرف ایک مثال پیش کر رہا ہوں۔ زبورِ عجم کی 48ویں غزل پہلے کہی گئی بعد میں کم وبیش وہی خیال بالِ جبریل میں دہرایا گیا ہے:

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دل بیقرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تاب دار را

بالِ جبریل کی تیسری غزل کا مطلع ملاحظہ ہو:

گیسوئے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

اقبال کی تخلیقات میں اور بھی مثالیں موجود ہیں۔ ان کی پیامی اور فکری شاعری میں اس اظہار یا ابلاغ کا منطقی اور قابلِ قبول جواز ہے۔ جب افکار کا ارتکاز یا وحدتِ فکر موجود ہو تو عربی و عجمی کے دل کشا وسیلوں میں فرق نہیں ہوتا۔ پھر بھی حیرت ہوتی ہے کہ وحدتِ افکار کے باوجود ترسیل و ترجمانی میں آہنگ کے انواع بہت مختلف ہیں۔ اسی لیے مطالعۂ اقبال میں دونوں زبانوں کی آگہی لازمی ہے۔

تفہیم غالب کے لیے یہ طریقِ نظر مستحسن ضرور ہے مگر ملزوم نہیں۔

اردو شاعری کی اساس اور امتیاز غزل گوئی کی مرہونِ نظر ہے۔ اس کی تخلیق و تشہیر میں دوسری تمام اصناف پس نوشت بن کر رہ گئی ہیں۔ دوسری شعری روایتوں کے ریشہ ہائے دل میں بھی اکثر اس کی روانی محسوس کی جاسکتی ہے۔ ایک مخصوص موضوع میں فن کاروں نے مضامینِ نو کی بے کراں وسعتوں کا جو اضافہ کیا ہے وہ تخلیق کا حیرت خیز کارنامہ ہے وہ بشری سرمایۂ سخن وری میں جتنی نایاب ہے۔ ایک ہی غزل گو کے فن میں خیال کی تکرار یا اعادہ بڑی مشکل سے ملتا ہے۔

اقبال کا معاملہ بہت مختلف ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ متعین موضوعات میں اظہار واسالیب کی بے کراں وسعت کے حامل ہیں۔ یہ عظیم فن کار کا ہی کارنامہ ہوسکتا ہے۔ مگر اقبال کو ایک عنوان کو سو سو طرح سے بیان کرنے کی ہنرمندی میں بڑی سبقت اور سہولت حاصل ہے۔ وہ دو زبان فن کار ہیں اور مخصوص فکر و فلسفہ کے موجد بھی ہیں۔ وہ معترف ہیں کہ سینے میں شمع نفس فروزاں ہے اور افکار کے ہجوم سے دوچار ہیں۔ اظہار کے اضطراب سے نبرد آزمائی نوشتۂ قلم بن چکی ہے۔ ان کے اسلوبِ بیان میں تنوع اور تکثیریت کی بے مثال صورتیں موجود ہیں۔ ایک خیال کی سیکڑوں شبیہیں متحرک پیکروں میں رہتی ہیں۔ ان کا اساسی خیال عرفانِ ذات یا خود کا احساسِ وجود ہے:

بینی جہاں را خود را نہ بینی
تا چند ناداں غافل نشینی

زبورِ عجم کی چھوٹی بحر کی اس غزل کا عکس و التفات اسی آہنگ میں 'بالِ جبریل' کی غزل میں دیکھیے:

کچھ قدر تونے اپنی نہ جانی
یہ بے سوادی یہ کم نگاہی

پوری غزل میں اسی خیال کی بازگشت ہے۔ 'پیامِ مشرق' کی غزل کا شعر ہے:

نشانِ راہ ز عقل ہزار حیلہ مپرس
بیا کہ عشق کمالے زیک فنی دارد

عقل و دل یا حسن وعشق کے محاسبے میں 'بالِ جبریل' کی

انتیسویں غزل کا یہ شعر بہت مقبول ہوا۔ مذکورہ فارسی شعر کا توارد اظہار کی تھوڑی تبدیلی کے ساتھ کتنا ہم خیال ہے:

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم

'پیامِ مشرق' کی غزل کا شعر ہے:

شبے بہ میکدہ خوش گفت پیر زندہ دلے
بہ ہر زمانہ خلیل است و آتش نمرود

اسلوب کے دوسرے لفظوں میں یہی خیال تلمیح کی دوسری مثال کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

'زبورِ عجم' کی چھیالیسویں غزل کا مطلع ملاحظہ ہو:

ز رسم و راہِ شریعت نکردہ ام تحقیق
جز اینکہ منکرِ عشق است کا فر و زندیق

اب 'بالِ جبریل' کی اسی ردیف کی غزل کے مقطع پر توجہ فرمائیں تو مضمون کے متحد ہونے یا مصدر کا سراغ آسان ہوگا:

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

موضوع اور اسلوب کے مناسبات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ فارسی اور اردو میں 'زبورِ عجم' اور 'بالِ جبریل' کی غزل تکرارِ خیال کے لیے بارِ ثبوت کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔ لفظیات کا استعمال بھی یگانگت کی واضح دلیل ہے۔ تحقیق، زندیق، توفیق، طریق، تصدیق، دقیق دونوں غزلوں کے قافیہ میں مشترک ہیں۔ قافیہ میں اردو میں عتیق وخلیق اور فارسی میں عقیق بدلا ہوا ہے۔ ترکیبوں کے اشتراک میں بھی بڑی قربت ہے۔ جیسے کافر و زندیق، نکتہ ہائے دقیق، خدائے بے توفیق وغیرہ سب ایک ہی سرچشمے سے سیراب ہیں۔ ہاں قافیے کی مجبوری نے بھی اشتراکِ تخلیق کو فروغ دیا ہے۔ اس اشتراک میں ایک اور انوکھی مثال بھی قابلِ ذکر ہے۔ 'زبورِ عجم' کی ایک غزل ہے جسے بہ سہولت ہم نظم کا عنوان دے سکتے ہیں اور 'بالِ جبریل' کی نظم 'لالۂ صحرا سے ہم آغوش کر سکتے ہیں۔ دونوں حوالوں کی مشترک ترکیبوں اور لفظوں میں کافی یگانگت ہے۔ مثلاً گنبدِ مینائی، پہنائی و پیرائی 'لالۂ صحرائی' یکتائی، وغیرہ۔ حیرت ہے کہ غزل اور نظم کے آہنگ میں ارتباط ہے۔ مگر اندازِ پیش کش جداگانہ ہے۔ آہنگ اور اساسی خیال میں بہت حد تک مناسبت ہے۔ فکری روش کو بھی دخل ہے۔ تفکیری تربیت سے نگارش کے ہزاروں چشموں کا، رواں ہونا کسب و کمال کی انتہا ہے۔ چونکہ غزلوں پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ اس لیے نظموں میں موجود تصورات کی تکرار نہیں کی گئی۔ 'پیام مشرق' میں عشق وخرد کے مقدمات کی کشمکش ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہی تنوع اردو سرمایہ شعری میں بھی محفوظ ہے:

بچشم عشق نگر تا سراغِ اوگیری
جہاں بچشم خرد سیمیاؤ نیرنگ است
زعشقِ درسِ عمل گیر و ہرچہ خواہی کُن
کہ عشقَ جوہر ہوش است و جانِ فرہنگ است

اس آواز کی بازگشت اردو کی مینائے غزل میں بھی گونجتی ہے:

عشق کی اک جست نے کردیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں
عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دم بدم

شاعری میں بیانِ معنی کے گونا گوں پہلو ہوتے ہیں اور پھر مستعمل الفاظ کی مستزاد یا مترادف صورتیں بھی شعر کی صناعی کو دلآویزی سے ہم کنار کرتی ہیں۔ معانی کو وسیع تر مفہوم میں ادا کیا جاتا ہے اور الفاظ کا جہانِ دیگر بھی تشکیل پاتا ہے۔ کبھی کبھی معنی کے اشتراک کا دھوکا بھی ہوتا ہے۔ اس لیے روحِ معانی کا ادراک ناگزیر بن جاتا ہے۔ معنی کی تہہ در تہہ بوقلموں صورتیں قاری کو مغالطوں سے دوچار کرتی رہتی ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ تخلیق کار جو کہنا چاہتا ہے وہ من وعن الفاظ کے پیکروں میں ادا ہوگیا ہو۔ خیال کی صحیح ادائگی کے لیے لغت ولسان کی کم مائگی کا شکوہ بھی سننے میں آتا ہے۔ خاص طور پر عظیم فن کاروں کے یہاں معنی کے پیکر پر جامۂ حرف کا تنگ ہونا اظہار کی نارسائی بن جاتی ہے۔ شاید اسی سبب تعبیر و تشریح کا تعاون درکار ہوتا ہے۔ جو معنی کی راز جوئی میں رہبری کرتا ہے۔ اقبال نے ارتباطِ لفظ و معنی کو ارتباطِ جان وتن کی تشبیہ میں فکر افروز بات کہی ہے۔

اقبال کا معاملہ بہت مختلف ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ متعین موضوعات میں اظہار و اسالیب کی بے کراں وسعت کے حامل ہیں۔ یہ عظیم فن کار کا ہی کارنامہ ہوسکتا ہے۔ مگر اقبال کو ایک عنوان کو سو سو طرح سے بیان کرنے کی ہرمندی میں بڑی سبقت اور سہولت حاصل ہے۔ وہ دو زبان فن کار ہیں اور مخصوص فکر و فلسفہ کے موجد بھی ہیں۔

اقبال کے بہت سے اشعار زبان زد ہی نہیں ضرب المثل بن گئے۔ عام و خاص نے تحریر و تقریب کا سرنامہ بنا دیا۔ مختلف موقعوں کی مناسبت سے وہ اشعار حوالے کے طور پر رقم کیے جاتے رہے۔ انھیں میں حسبِ ذیل شعر بھی سرعنوان ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بال جبریل کے شعر کو 'زبورِ عجم' کے حصۂ دوم کی غزل کے شعر سے عجیب وغریب نسبت ہے۔ الفاظ بدلے ہیں مگر معنی میں مماثلت کی بڑی دل فریب صورت ہے:

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالہ حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

ایک زمانہ تھا کہ اردو شعر کے دونوں مصرعوں کے ربط و خیال پر ہمارے بزرگوں نے بڑی معانی آفرینی کی اور تنقید کی تعبیرات کی قابلِ قدر بحثیں سامنے آئیں۔ اسی طرح بالِ جبریل کے حرفِ شیریں پر بھی کئی مقالے لکھے گئے۔ اقبال نے لکھا ہے کہ انھوں نے ضمیر کائنات میں طرحِ نو ڈالی ہے۔ نیامندوں کی تعبیر و تازگی سے جہانِ آب وگل کا شعور سرشار ہوتا رہے گا۔ اقبال کے کئی شعر مباحثوں میں زیرِ غور رہے۔ معانی ومفہوم کے تعین میں متن کی بخیہ گری بھی کی گئی۔ دُراز کار خیالات نے کہیں کہیں اسے چیستاں بھی بنایا۔ ایسے اشعار کی دریابی کے لیے ان کے افکار کی بازخوانی ضروری ہے اور اس عمل میں فارسی کلام کے ساتھ ان کی نثری تحریروں سے بھی تعاون حاصل کرنا ہوگا۔ کیوں کہ ان کے تمام خیالات کا احاطہ صرف شاعری کی مدد سے ممکن ہیں ہے۔ بعض فکری معاملات نثر میں ظاہر ہوسکے ہیں۔ اقبال کا جزوی مطالعہ ناموزوں ہی نہیں بلکہ گمراہ کن بھی ہے فکری تفہیم و تعبیر کے لیے مجموعی تصورات کا ارتکاز ضروری ہے۔ ان کا مرکزی نقطہ خودی اور بے خودی ہے۔ مگر اس کے زاویے تکثیریت کے ساتھ تحریروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اظہار کے لیے افکار حرف وصوت کے تابع ہوتے ہیں اور حرف و صوت تحریر و تصویر کے شیوہائے صد رنگ میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ اقبال نے اپنی بصیرت کے انکشاف میں پہلی بار اقرار کیا تھا 'اسرارِ خودی' کے تمہیدی اشعار قارئین سے خاص مطالعے کا مطالبہ کرتے ہیں:

خاکِ من روشن تر از جامِ جم است
محرم از ناز ادہای عالم است
حسن اندازِ بیاں از من مجو
خو انسارو اصفہاں از من مجو

'اسرار' کی ابتدا 'بال جبریل' کی انتہا پر انجام پاتی ہے:

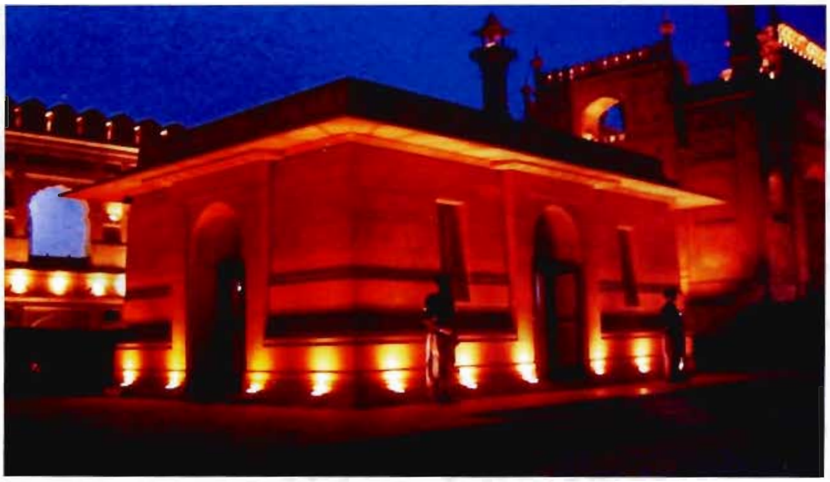

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

'زبورِعجم' کی غزل کا شعر ہے:

اقبال قباپوشد درکارِ جہاں پوشد
دریاب کہ درویشی با دلق و کلاہے نیست

پیامِ مشرق میں ہے:

نہ شیخِ شہر، نہ شاعر، نہ خرقہ پوش اقبال
فقیرِ راہ نشین است و دل غنی دارد

پیامِ مشرق کا مقطع ہے:

بیا بہ مجلسِ اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

خوش آگئی ہے جہاں کی قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی
بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی

تخلیقی مطالعے کے لیے اقبال نے کچھ ابدی حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک طرف وہ معنی کی دریابی یا تہہ تک رسائی کے لیے فن کار کے اندرونِ دل اترنے کا عمل ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس عمل کے بغیر تعبیر وتنقید سعی لاحاصل ہوگی۔ 'اک بار بدل در شوٗ' کا کلام کرتے ہیں اس امر وعمل میں نغمۂ دل افروز کی دریافت علم وخرد سے نہیں ہوتی بلکہ دلِ وجود کو چیرنے والی نگاہِ تیز درکار ہے کیونکہ معنی کی ساخت پر جامۂ سخن ہمیشہ تنگ وتار ہوتا ہے:

نگاہ می رسد از نغمہ دل افروزے
بمعنئ کہ بروجامۂ سخن تنگ است

اس بے بسی کا ذکر کس بے باکی کے ساتھ نظم ساقی نامہ میں موجود ہے:

حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ
حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ
فروزاں ہے سینے میں شمعِ نفس
مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس

مرا ایں خاکدانِ من ز فردوسِ بریں خوشتر
مقامِ ذوق وشوق است ایں، حریم سوز وساز است ایں

برائے نام تغیر کے ساتھ اساسی فکر کے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے:

یہیں بہشت بھی ہے، حور و جبرئیل بھی ہے
تری نگہ میں ابھی شوخیِ نظارہ نہیں

اقبال کے حسبِ ذیل شعر بہت مشہور اور مستعمل ہے:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

زبورِعجم کی غزل میں کم وبیش اسی تصور کا اعادہ نظر آتا ہے:

فروغِ آدمِ خاکی ز تازہ کاری ہاست
مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند

فکرِ اقبال میں ایک نقلابی تصور یہ ہے کہ اگر زمانہ تمھارا ساتھ نہ دے تو زمانے کو ہی بدل دو اور اسے شکست دو کہ وہ تمھارے خلاف چلنے کی ہمت نہ کرسکے۔ تم اس کے رنگ میں اپنی شناخت گم نہ کرکے اس پر غالب ہو۔ اگر وہ تمھارے لیے سازگار نہ ہو تو اُسے اپنے لیے سازگار بنالو۔ زبورِعجم کا شعر ہے:

گفتند کہ جہانِ ما آیا بتونمی سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

اردو میں اس خیال کی بازگشت اس طرح گونجتی ہے:

حدیثِ بے خبراں ہے کہ با زمانہ بساز
زمانہ با تو سازد تو با زمانہ ستیز

زبورِعجم کا شعر ہے:

گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمن ماست
کہ ہر ستارہ جہان است و جہاں بوداست

بالِ جبریل کی غزل کا یہ شعر خاص وعام کی زبان پر اس طرح جاری ہے کہ وہ گفتگو کا شعری محاورہ بن گیا ہے۔ وہ حقیقت اقبال کے اشعار سے تقریباً پون صدی پہلے ظاہر ہوئی تھی جسے ہم آج انسانی یافت کی سب سے بڑی منزل سمجھتے ہیں:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اقبال نے تاروں سے آگے کی منزل کا بھی پتہ دیا ہے۔ دیکھیے اس پیش گوئی تک رسائی کب حاصل ہوتی ہے۔ چرخِ نیل فام سے آگے منزلِ مراد کو اقبال نے نشان زد کیا ہے اور تاروں کو سنگِ نشاں بتایا ہے۔ بلکہ ستاروں کے جہاں کو فرسودہ کہہ کر نئی دنیا کی طلب کا اضطراب اقبال کی زبان سے سنیے:

پرانے ہیں ستارے اور فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز

اس پیغام کی دوسری آواز ہے کہ عالمِ شش جہت کی پیرانہ سالی سے طبیعت مکدر ہوچکی ہے۔ مشرق ومغرب یا شمال و جنوب سب کہنہ ہوچکے ہیں۔ اس لیے انھیں بدل دو۔ فارسی میں اس عنوان کی ترجمانی اس طرح کی گئی ہے۔

مغرب ز تو بے گانہ مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقش دگر انگیزی

اقبال نے پورب وپچھم کے تصور کو چکوروں کی دنیا کہہ کر حدود وقیود سے گریز کیا ہے۔ زمان ومکاں کو انسان کی شوخیِ افکار کا زائیدہ بتایا ہے:

چہ زماں و چہ مکاں شوخیِ افکارِ من است

ستاروں سے پرے لامکاں کو خاطر نشاں رکھنے کی تاکید ہے۔ انسان کے مقام ومرتبے کو لامکاں سے دور نہیں کہہ کر اس منزل کا تعین کیا ہے۔

تو اے اسیر مکاں لامکاں سے دور نہیں۔ سحر وشام کے شمار سے بے نیاز ہونے کی ضرورت ہے۔ میزانِ حیات کا اعتبار سعیِ پیہم سے مقرر ہوتا ہے۔ ماہ وسال کی گنتی سے نہیں۔ سعیِ پیہم کی نوائے شوق سے دیروحرم سے بہت دور حریمِ ذات اور بت کدۂ صفات میں بھی ہنگامہ برپا کرنے کی تاکید کی ہے۔ 'بالِ جبریل' کی پہلی غزل آپ کی نگاہ میں ہے:

حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

اب فارسی شعر ملاحظہ ہو:

بضمیرم آں چناں کن کہ ز شعلۂ نوائے
دلِ خاکیاں فروزم دلِ نوریاں گدازم

■

Prof. Abdul Haque, Professor Emeritus Urdu Dept., University of Delhi, Delhi - 110007

فارسی کے نامور ہندو شعرا و مورخین

عبدالقادر

زباں دانِ محبت بودہ ام دیگر نمی دانم
ہمی دانم کہ گوش از دوست پیغامی شنید اینجا
(شیخ علی حزیں)

ہندوستان میں فارسی زبان وادب کو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھائیوں نے بھی اپنے دل وجگر میں جگہ دی جس کی وجہ سے اس زبان کو خاطر خواہ ترقی نصیب ہوئی۔ جلال الدین محمد اکبر کے دورِ حکومت میں کئی شہرت یافتہ ہندوؤں نے فارسی زبان کی اشاعت اور فروغ میں نمایاں کارنامے انجام دیے جو قابل فخر ہیں۔ سرفہرست اس ضمن میں مشہور راجہ ٹوڈرمل کا اسم گرامی سب سے پہلے آتا ہے۔ آپ نے فارسی زبان و ادب کی ترقی و پیش رفت میں کئی اہم کام کیے۔ ہندوؤں کو فارسی زبان پڑھنے کی ترغیب دی۔ اس زبان کی اہمیت کو واضح کیا جس کی بدولت بہت سے ہندو اہل قلم اور شعرا وجود میں آئے۔ مآثر الامرا کے مصنف نے لکھا ہے کہ ٹوڈرمل لاہور میں پیدا ہوئے لیکن مکمل تحقیق سے یہ بات واضح ہوئی کہ آپ لاہرپور میں متولد ہوئے۔ بادشاہ اکبر نے اپنے 18 سنہ جلوس میں انھیں ایک خاص عہدہ دیا تھا اور اس کے بعد 24 جلوس اکبری میں وہ وزارت کے بلند عہدے پر فائز ہوئے۔ تذکرۂ خوش نویساں کے مصنف نے مزید لکھا ہے:

''ٹوڈرمل از طائفہ کھتری نویسندۂ چابک دست د خطوط بہ خوش خطی و نمکی می نوشت۔ بہ وسیلۂ مظفر خان برتبۂ وزارت اکبری رسیدہ۔''

منشی سجان رائے شہرۂ آفاق مصنف خلاصۃ التواریخ کے خیالات سے یہ بات اور بھی عیاں ہو جاتی ہے۔ ذیل میں عبارت نقل کرتا ہوں:

''دردقائق سیاق وحقائق حساب بے نظیر در علم محاسبات موشگاف، ضوابط وقوانین وزارت وتنظیم احکام سلطنت و بندوبست امور مملکت وآبادی ومعموری رعیت و دستور العمل، کارہائے دیوانی وقانون اخذ حقوق سلطانی و افزونی خزانہ وانسیت مسالک وتادیب سرکشان وتسخیر ممالک ودستور مناصب امرا ومواجب سپاہ دوامی پرگنات وتنخواہ وجاگیر از دیار گاراست۔''

ٹوڈرمل کے تدبر، اس کی جرأت اور عقل ودانشمندی کی تعریف ابوالفضل نے بڑی بے باکی سے کی ہے۔ یہ بات جگ ظاہر ہے کہ آپ نے فارسی زبان میں 'خازن اسرار' اور 'ٹوڈرانند' نام کی کتابیں لکھی تھیں۔ ٹوڈرمل نے 'بھگوت پران' کا ترجمہ سنسکرت سے فارسی زبان میں کیا تھا اور آپ نے ایک 'رسالہ حساب' بھی لکھا تھا جو بڑی شہرت کا حامل ہے۔

دورِ مغلیہ کے دوسرے بڑے فارسی داں 'مرزا منوہر توسنی' تھے۔ آپ فارسی کے شاعر تھے اسلامی تخیلات آپ کے افکار میں نمایاں ہیں۔ ان کی زبان شستہ، صاف اور واضح ہے۔ یہ بات مشہور ہے کہ آپ ہندوؤں میں پہلے فارسی شاعر تھے اور آپ کا نام رائے محمد منوہر توسنی تھا۔

عبدالقادر بدایونی رقم طراز ہیں:

''منوہر نام دارد۔ ولد لون کرن راجۂ سانبھر است کہ در نمک زار مشہور است واین ہمۂ نمک در سخن او تاثیر این سرزمین است۔ صاحب حسن غریب د ذہن عجیب است۔ اوّل او را بہ منوہری خوانند و بعد از ان میرزا منوہر خطاب یافت د پدرش باوجود کفر بہ شرف وافتخار ومباہات ہمیں محمد منوہر می گفت۔ ہر چہ مرضی طبع بادشاہی نبود طبع نظمی دارد از وست:''

شیخ مستغنی بہ دین و برہمن مغرور کفر
مست حسن دوست را با کفر و ایماں کار نیست
توسنی بردہ سمند شوق در میدان عشق
می رسی ایمن بہ مقصد رہبرت چون اکبر است

طبقات اکبری میں مرقوم ہے:

''رائے منوہر بن لون کرن از صغرسن در حجرۂ شفقت حضرت الٰہی (اکبر) نشو ونما یافتہ، در خدمت شہزادہ کامگار سلطان سلیم بزرگ شدہ، در خطوط سواد پیدا کردہ، سلیقۂ شعر بہم رسانیدہ می گوید۔''

جہانگیر بادشاہ نے 'تزک جہانگیری' میں مزید لکھا ہے:

''منوہر کہ از قوم کچواہیان سیکھاوت است و پدر من در خرد سال بہ او عنایت بسیار می کردند، فارسی زبان بودہ..... وشعر فارسی می گوید، این بیت از وست:

غرض زخلقت سایہ ہمیں بود کہ کسے
بنور حضرت خورشید پائے خود نہ نہد''

منوہر توسنی کی ایک فارسی مثنوی کا ذکر بھی کئی جگہ تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔ مخزن الغرائب میں ان کی مثنوی کے یہ چند اشعار موجود ہیں:

الٰہی سینہ کن با عشق دمساز
دلے دہ معدن گنجینہ زار
بہ دل داغ محبت جاو دان دہ
نشان مہر خود، بروَرق جان دہ
امید من زتو انعام عام است
کہ نومیدی ز در گاہت حرام ست
نمی دانم خدایا، کفر و دیں چیست
گرفتار این و آن کیست

یہی نہیں موصوف نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مدح میں اشعار لکھے ہیں۔ ذیل میں ان کے دو شعر پر اکتفا کیا جاتا ہے:

علیؑ برگزیدۂ لطف الٰہ است
بہ محشر مہر باں راعذر خواہ است
نہ گنجد و صف حیدرؓ در بیان ہا
بود در منقبت قاصر زبانہا

مرزا منوہر توسنی کی تعریف میں صاحب نثر کے ذیل میں الفاظ قابل رشک ہیں:

''فکر شعر بہ روانی وسلاست می فرمود۔ او اوّل از شعرائے ہنود است کہ نامش تا ایران زمین رسید۔ میرزا صائب مرحوم از کلام او این بیت را کہ می آید، پسندیدہ داخل بیاض خود نمودہ۔ باوجود ظلمت سرشتی خود را محمد منوہری نامند..... از آں خوش مقال است۔''

از اثر یک نگہ اوست مست
ہم بت وہم بتکدہ، ہم بت پرست

زاہدا کعبہ پرستی تو و ما دوست پرست
تو باپن عقل نی و من برہمنم

فارسی زبان کے صاحب دیوان شاعروں میں چندر بھان برہمن ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ آپ دھرم داس کے بیٹے تھے اور وطن لاہور تھا۔ شاہجہانی دور میں آپ افضل خاں کے منشی تھے۔ آپ کی تصنیف 'چہار چمن' کی بہت شہرت ہے۔ اس میں بادشاہ شاہجہاں کے متعلق اہم معلومات بھی ہیں اور آخر میں چند خطوط!

چندر بھان برہمن کے ذیل کے شعر خاصی شہرت رکھتے ہیں:

این ہمہ عالم فانیست، در و زندہ یکیست
نقش بسیار ولی صورت پایندہ یکیست

1073ھ مطابق 1653 عیسوی میں چندر بھان برہمن نے وارانسی میں انتقال کیا۔ ان کے خطوط کا مجموعہ 'منشآت برہمن' ہے۔ چندر بھان برہمن نے اردو میں بھی شعر کہے جنھیں ابتدائی اردو شاعری کے نمونوں میں جگہ دی جاتی ہے۔ مثلاً:

خدا نے کس جگہ جانے ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ ساقی ہے نہ بادہ ہے نہ ساغر ہے نہ پیالا ہے

منشی ہیرامن ولد گردھر داس معتمد خان بخشی کے منشی تھے۔ انھوں نے 'گوالیارنامہ' نام کی کتاب لکھی، جس میں گوالیار کی تعمیر و ترقی اور معتمد خاں کی گورنری کا ذکر ہے۔

ایشور داس ناگر نے 'فتوحات غوری' نام کی کتاب فارسی زبان میں لکھی۔ اس میں مالوہ اور راجپوتانہ کے احوال ملتے ہیں۔

بندرابن داس بہادر شاہی بھی عہد مغلیہ میں خاصی اہمیت رکھتے تھے۔ انھوں نے فن تاریخ میں 'لب التواریخ ہند' نام کی کتاب لکھی۔ یہ داراشکوہ کا 'دیوان گل' ہے۔ اورنگ زیب بادشاہ نے انھیں 'رائے' کا خطاب دیا تھا۔ اس کتاب کی تاریخی اہمیت ہے۔ اس میں محمد غوری سے 1101ھ تک کے احوال ملتے ہیں۔

فارسی زبان کی خدمت میں ایک نمایاں نام سجان رائے بٹالوی ہے۔ وہ برادری سے کھتری تھے۔ انھوں نے 'خلاصۃ المکاتیب' فارسی زبان میں لکھی۔ یہ اپنے وقت کی مشہور کتاب ہے۔ آپ 1110ھ میں شاہی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

بھیم سین پسر رگھونندن داس 1059ھ میں برہان پور میں پیدا ہوئے۔ 'تاریخ دلکشا' آپ کی مشہور کتاب ہے۔ اس میں اورنگ زیب کے عہد سے شاہ عالم تک کی تاریخ ملتی ہے۔ نرائن کول عاجز بھی فارسی زبان کے عاشق تھے۔ انھوں نے عارف خان صوبہ دار کشمیر کی حسب فرمائش 1122A.D. میں 'تاریخ کشمیر' نام سے کتاب تحریر کی جسے عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی۔

تذکرہ نگاری میں فارسی زبان میں لمبی فہرست ہے لیکن آنند رام مخلص کا تذکرہ بہت شہرت رکھتا ہے۔ اس میں نادر شاہ کے حملے اور اس سے منسلک واقعات معلوم ہوتے ہیں۔ یہ اپنے دور کی ایک اہم تصنیف ہے، جس سے اس عہد کے معاشرتی احوال واضح ہوتے ہیں۔ 'فرمان روایان ہنود' نام کی کتاب رائے امر سنگھ خوشدل نے لکھی ہے۔ اس کتاب میں ہندو راجاؤں کی تاریخ ہے۔ انھوں نے 'بزم خیال' نام کی ایک کتاب انگریزوں کی تاریخ میں لکھی۔ یہ کتاب بہت مشہور ہے۔ عہد محمد شاہی میں خوشحال چند دیوانی دفتر کے منشی تھے۔

راجه ٹوڈر مل

آپ نے 'تاریخ محمد شاہی' لکھ کر بہت شہرت پائی۔ اس کتاب میں مصنفوں کے احوال بہت تفصیل سے ملتے ہیں۔ ہندوؤں میں لچھمی نرائن شفیق بھی فارسی ادب میں بلند شہرت رکھتے ہیں۔ آپ کے والد رائے منشا رام تھے۔ وہ نظام الملک آصف جاہ کے دور حکومت میں صوبے کے پیشکار تھے۔ انھوں نے 'آثر نظامی' نام کی کتاب لکھی۔ شفیق کی پیدائش 1158ھ مطابق 1738 میں ہوئی۔ مولانا آزاد بلگرامی آپ کے استاد تھے اور آپ نے ہی انھیں شفیق کا تخلص عطا کیا۔ پہلے ان کا تخلص 'صاحب' تھا۔ قدرت نے شفیق کو فارسی کا صاحب دیوان شاعر بنا دیا۔ انھیں زبان و بیان پر مکمل عبور حاصل تھا۔ ان کے تذکرے 'گل رعنا' اور 'شام غریباں' دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔ تحقیقی مقالہ نگاروں کے لیے یہ کتاب ایک سند ہے۔ آپ کبھی کبھی اردو میں بھی اشعار کہتے تھے۔ اپنے استاد آزاد بلگرامی کی مدح میں موصوف کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

سرو ہر دو جہاں آزاد ہے — والی کون و مکاں آزاد ہے
مرکز ادوار چرخ چنبری — قطب الاقطاب زماں آزاد ہے

تذکرہ نگاری میں اہم نام بندرابن داس خوشگو کا ہے۔ انھوں نے فارسی زبان میں 'سفینۂ خوشگو' لکھا۔ آپ خان آرزو کے شاگرد تھے۔ اس کا قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں دستیاب ہے۔ اسے پہلی بار پروفیسر عطاء الرحمٰن عطا کاکوی سابق صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ نے شائع کیا۔ بھگوان داس ہندی کا شمار شہرت یافتہ تذکرہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ آپ نے 'سفینۂ ہندی' کا تذکرہ فارسی زبان میں کیا۔

اس زبان میں قدرت رکھنے والوں نے بادشاہوں کے درباروں میں بڑے بڑے عہدے پائے۔ ان میں گل کشور ثروت سیالکوٹی مل وارستہ، منشی ٹیک چند بہار اور سرب سنگھ دیوانہ قابل ذکر ہیں۔ گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور بھی اس زبان کے دلدادہ تھے۔ اس زبان سے قربت کا اندازہ ان کے اس عمل سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے پوجا گھر کے گھنٹے پر حافظ شیرازی کے اس شعر کو کندہ کرایا جو انھیں بہت مرغوب تھا۔ ذیل میں وہ شعر نقل کرتا ہوں:

مرا در منز جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم
جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محمل ہا

شانتی نکیتن پچھم بنگال کے عجائب خانے میں وہ گھنٹہ آج بھی موجود ہے۔ عہد حاضر میں بھی کئی شخصیتیں اس راہ پر مائل ہیں لیکن مالک رام اور امرت لال عشرت نے فارسی دنیا میں جو مقام حاصل کیا وہ بہت مشکل سے ملے گی۔ فارسی زبان و ادب پر امرت لال عشرت نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ آپ بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس (یوپی) میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ موصوف کے شاگردوں کی بہت طویل فہرست ہے۔

آخر میں شیخ سعدی شیرازی کے اس شعر پر مقالے کو مختصر کرتا ہوں جس میں شاعر بزرگ نے واضح لفظوں میں اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ تمام انسانی مخلوقات حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور ایک دوسرے انسان کی طرح ان کے اعضا ہیں کیونکہ سبھوں کی پیدائش ایک ہی گوہر سے ہوئی ہے۔ اس لیے تمام لوگوں کو آپس میں مل جل کر زندگی گزارنی چاہیے۔

بنی آدمؑ اعضای یک دیگرند
کہ در آفرینش زیک گوہرند

■

Dr. Abdul Qadir, Lecturer Farsi, GI College, Allahabad (UP)

عابد سہیل

حیات اللہ انصاری

ایک ہمہ جہت شخصیت

حیات اللہ انصاری تین حیثیتوں سے خاص طور سے جانے جاتے ہیں... صحافی، ادیب اور اردو کے عاشق۔ ان میں سے اردو صحافت اور اردو ادب کو ان کی دین کے بارے میں خاصا لکھا جاچکا ہے، رہی اردو کے فروغ کے لیے ان کی کوششیں اور جدو جہد تو وہ تاریخ کا حصّہ بن چکی ہے۔ لیکن دو باتوں کا ذکر ذرا کم ہوا، ایک تو یہ کہ صدر جمہوریہ کو محضر کی حمایت میں ساڑھے اکیس لاکھ دستخط پیش کیے گئے تھے، اس دعوے کے ساتھ کہ جس دستخط کنندہ کو کہیے آپ کے سامنے بہ نفس نفیس پیش کردیا جائے اور دوسری یہ کہ لکھنؤ کے گنگا پرشاد میموریل ہال کے کنونشن میں ان پر چاقو سے حملہ کیا گیا تھا۔ اب تیسری بات کا اضافہ میں کردوں، اس حملے کا ذکر وہ کبھی نہ کرتے۔

لیکن وہ ان سب کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھے جس کا بیشتر حصہ نظروں سے اوجھل ہے یا اس سے کم ہی لوگ واقف ہیں۔ یہاں کوشش یہ ہوگی کہ زندگی کے طویل 87 برسوں کی ان کی کہانی کے صرف ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے، جن میں 'شنیدہ' نے دیدہ، نہیں تو 'مثل دیدہ' یا اس سے بس ذرا سے کم کی صورت اختیار کرلی ہو۔

البتہ 'نیچا نگر' کا معاملہ مختلف ہے کہ یہ ایک بار کا کھیل تھا اس لیے کیوں نہ اسے شروع ہی میں نپٹاتے چلیں۔

'نیچا نگر' حیات اللہ انصاری کی پہلی اور آخری فلم تھی۔ ہ پہلی ہندوستانی فلم تھی جسے کوئی بین اقوامی انعام ملا تھا۔ کانس فلم فیسٹول کا انعام۔

اس فلم میں کئی اور باتیں پہلی بار ہوئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ 'نیچا نگر' چیتن آنند کی نہ صرف پہلی فلم تھی بلکہ آخری بھی۔ اداکارہ کے طور پر کامنی کوشل اسی فلم میں متعارف ہوئی تھیں، روی شنکر پہلی بار اسی فلم میں بطور میوزک ڈائرکٹر متعارف ہوئے تھے اور زہرہ سہگل نے پہلی بار بطور اداکارہ اور ڈانس ڈائرکٹر اسی فلم میں کام کیا تھا۔ تاریخی حیثیت تو فلم کی مستحکم ہوہی گئی، لیکن آپ فلم بھی دیکھنا چاہیں تو ڈائرکٹر صادق سے رجوع کریں۔

اب ایک اچٹتی سی نظر ڈال لی جائے ان 87 برسوں پر جن میں یکم مئی 1911 سے 18 فروری 1999 تک کا شاید ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا جس میں حیات اللہ انصاری نے کچھ نہ کچھ سیکھا نہ ہو، کچھ نہ کچھ کیا نہ ہو، چاہے یہ خود کو، اپنے تصورات کو، مسترد کرنا ہی کیوں نہ ہو۔ زندگی ہی انھیں ایسی ملی تھی، حالات ہی ایسے تھے۔

پیدائش ہوئی نہنال میں جو فرنگی محل میں تھی، ابھی چار سال ہی کے تھے کہ ماں کا انتقال ہوگیا۔ ان کی صورت انھیں شاید ہی کچھ کچھ یاد رہی ہو۔ والد، مولوی وحید اللہ، راجہ گونڈہ کی ریاست میں ملازم تھے۔ حیات اللہ ابھی آٹھ ہی سال کے تھے کہ وہ بھی نہ رہے۔

نہنال دو تھیں، ایک سگی، دوسری سوتیلی، ایک مفلس ایک خوشحال۔ سگی سوتیلی کا کتنا اثر پڑا یہ راز وہ اپنے ساتھ لے گئے، لیکن مفلسی اور خوشحالی کا فرق بلکہ تضاد ان کی زندگی، کہانیوں اور ناولوں اور سیاسی فکر میں رچ بس گیا، کہیں ایک دوسرے کے لیے شمشیر بکف اور کہیں شیر وشکر۔

حیات اللہ صاحب کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنا بھی مشکل تھا کہ وہ سولہ برس کی عمر میں 'درس نظامی' مکمل کر کے 'مولوی' اور 'عالم' بن چکے تھے۔ یہ تو خیر ڈگریاں ہیں لیکن عربی اور فقہ میں ان کی لیاقت کا یہ عالم تھا کہ استاد محترم مولوی عنایت اللہ کا خیال تھا کہ حیات اللہ کی شکل میں انھیں جانشین مل گیا ہے لیکن ان کے شاگرد نے تو دل میں

کچھ اور ہی ٹھان رکھی تھی... ٹھان رکھی کہنا تو شاید پُر بیانی قرار پائے لیکن ان کے 'ہاؤ بھاؤ' ایسے تھے جو فرنگی محل کی روایت سے ہم آہنگ نہ تھے۔ مثلاً یہ کہ بڑا سا گھر تو تھا لیکن مکین صرف ایک، نہ کوئی صفائی ستھرائی کرنے والا، نہ توے پر روٹیاں سینکنے والا اور نہ دال روٹی کی کوئی سبیل.... عمر آٹھ دس برس کی تھی۔ لوگ طرح طرح سے دست تعاون بڑھاتے لیکن وہ ہاتھ پشت پر باندھے رہتے۔ کچھ بھی قبول نہ کرتے۔

دوسری بات یہ تھی کہ ہرن پارک میں پاس پڑوس کے دو چار بچوں کی ٹولی بنا کر چھوٹے موٹے ناٹک کھیلتے، جو خود ان کے لکھے ہوئے ہوتے۔ یہ ناٹک بس ویسے ہی ہوتے رہے ہوں گے جیسے اس عمر میں ممکن تھے۔ ظاہر ہے ان کے نام 'جنگل کا ڈاکو'، 'کالا چور' اور 'شہزادے کا خزانہ' کے علاوہ ہو بھی کیا سکتے تھے۔ لیکن تھے یہ بہرحال ناٹک... اس عمر میں گلی ڈنڈا بھی تو کھیلا جا سکتا تھا، مگر وہ انھوں نے نہیں کھیلا۔

'درس نظامی' مکمل ہو گیا تو منطقی ذہن میں 'مسلّمات' پر اٹھنے والے سوالات نے انھیں پہنچا دیا جوبلی کالج اور گومتی ندی۔ جوبلی کالج سے ہائی اسکول کیا اور انٹرمیڈیٹ اور گومتی میں سیکھی پیراکی۔ گھنٹوں ہاتھ پیر پھیلائے چت لیٹے رہتے، سینے کی ساری ہوا باہر نکال کر جسم کو بے وزن کر لیتے اور جب یہ صورت ناقابل برداشت ہو جاتی تو تیزی سے سانس لے کر ہوا پھر خارج کر دیتے، قبل اس کے کہ پانی اپنا زور دکھا پائے۔ یہ ایک طرح سے پانی کو بے وقوف بنانا ہوا، سو یہ تو انھوں نے کیا لیکن اس سے زیادہ نہیں، کبھی نہیں... یہ بھی تو بتانا ہے کہ ان ساری مہموں میں ان کے ساتھ ہوتے فرحت اللہ انصاری، کامل انصاری، چودھری محمد حامد صدیقی اور پرویز مشرف کے والد مشرف الدین جو تعلیم حاصل کرنے کے لیے میرٹھ سے فرنگی محل آئے تھے۔

اب حیات اللہ انصاری کو بی اے کرنے کی سوجھی اور وہ بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے لیکن گانٹھ میں ایک پیسہ نہ تھا۔ فرنگی محل کے ایک مولانا سے ایک ہزار روپے بطور قرض مانگے اور انھوں نے ضمانت طلب کی تو اس نوجوان نے اپنا مکان پیش کر دیا کہ قرض کی ادائگی تک اسے اپنے استعمال میں رکھیے۔ یہ بات 1931-32 کی ہے۔ علی گڑھ سے انھوں نے بی اے تو کر لیا لیکن مکان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ خیر یہ تو کوئی خاص بات نہیں، سودائے عشق میں تو یہ ہوتا ہی ہے۔ علی گڑھ میں ڈگری حاصل

حیات اللہ انصاری نے ہفت روزہ 'ہندستان' کے سارے تجربے کو ایک طرف رکھ دیا اور روزنامہ کے جدید ترین معیاروں سے اردو صحافت کو متعارف کرایا.. خبریں تازہ ترین، پیش کش پرکشش اور پر وقار، ہر صفحے کا کردار متعین لیکن ہر نئے چیلنج کا سامنے کرنے کے لیے تیار، ایک دوسرے سے متعلق خبروں کی یک جائی 'ہندستان' والا املا اور سرخیوں میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ اظہار۔

کرنے کے علاوہ انھوں نے ایک کام اور کیا۔ پنڈت نہرو کو پہلی بار علی گڑھ لے آئے اور ان سے تقریر کرا دی۔ ایک دوسرے صاحب نے اس کام کا کریڈٹ لینے کی بہت کوشش کی لیکن بعد میں ہتھیار ڈال دیے۔

مکان سے محرومی کے بعد انھوں نے سر چھپانے کے لیے فرنگی محل کی ڈھال پر، ولی الحق مرحوم کے مکان کے پاس ایک کمرہ کرایے پر لے لیا اور پیراکی اور ہاکی کھیلنے کے علاوہ دو تین شوق اور پال لیے۔ یہ شوق تھے سانپ پالنا، ایورسٹ سر کرنے کے لیے رسوں کے ذریعے چھوٹے موٹے ٹیلوں پر چڑھنے کی مشق کرنا۔ اپنا ہر کام خود کرنے کی عادت جو پہلے ہی سے تھی، ان شوقوں میں خوب کام آئی۔ کباڑی بازار سے ایک ٹوٹا پھوٹا سا بائسکوپ خرید لائے، ٹھونک پیٹ کے اسے ٹھیک کر لیا اور پردہ تان کے متحرک تصویریں دکھانے لگے۔ ایک کام اور کیا۔ اپنے ہاتھ سے تین صوفے بنائے۔ ایک اب بھی موجود ہے۔ منڈھا تو یہ ہے ٹاٹ سے لیکن لگتا ہے سرخا سرخ۔ خود لکھتے ہیں۔ ''... اور میں کانگریسی اور سوشلسٹ، بلکہ کمیونسٹ۔''

1937 میں شیر دروازہ سے پنڈت نہرو اور رفیع احمد قدوائی نے ہفت روزہ 'ہندستان' نکالا تو حیات اللہ انصاری اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس کے ڈائرکٹر تھے رفیع احمد قدوائی، اچاریہ نریندر دیو اور منیجنگ ڈائرکٹر تھے ڈاکٹر علیم اور ان کا گھر تھا اس اخبار کا دفتر جہاں کانگریس اور بائیں بازو کے سارے چوکھے رنگ یکجا ہو گئے تھے لیکن 1942 میں جب یہ ہفت روزہ بند ہوا تو کمیونسٹ اور کانگریس ایک دوسرے کے مقابل تھے اور حیات اللہ کو کبھی کمیونسٹوں اور نہرو میں زیادہ کشش محسوس ہوتی اور کبھی گاندھی جی میں۔ ابھی اس ذہنی کشمکش سے نکل بھی نہ پائے تھے کہ قومی آواز کا ڈول ڈالا جانے لگا۔ رفیع صاحب نے جو انھیں متشدد کمیونسٹ سمجھتے کسی اور کو ایڈیٹر مقرر کر دیا لیکن پھر حق حقدار کو مل ہی گیا، اور یہ اردو صحافت کی بڑی خوش قسمتی تھی۔

حیات اللہ انصاری نے ہفت روزہ 'ہندستان' کے سارے تجربے کو ایک طرف رکھ دیا اور روزنامہ کے جدید ترین معیاروں سے اردو صحافت کو متعارف کرایا... خبریں تازہ ترین، پیش کش پُرکشش اور پُروقار، ہر صفحے کا کردار متعین لیکن ہر نئے چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے تیار، ایک دوسرے سے متعلق خبروں کی یک جائی 'ہندستان' والا املا اور سرخیوں میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ اظہار۔

اخبار کی انتظامیہ اور ادارتی عملے کے درمیان کشمکش کی تاریخ نئی نہیں لیکن اب ایڈیٹروں نے ہار مان لی ہے... آٹھ دس برس قبل انگریزی کے ایک قومی اخبار کے دفتر جانا ہوا تو ریزی ڈینٹ ایڈیٹر نے جو نیشنل ہیرالڈ میں

میرے ساتھ کام کر چکے تھے کھڑے ہو کر خیر مقدم کرنے کے بعد ایک صاحب سے جو بیٹھے ہوئے تھے میرا تعارف کرایا۔ میں نے ان کی تعریف پوچھی تو اٹل چندرا نے کہا، 'مالک' بعد میں معلوم ہوا وہ لکھنؤ ایڈیشن کے منیجر تھے۔ ایسوشی ایٹیڈ جرنلس میں یہ حالت تو کبھی نہ تھی لیکن خاندان کا بھی سربراہ تو ہوتا ہی ہے۔

میرے زمانے میں روزنامہ نوجیون کے ایڈیٹر تو چپراسی تک کے اشارے پر منیجنگ ڈائرکٹر کے کمرے کی طرف لپک پڑتے لیکن اما شنکر دکشت چپراسی کے ذریعے مطلع کرنے کے بعد ہی حیات اللہ صاحب سے ملنے آتے۔ ایک دن ان کے چپراسی نے آکر سلام کیا اور کہا، ''صاحب نے سلام کہلایا ہے۔'' حیات اللہ صاحب نے جو کلہڑ سے دہی کھا رہے تھے، سر اٹھائے بغیر کہا، ''کہہ دو اداریہ لکھ رہے ہیں۔'' (یعنی نہیں آسکتے)۔ ایسا ہی کچھ دوسرے دن بھی ہوا تو تیسرے دن دکشت جی مسکراتے ہوئے خود ہی آگئے۔ انھیں راجیہ سبھا کی امیدواری کے لیے کاغذات پر ان سے دستخط کرانے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ بات ابھی سے پھیل جائے۔ ہیرالڈ کے ایڈیٹر، ایم چلپت راؤ، (ایم سی) سے ملاقات بھی دکشت جی اسی طرح کرتے لیکن مخدوم محی الدین قومی آواز کے دفتر آتے تو ایم۔سی۔ ان کی نظمیں سننے، جو بس تھوڑی بہت ہی ان کی سمجھ میں آتی ہوں گی، بن بلائے ہی چلے آتے۔

حیات اللہ صاحب کی زندگی میں ان کی حصولیابیوں پر پہلے اور آخری سیمینار کا اہتمام اترپردیش اردو اکادمی نے 31 مارچ 1997 کو کیا۔ اسی دن روزنامہ 'صحافت' نے اپنا اتوار کا ضمیمہ ان کی خدمات کے لیے وقف کر دیا۔ اس ضمیمے میں ان کی غیر مطبوعہ خودنوشت کے ایک صفحے کا عکس بھی شائع ہوا تھا جس کا ایک جملہ تھا، ''علی گڑھ میں میرا رجحان کمیونزم کی طرف ہو گیا تھا اور کبھی کبھی ایسا بھی لگتا کہ میں نے اس کے حق میں فیصلہ کر لیا ہے۔'' اس اقتباس کا آخری جملہ تھا، ''پندرہ سال کی کشمکش کے بعد کمیونزم کے اثرات سے نکل سکا۔''

چند روز بعد انھوں نے اس ضمیمے پر ''جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نہ صرف صحیح ہے بلکہ دلچسپ بھی'' تحریر کر کے مجھے دیا تھا۔ میں ان دنوں اس روزنامے کا مشیر خصوصی اور عملاً ایڈیٹر تھا۔ ضمیمے کی یہ کاپی میرے پاس محفوظ ہے۔

حیات اللہ صاحب بھروسہ ہر ایک پر کر لیتے۔ خود نوشت کا مسودہ انھوں نے کسی طالب علم کے، جو ان پر پی ایچ ڈی کر رہا تھا، حوالے کر دیا تھا اور اس نے پلٹ کے

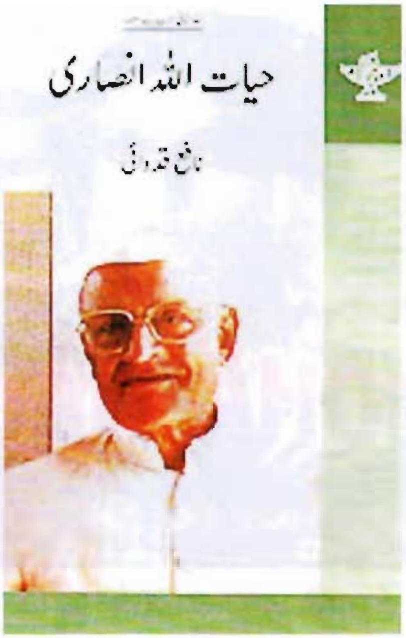

سانس نہ لی۔ چنانچہ یہ کام از سر نو شروع کیا۔ افسوس صرف 45 صفحات لکھ سکے۔ کمیونزم کے سلسلے میں اقتباس گم شدہ مسودہ سے منقول ہے۔

اپنا کام خود کرنے کے عادی تھے اس لیے احکام کبھی صادر نہ کرتے... گھانا کے صدر انکروما (NKARUMA) کا نام انگریزی میں کچھ اس طرح لکھا جاتا کہ اردو کے سارے اخبار انھیں نکروما لکھتے، قومی آواز بھی۔ یہ غلطی دہرائی گئی تو حیات اللہ انصاری اپنے کمرے سے سب ایڈیٹروں کے شعبے میں آئے۔ بلیک بورڈ پر نام دونوں طرح سے لکھ کر غلط کو کاٹ دیا اور صحیح پر (P) کا نشان لگا کر اپنے کمرے میں چلے گئے، ایک لفظ بولے بغیر۔ (تینوں اخباروں کی عمارت میں پہلے ایک انگریزی اسکول ہوا کرتا تھا اور کئی کمروں میں بلیک بورڈ لگے ہوئے تھے) وہ غلطی پر کبھی نہ ٹوکتے، یہ کام عشرت علی صدیقی صاحب کے سپرد تھا لیکن اچھے کام کی تعریف ضرور کرتے۔ ایک دو جملے چھوٹے سے پرچے پر لکھ کر۔

رٹائر ہونے کا وقت آیا تو مدتِ کار میں توسیع کر دی گئی۔ ایک مہینے بعد پتہ چلا کہ کچھ لوگ ناراض ہیں تو فوراً استعفیٰ دے دیا اور پھر صرف ایک بار اخبار کے دفتر میں داخل ہوئے... اس دن جب یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنایا گیا، کہ یہ لڑائی قومی آواز کی قیادت ہی میں لڑی گئی تھی۔

قومی آواز میں شاید ہی کوئی ایسا سینیئر کارکن ہو جس نے نظرباغ کے ان کے مکان کے ڈرائنگ روم تک میں سانپوں کو رینگتے نہ دیکھا ہو۔ سانپ دیکھ کر دوسرے تو پیر اٹھا لیتے لیکن حیات اللہ انصاری اسی طرح بیٹھے رہتے اور شام ہوتے ہی ہاتھ سے پکڑ پکڑ کر انھیں گھڑوں میں رکھتے... سانپوں سے دوستی کول صاحب سے تعلقات کا نتیجہ تھی۔

حیات اللہ انصاری سڑک پر چلتے تو ایسا لگتا جیسے صرف ٹانگیں آگے پیچھے ہو رہی ہوں اور ان دنوں تو جب Spondylitis نے گردن پر کالر چڑھا دیا تھا ایسا لگتا کہ البرٹ ٹیلر آئے وِن ہو (Ivanhoe) نام کی فلم سے نکل کر کھدر کی شیروانی پہنے لکھنؤ کی سڑکوں پر گھوم رہے ہوں۔

گھر کی زندگی بے حد ہموار تھی لیکن... اب اس 'لیکن' کی وضاحت بڑے بیٹے عیست انصاری کے حوالے سے سنیے۔ وہ امریکہ سے آیا تو انھوں نے ایک دن اس سے پوچھا، ''کیسی گذر رہی ہے؟'' اس نے کہا، ''اچھی۔'' پھر پوچھا، ''بیوی سے لڑائی ہوتی ہے،'' اس نے کہا، ''نہیں،'' تو بولے، ''تب کیا خاک اچھی گذر رہی ہے!''

چھوٹے بیٹے سدرت کی شادی کے برسوں بعد ایک دن بہو نے میلے کپڑے غسل خانے میں چھوڑ دیے۔ شام کو دیکھا تو پلنگ پر دھلے دھلائے رکھے تھے۔ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہوا۔ پتہ چلا حیات اللہ صاحب کو غسل خانے میں میلے کپڑے ذرا نہیں بھاتے، سو انھوں نے دھو ڈالے۔ یہی وہ اپنے کپڑوں کے ساتھ بھی کرتے۔

ریور بینک کالونی کے سرکاری مکان میں وہ بطور کرایے دار رہتے تھے۔ بعد میں اس کے فروخت ہونے کی نوبت آئی تو انھوں نے اسے بہو کے نام سے خریدا کہ بیٹے نے کبھی گڑبڑ کی تو وہ غریب کہاں جائے گی۔ ان دنوں خواتین کے حقوق کا بہت چرچا ہے لیکن حیات اللہ صاحب نے جو کیا اس کا خیال شاید ہی کسی کو آیا ہو۔

حیات اللہ انصاری بہت سخت جان تھے، زندگی سے ٹوٹ کے پیار کرتے۔ موت کو بھی پسینے آگئے۔ آخر دل کے 28ویں دورے کے بعد انھوں نے خود کو موت کے حوالے کر دیا، لیکن اپنی شرطوں پر۔ دل کا دورہ پڑتا اور بیٹا بہو پریشان ہوتے تو وہ کہتے، ''تم لوگ گھبراتے کیوں ہو؟ مشکاۃ (پوتا) جب تک دس سال کا نہیں ہو جاتا مجھے کچھ ہونے کا نہیں۔'' اور یہی ہوا بھی۔ 17 فروری 1999 کو مشکاۃ میاں دس سال کے ہوئے اور اگلے دن انھوں نے دنیا کو الوداع کہہ دیا۔

■

Abid Suhail, 22SP, Sector "C",
Aliganj, Lucknow-226 024 (UP)

محمد عبداللہ انصاری

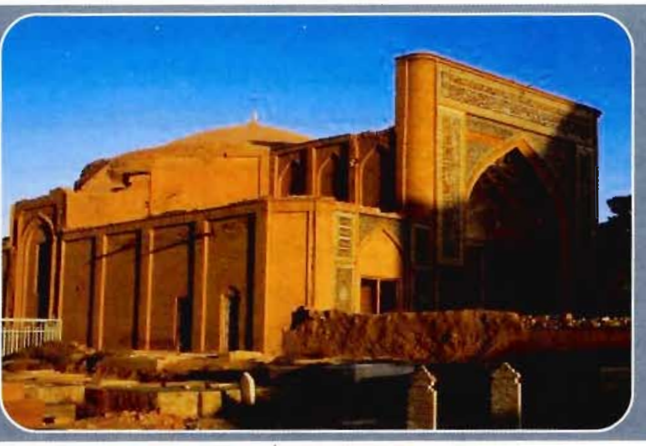

مولانا جامی
احوال و آثار

مولانا جامی کا نام عبدالرحمٰن اور مشہور لقب نورالدین تھا۔ لیکن وہ عمادالدین کے لقب سے بھی پکارے جاتے تھے۔ تذکرہ نگاروں نے انھیں نورالدین کے لقب سے زیادہ یاد کیا ہے۔ لفظ 'جامی' میں 'ی' نسبتی ہے۔ خراسان شہر کا ایک نام ہرات بھی ہے جو افغانستان میں ہے۔ اس شہر کے قصبے جام میں مولانا عبدالرحمٰن 23 شعبان 817 ہجری کو پیدا ہوئے۔ مولانا جامی کے والد کا نام نظام الدین احمد بن محمد الدشتی تھا۔ دشت اصفہان کے ایک محلے کا نام ہے۔

مولانا جامی نے 81 سال کی عمر پائی۔ فجر کی فرض نماز سے قبل دو رکعت نماز ادا کی اور دوران اذان دنیائے لامکاں کی طرف کوچ کر گئے۔ مترجم و مصنف پروفیسر شمس الدین احمد نے بادشاہ وقت سلطان حسین بہادر خان، شہزادوں، امیروں اور وزیروں کی شرکت کا احوال بیان کیا ہے۔

مولانا جامی کے ہم زلف مولانا فخرالدین علی صفی نے ان کے وارثین کے مفصل حالات میں تحریر کیا ہے کہ حضرت مولانا سعدالدین کاشغری قدس اللہ سرہ کے فرزند حضرت خواجہ کلاں کی دو بیٹیاں تھیں، جن میں ایک حضرت مخدوم (مولانا جامی) کے نکاح میں تھیں اور دوسری کا نکاح راقم الحروف (فخرالدین صفی) سے ہوا تھا۔ مولانا جامی کی اس محترمہ سے چار بیٹے پیدا ہوئے۔ پہلا بیٹا ایک دن کے اندر وفات پا گیا اور بے نام رہا۔ دوسرا بیٹا خواجہ صفی الدین محمد کا انتقال ایک سال کی عمر میں ہوگیا۔ اس کی وفات سے مولانا جامی بہت متاثر ہوئے اور سات بند کا ایک دردناک ترکیب بند مرثیہ لکھا جو دیوان کامل جامی میں موجود ہے۔ آپ کے تیسرے فرزند خواجہ ضیاء الدین یوسف کی پیدائش 882 ہجری کے مہینہ شوال میں ہوئی۔ چوتھے بیٹے محرم الحرام ہجری سال 891 میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام ظہیرالدین عیسیٰ تھا۔ وفات چالیس دن کے بعد ہوگئی۔

خواندمیر کی تصنیف حبیب السیر کے مطابق مولانا جامی کے ایک بھائی تھے جن کا نام مولانا محمد جامی تھا۔ جو بڑے صاحب علم وفضل تھے۔ مزاج میں بہت انکساری تھی۔ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ گاہ بہ گاہ بڑے بارونق شعر کہتے تھے۔ علم موسیقی سے واقفیت تھی۔

تحصیل علم:

صرف ونحو اور ابتدائی تعلیم مولانا جامی نے اپنے والد نظام الدین احمد سے حاصل کی۔ علوم عقلی و یقینی معارف میں کسی قدر دوسروں سے بے نیاز رہے۔ مولانا نے اپنی زندگی کا پہلا سفر اپنے والد نظام الدین احمد کے ساتھ تحصیل علم کی غرض سے ہرات کے لیے کیا۔ مدرسہ نظامیہ میں اس وقت کے مشہور عالم و ماہرفن مولانا جنید اصولی کے حلقۂ درس میں عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد خواجہ علی سمرقندی کے مکتب درس میں داخل ہوئے اور چالیس روز کے بعد ہی فارغ التحصیل ہوگئے۔

تیسرے مرحلے میں اس عہد کے فاضل استاذِ مباحث مولانا شہاب الدین محمد جاجرمی کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئے اور باکمال عالم و فاضل بن کر سمرقند چلے گئے اور اس وقت کے محقق مولانا صلاح الدین موسیٰ جو قاضی زادۂ روم تھے، کے مدرسہ درس میں آگئے۔ پہلی ہی ملاقات میں قاضی زادۂ روم سے مباحثہ ہوا، جو کافی طویل تھا۔ آخر میں قاضی زادہ آپ سے متفق ہوگئے۔ سمرقند میں دوران مطالعہ ایک تذکرہ ان کے مطالعے میں آیا جس کے حاشیے پر قاضی زادۂ روم مولانا صلاح الدین موسیٰ کی تحریریں سالہا سال سے شاگردوں کے مطالعے میں تھیں، مولانا جامی اس تذکرے کا مطالعہ کرتے جاتے اور روزانہ دو ایک باتیں کاٹتے جاتے اور تصحیح کرتے جاتے۔ ان کے اس عمل سے قاضی زادہ روم مولانا صلاح الدین موسیٰ بہت خوش و ممنون رہتے۔

قاضی زادہ روم مولانا موسیٰ نے اپنے افکار کی تخلیق شرح ملخص جمعینی بھی مولانا جامی کے حوالے کردی۔ مولانا جامی نے اس شرح پر ایسے نایاب و قیمتی اضافے کیے جو قاضی زادہ کے وہم وخیال میں بھی نہیں تھے۔ مولانا جامی نے اپنی علمی و تدریسی خدمات کے بعد بغرض حج و زیارت سفر حجاز کا قصد کیا۔ دوران سفر نیشاپور، سبزوار، دامغان، سمنان، قزوین اور ہمدان ہوتے ہوئے بغداد پہنچے۔ صاحب خزینۃ الاصفیا نے دیوان کامل جامی کے مقدمہ کے صفحہ نمبر 150 سے بغداد میں پیش آئے ایک واقعے کا ذکر کچھ یوں کیا ہے:

''حضرت امام حسین سید الکونین کے روضۂ مطہرہ اور کربلا کے دوسرے شہیدوں رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی زیارت سے فراغت پاکر مولانا جامی پھر بغداد لوٹ آئے۔ وہاں شیعہ مذہب کے چند علما نے آپ کی تصنیف کردہ کتاب سلسلۃ الذہب کے بعض شعروں پر اعتراض کیا اور مولانا سے بحث کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ چنانچہ اس بارے میں ایک بڑی مجلس ترتیب دی گئی جس میں اس عہد کے بغداد کے صلحاء و علماء اور حاکمان وقت نے شمولیت کی۔ شیعہ علما کی طرف سے ایک شخص جو تمام شیعوں میں سخت تھا اور جس کا نام نعمت حیدری تھا، مولانا جامی کے مقابلے میں بحث کے لیے آگے آیا۔ مولانا جامی نے اس سے پوچھا کہ کیا تم ہم سے شریعت کی رو سے بات کروگے یا طریقت کی رو سے؟ اس نے کہا دونوں کی رو سے۔ آپ نے فرمایا تو پھر تم پہلے اپنی مونچھوں کو جو لمبی اور شریعت کی مقرر کردہ حدوں سے بڑھ چکی ہیں، درست کرلو تاکہ ہم تم سے بات کریں اور جب تک تم اپنی مونچھوں کو درست نہیں کرلیتے تم سے بولنا حرام ہے۔ بغداد کا حاکم مجلس میں حاضر تھا اس نے حکم دیا کہ قینچی لائی جائے۔ لیکن مجلس میں حاضر لوگوں نے قینچی کا انتظار نہیں کیا اور اس سے پہلے کہ قینچی آتی نعمت حیدر کی مونچھوں کو بڑی نعمت اور تبرک جان کر ہاتھوں سے اکھیڑ کر رکھ دیا۔ نعمت حیدری کی حالت غیر ہوگئی اور وہ بول نہ سکا اور شکست خوردہ ٹوٹ پھوٹ کر مجلس سے باہر چلا گیا اور حضرت مولانا بغداد سے مدینہ مقدس کی طرف روانہ

ہوگئے۔(مولانا جامی: حیات اور شاعری، ص 28-27)

وزیر خاص میر علی شیر نوائی مولانا جامی کے عقیدت مند دوست تھے۔ خود فارسی اور ترکی کے بڑے شاعر تھے، انھوں نے مولانا جامی کے انتقال کے بیس دن پورے ہونے پر عیدگاہ میں ایک دعوت عام کا اہتمام کیا جس میں واعظ شہر نے میر علی شیر نوائی کا تخلیق کردہ مرثیہ منبر پر کھڑے ہوکر سنایا جس میں بادشاہ اور وزرا، امرا اور مشائخ واکابرین نے شرکت کی۔ چالیسویں دن خود بادشاہ نے عیدگاہ میں ایک دعوت عام کا اہتمام کیا جس میں لوگوں کا بڑا ہجوم جمع ہوا۔ وہاں سے بادشاہ حضرت جامی کے مقبرے پر تشریف لے گئے اور مقبرے کے قبلے کی طرف ایک عمارت کی بنیاد رکھی اور مقبرے پر حفاظ کی ایک جماعت مقرر کی۔

مولانا جامی کی شہرت ومقبولیت کا سبب ان کی علم دوستی، ذکاوت وذہانت، فہم وادراک، قوتِ حافظہ، عقل و دانش اور معارف وعلوم میں درک تھا۔ خلق خدا سے ان کا لگاؤ اس قدر تھا کہ اپنے کلام میں منفعت بخش کتب کا مطالعہ کرنے کی ترغیب دیتے اور نصیحت کرتے۔

مولانا جامی ذوق جمال وحسن دوست انسان تھے۔ خوبصورتی ودلکشی کو دیکھ کر ان کا ذوق حسن مشتعل ہوجاتا تھا۔ ان کے اشعار اور کلام فارسی زبان وادب کا وقیع عشقیہ سرمایہ ہیں۔ جس میں سوز وگداز اور عاشقانہ جذبات مرتبۂ کمال وجذبۂ حال تک ہیں۔ پاک دامنی اور پرہیزگاری کی صفت انتہائی کمال تک تھی۔ ان کی مثنوی یوسف وزلیخا اس کی بہترین مثال ہے۔ اس مثنوی کے دوران تخلیق مولانا پر بےخودی وشوریدگی اور عشق و حال کا غلبہ رہتا تھا۔ مثنوی یوسف وزلیخا داخلی جذبہ وشوق اور گرمیِ قلب وسوز دروں سے مملو ہے۔

مولانا جامی کے مسلک، عقیدے اور روحانیت و تصوف کی تفصیل ان کی تصنیف سلسلۃ الذہب کے اشعار سے معلوم ہوتی ہے۔ مولانا کا ایک شعر ان کے تصوف کی وضاحت کرتا ہے:

اگر بہ ساغر دریا ہزار بادہ کشد
ہنوز ہمت او ساغر دگر خواہد

ایران کے بیشتر ادبی مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے مولانا جامی کے شاعرانہ ذوق وطبیعت پر اپنی تحریروں میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ ایران، ترکستان، اور ہندوستان کے فارسی داں طبقوں نے مولانا جامی کو خاتم الشعرا کے لقب سے نوازا ہے۔ نویں صدی ہجری سے تیرہویں صدی ہجری تک قدیم فارسی اسلوب کا دوسرا کوئی شاعر پیدا نہیں ہوا۔ شعر و شاعری مولانا جامی کا پیشہ نہیں تھا بلکہ وہ ہمیشہ کتب بینی و مطالعہ اور سیر وسلوک میں منہمک رہتے۔ ان کی بیشتر زندگی علم کی جستجو وتلاش میں گزری کبھی کبھی شعرگوئی کی طرف مائل ہوتے۔ جب ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی تو شعرگوئی میں ڈوب جاتے۔ مولانا جامی کو فن شعرگوئی کا ملکہ حاصل تھا۔ سخنوری کی طرف طبعی رغبت وفطری ذوق تھا۔ پھر بھی وہ مسلسل شعرگوئی کی طرف مائل نہیں ہوتے تھے۔ شاعری کو کسر شان سمجھتے تھے۔ کبھی کبھی ان کو ملال ہوتا اور شاعری سے اظہارِ نفرت کرتے تھے کیونکہ اس عہد میں اکثر شعرا کو شاعری کو کسب معاش کا وسیلہ وذریعہ بناتے اور شاعری کے اعلیٰ وارفع مقام ومرتبے اور قدروں کو پامال کرتے دیکھا تھا۔ اس وجہ سے اکثر بیزار رہتے۔ وہ اس بات سے بہت نالاں رہتے کہ یہ فن اب حرص وطمع اور شہرت طلبی کا ذریعہ بن گیا ہے۔ کمینوں، رذیلوں، احمقوں، بداخلاقوں اور ظالموں کی مدح سرائی اور کذب بیانی، ضمیر

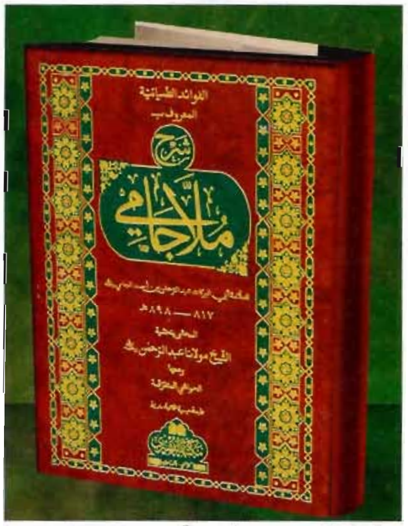

فروشی کرکے زراندوزی کی جاتی ہے۔ مولانا کے نزدیک فن شعرگوئی مضامین آفرینی اور ندرت معانی کے فقدان کا شکار ہے جس کی وجہ سے یہ فن مائل بہ زوال ہے۔ مولانا جامی کے عہد شباب میں کہی گئی غزلوں کے دو دیوان 'فاتحت الشباب' اور 'واسطۃ العقد' ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا کی سات مثنویوں اور قصائد وغزلیات کا زمانہ اواخر عمر کا ہے۔ مولانا جامی کی شاعری واردات قلبی، سوز وگداز، اصلیت وحقیقت پر مبنی ہے۔ ستائش گر شعرا کی طرح جاہ و حشم اور مال وزر کے حصول کے لیے نہ انھوں نے کبھی شاعری کی اور نہ قصیدہ لکھا۔ امرا وبادشاہ کی جھوٹی شان میں مدح گوئی سے پرہیز کیا۔ ان کا تیسرا دیوان 'خاتمۃ الحیات' ہے۔ اگر ان کے تینوں دواوین اور مثنویوں کو دیکھیں تو بادشاہوں، شاہزادوں، امیرزادوں، اور رئیسوں کی مدح سرائی سے خالی نہیں ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس عیب کو مولانا جامی ناپسند کرتے اور جن برائیوں کی وجہ سے شاعری سے بیزاری کا اظہار کرتے تھے وہ خود ان میں موجود تھیں۔ بعض محققین نے ان حقائق کی تلاش کی ہے اور یہ وضاحت کی ہے کہ مولانا جامی کی مدحیہ شاعری وقصیدہ گوئی صرف اظہار فن وصنعت گری اور نمائش ہنر ہے۔ نہ کہ حصول زر کا مقصد۔

مولانا جامی کے شعری خصائص

مولانا جامی پختہ کار شاعر تھے۔ ان کا کلام بالخصوص قصائد تکلفات سے پاک ہیں۔ فطری جذبات واصلیت کی فراوانی ہے۔ فنی خوبیوں کا خاطر خواہ استعمال ہوا ہے۔ ان کے قصائد کے موضوعات مساجد، خانقاہیں، باغات و مدارس اور دیگر تعمیرات ہیں۔ بادشاہوں کی مدح سرائی ہے۔ معروف دینی بزرگوں کی توصیف وتعریف ہے۔

قصیدہ نگاری میں مولانا جامی نے فارسی اساتذہ شعرا کی پیروی کی ہے جیسے امیر خسرو، خاقانی، انوری، ظہیر فارابی وغیرہ مولانا جامی نے مذکورہ شعرا کے تتبع میں قصائد کہے ہیں۔ ان کے قافیہ، ردیف، اور زمین بھی اختیار کی ہے۔ ان کے ابیات سے تضمین بھی کی ہے۔ ان کے قصائد کے جواب میں بھی قصیدے کہے ہیں۔

غزل گوئی میں خاص طور پر مولانا جامی کے سامنے حافظ شیرازی اور شیخ سعدی رہے ہیں ان کی تراکیب، قوافی وردیف اور اوزان وبحور کو برتا ہے۔ غزلوں کے جواب میں غزلیں کہی ہیں۔ اشعار سے تضمین بھی کہی ہیں۔ ان سب کے باوجود مولانا جامی کا شعری اسلوب منفرد ہے۔ ذہنی پختگی ومہارت، سادگی وروانی، حلاوت وشیرینی، گہرائی وتاثیر ان کی شاعری کی خوبیاں ہیں۔ جن شعرا کا تتبع کیا ہے، ان کا اسلوب مولانا جامی کے کلام میں غالب نہیں ہے۔ مولانا جامی کے عہد شعرگوئی میں انسانی اخلاق، تصوف، شریعت، تقویٰ وپرہیزگاری پر زوال آچکا تھا۔ جس کے سبب شاعری بھی زوال پذیری کی شکار تھی۔ تصنع و تکلف اور شاہد پرستی شاعری کا جزو خاص بن گئے تھے۔ اس کے برعکس مولانا جامی کی شاعری حقیقت پسندی، اصلیت، فطری جذبات نگاری، اور واردات قلبیہ کا نمونہ ہے۔ سوز وگداز کلام میں فصاحت، نرمی وشیرینی، واقعہ نگاری، عرفان وعشق کا امتزاج، سادگی وسلاست، تغزل و نغمگی، صنائع وبدائع اور دیگر شعری لوازمات وتلازمات کا بھرپور استعمال مولانا جامی کی شاعری میں ملتا ہے جس سے فارسی شاعری میں توسیع وتجدید نظر آتی ہے۔

■

Mohd Abdullah Ansari, Pohasanpura, Takiya, Mohalla, Seewan - 841236 (Bihar)

ساجد حسین

سیکولر حکمراں
ٹیپو سلطان

شہادت ایک مرد کامل کی موت نہیں ہوتی بلکہ حیات انسانی کی پیدائش ہوتی ہے۔ حیات کی فنا کائنات کی بقا بن جاتی ہے۔ ملک وملت کی خاطر بہادری اور عزت کی موت مرنے والے اپنی قوموں کے دل ودماغ میں تاقیامت زندہ رہتے ہیں اور آزادی کی تڑپ رکھنے والوں کے لیے مشعل راہ بن جاتے ہیں۔ ٹیپو سلطان کی شہادت ہندوستان کی لکھی جانے والی تاریخ کا المیہ ہے مگر حریت پسند اور غیرت مند انسانی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ سلطنت میسور جس کو حیدر علی نے سلطنتِ خداداد کا نام دیا تھا۔ اس شہادت کے ساتھ حیدر علی اور ٹیپو سلطان جس شعور کو عام کرنا چاہتے تھے اور جس قوت کو وہ ملک سے باہر نکالنے کی جدوجہد میں مصروف تھے اسی غیر ملکی طاقت کے آگے مقامی حکمران دست بستہ تھے بلکہ اس کے ساتھ مل کر ان کے خلاف کمر بستہ ہو کر وہ ہندوستان کو غلامی کی طرف ڈھکیل رہے تھے۔ ٹیپو سلطان نظام اور مرہٹوں سے مذہب وملک کی دہائی دیتا رہا۔ اللہ، رسول اور وطن کا حوالہ دیتا رہا مگر ان کے بہرے کانوں سے یہ آواز ان کے مردہ دل تک اتر نہ سکی۔

ٹیپو سلطان کی شہادت کے چار سال بعد 1803 میں فرخ آباد کے مقام پر ہلکر کی شکست سے انھیں اس بات کا احساس ضرور ہو گیا تھا کہ ٹیپو سلطان کی شکل میں وہ مضبوط دیوار جو انگریزوں کی راہ میں حائل تھی ان ہی کی مدد سے گرادی گئی تھی۔ اب غیر ملکی طاقت کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ ہندوستان انگریزوں کے سامنے سرنگوں کھڑا تھا!

ہندوستان کو غلامی سے بچانے کی کوشش میں اپنی جان دینے والا پہلا ہندوستانی حکمراں ٹیپو سلطان بیک وقت حکمراں، عالم، مفکر، مدبّر، جرنیل، انجینئر، تاجر، زاہد، متقی، اور پرہیز گار انسان تھا۔ ٹیپو سلطان حضرت ٹیپو مستان کے فیض سے فخر النساء کے بطن سے 20 نومبر 1750 میں جمعہ کے دن پیدا ہوا۔ اس کا نام فتح علی رکھا گیا۔ پانچ سال کی عمر سے اس نے عربی، فارسی کنڑ زبان کے علاوہ قرآن وحدیث اور فقہ کی تعلیم لینا شروع کی۔ اس کے ساتھ فن سپہ گری کی تعلیم بھی شروع ہوئی۔ 15 سال کی عمر سے وہ فوجی مہم جوئی میں حصہ لینے لگا۔

ٹیپو سلطان کا کھانا سادہ، لباس سادہ اور طرز کلام نہایت شیریں اور ملائم تھا۔ ہر وقت ہاتھ میں تسبیح ہوتی۔ فجر کی نماز کے بعد پابندی سے تلاوت قرآن پاک کرتا۔ اس کی زبان سے کوئی سخت اور فحش بات نہیں نکلتی تھی۔ کسی بھی معاملے میں وہ اعتدال کا دامن نہیں چھوڑتا۔ انتہائی محنتی، فرض شناس، ملنسار اور خوش اخلاق انسان تھا۔ دسترخوان پر ہر وقت کچھ افراد ہوتے جن میں اس کے دو تین فرزند ضرور شامل ہوتے۔ وہ اکثر ان سے اللہ اور رسول کی باتیں کرتا۔ سواری میں گھوڑے کا استعمال کرتا۔ نہایت مجبوری کی حالت میں وہ پالکی پر سوار ہوتا۔ سماج میں ادنیٰ واعلیٰ کی پہچان نہ بڑھے اس کی خاطر اس نے پالکی کی سواری پر پابندی لگا رکھی تھی۔ وہ عام طور پر فارسی زبان میں بات کرتا مگر کنڑ اور ہندوستانی (اردو) سے بھی واقف تھا۔ فارسی، کنڑ، تلگو اور مراٹھی چاروں زبانوں میں وہ سرکاری خط وکتابت کرتا اس کے لیے اس نے ان زبانوں کے سکریٹری مقرر کر رکھے تھے۔ علمی اور مذہبی امور پر گفتگو کرنا اس کا بہترین مشغلہ تھا۔ مورخوں کے اقتباسات اور شعرا کا کلام پڑھتا اور سنتا۔ رات میں بستر پر لیٹ کر کوئی تاریخی یا مذہبی کتاب پڑھتا۔ اس کی بردباری اور خاکساری کا یہ عالم تھا کہ فرشی سلام یا جھک کر سلام کرنا تو دور ہاتھ اٹھا کر سلام کرنے کو بھی وہ پسند نہ کرتا۔ مسجد میں جہاں جگہ مل جاتی وہی کھڑا ہو کر نماز پڑھ لیتا۔ وہ صاحب قلم تھا اس کی تحریر مختصر مگر جامع ہوتی اور الفاظ میں تحکم پایا جاتا تھا۔ ادب اور تصوف سے اسے گہرا لگاؤ تھا۔ نذر ونیاز میں یقین رکھتا تھا اور اولیائے کرام کی اس کے دل میں محبت تھی۔ بلا تفریق عبادت گاہوں کو گرانٹ دیتا تھا جس کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں۔

ٹیپو سلطان بادشاہ کے ساتھ ساتھ مصلح بھی تھا۔ اس نے سماجی اور معاشرتی برائیوں کو ختم کرنے اور ان کی اصلاح کی پوری کوشش کی۔ اس نے انسانوں کی بلی (قربانی) دینے کی رسموں کو ختم کیا۔ عورتوں کی خرید وفروخت پر پابندی لگائی۔ عورتوں کو پورا بدن ڈھکنے کا حکم

دیا۔شرم وحیا کو عام کیا۔فضول خرچی اور بے جا اسراف پر پابندی لگائی۔ آمدنی کا ایک فی صد ہی خیر خیرات اور تہواروں پر خرچ کرنے کی اجازت دی۔مختلف تقریبات کے اخراجات کی حد متعین کی۔شراب اور منشیات پر اپنے عوام کے لیے پابندی عائد کی۔ ٹیپو کی بڑی کوشش کرپشن کی روک تھام تھی۔ اس کے لیے وہ بذات خود متحرک رہتا۔اس نے اپنے تمام ماتحتوں کو ان کے مذہب کے مطابق حلف دلوایا تھا کہ وہ رشوت نہیں لیں گے۔

ٹیپو سلطان ہندوستان کا پہلا سیکولر حکمراں تھا۔آج کے ہندوستان کی طرح ہی اس کی سلطنت میں الگ الگ مذاہب کے لوگوں کے لیے الگ الگ سول کوڈ تھا۔ مسلمانوں کا فیصلہ شریعت کے مطابق اور ہندوؤں کا فیصلہ ہندو مذہب کے مطابق کیا جاتا وہ بلا کسی تفریق کے اپنے عوام کے ساتھ شفقت سے پیش آتا اور عدل وانصاف کا معاملہ کرتا۔ حالانکہ اس نیک دل انسان کو بھی تعصب کی عینک سے دیکھا گیا جبکہ ٹیپو سلطان اپنے ملک کی خوشحالی اور دشمن کی بربادی کی دعا کے لیے پروہتوں، پجاریوں اور سوامیوں سے دعا اور جاپ کی درخواست کرتا تھا۔ ٹیپو سلطان نے اس سلسلے میں ایک پجاری کو خط لکھا تھا جس کا متن اس طرح سے ہے۔

’’آپ جگت گرو ہیں۔ آپ ہمیشہ ریاضت میں مشغول رہتے ہیں تاکہ ساری دنیا کی فلاح ہو اور لوگ آسودہ حال رہیں۔مہربانی فرماکر پرماتما سے ہماری فلاح کے لیے بھی دعا کیجیے۔ جہاں کہیں بھی آپ جیسی مقدس ہستی موجود ہوگی وہاں باران رحمت کا نزول ہوگا اور وہاں فصلیں اچھی ہوگی۔‘‘ (تاریخ ٹیپو سلطان: محب الحسن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 1998، ص 493)

اس خط کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے سیکولر کردار پر شک کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

اس زمانے میں جو حکومت کا چلن تھا اس میں ٹیپو کے مطلق العنان ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے مگر پہلی بار ہمیں ٹیپو کے نظام حکومت میں جمہوریت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس کی حکومت میں سات محکمے تھے اور ہر محکمے کا ایک بورڈ تھا جس کا اجلاس ہوتا اور متعلقہ شعبے

ٹیپو سلطان کا کھانا سادہ، لباس سادہ اور طرز کلام نہایت شیریں اور ملائم تھا۔ ہر وقت ہاتھ میں تسبیح ہوتی۔ فجر کی نماز کے بعد پابندی سے تلاوت قرآن پاک کرتا۔ اس کی زبان سے کوئی سخت اور فحش بات نہیں نکلتی تھی۔ کسی بھی معاملے میں وہ اعتدال کا دامن نہیں چھوڑتا۔ انتہائی محنتی، فرض شناس، ملنسار اور خوش اخلاق انسان تھا۔

کے معاملات زیر بحث آتے اور اکثریت سے فیصلے لیے جاتے۔ ہر ممبر اپنی رائے تحریری صورت میں اپنے مہر کے ساتھ سیل بند کردیتا اور ضرورت پڑنے پر اسے سلطان کے پاس بھیجا جاتا۔خود سلطان کو کبھی کوئی فیصلہ لینا ہوتا تو وہ پورے دن غور وخوض کرتا پھر اپنے خاص افسروں کو بلاکر ان کی رائے جانتا۔ ان کی رائے کو ریکارڈ کرتا پھر اپنی رائے سے موازنہ کرکے کوئی فیصلہ کرتا۔

تجارت وصنعت پر اس کا کافی زور تھا اسے یقین تھا کہ تجارت میں ہی ترقی ہے۔ ٹیپو سلطان کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کے زوال کی وجہ تجارت، صنعت وحرفت سے ان کی عدم توجہی ہے جب کہ یورپی ملکوں کی ترقی اور کامیابی کا راز اس سمت میں ان کی دلچسپی ہے۔ وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ تجارت کے بہانے آئی انگریزی قوم کس طرح دن بہ دن ہندوستان کی سرزمین پر حکمراں کی شکل میں پھیلتی جارہی ہے۔

ٹیپو سلطان نے مختلف ملکوں میں Trade Centre قائم کیے جنھیں اس زمانے میں کوٹھیاں کہا جاتا تھا۔ اس نے تجارت کے لیے اپنے صوبے کے سمندری ساحلوں کا بخوبی استعمال کیا۔ غیر ملکوں میں اس نے فیکٹری قائم کرنے اور اس کے بدلے میسور میں بھی اس ملک کی فیکٹری لگانے کی تجویز اپنے سفیروں سے بھجوائی۔ خلافت عثمانیہ (ترکی) کے سامنے اس نے یہ تجویز رکھی تھی کہ۔

’’خلیفہ ٹیپو کے پاس ایسے صنعت کار بھیجے جو بندوقیں اور توپیں ڈھال سکیں، جو شیشے اور چینی کے برتن اور دوسری چیزیں بناسکیں۔ اس کے بدلے میں ٹیپو بھی ایسے کاریگروں کو جو اس کی قلمرو میں پائے جاتے ہوں اور جن کی خلیفہ کو ضرورت ہو قسطنطنیہ بھیجے گا اور یہ کہ سلطنت عثمانی کی حدود میں اسے تجارت کی سہولتیں ملیں اس کے بدلے میں ٹیپو بھی عثمانی حکومت کو اسی قسم کی سہولتیں اور رعایتیں مملکت میسور میں دے گا۔‘‘

(ایضاً،ص 188-187)

ٹیپو سلطان نے شاہ فارس کو بھی ایک خط لکھا تھا جس میں اس نے فارس کے ساتھ تجارتی روابط قائم کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور اس کے بدلے فارس کے تاجروں کو اپنے بندرگاہوں سے تجارت کرنے کی اجازت دی تھی۔ ٹیپو سلطان مختلف ملکوں میں اپنے سفیر بھیجتا اور انھیں ہدایت دیتا کہ ان ملکوں کی صنعت وحرفت، ماہرین اور انجینئر سے وہ رابطہ کریں اور ممکن ہو تو اپنے ساتھ انھیں لے آئیں۔ ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اسے تجارت کے ساتھ ساتھ سیاحت اور دوسرے ملکوں کے جغرافیائی اور سماجی و معاشی صورت حال کی جانکاری حاصل کرنے کی بھی خواہش تھی اس نے اپنے ان سفیروں کو جنھیں وہ قسطنطنیہ روانہ کیا تھا یہ بھی ہدایت دی تھی کہ — ’’وہ ان خلیج فارس کا بحری جائزہ لیں اور جن مقامات سے گزریں وہاں کے جغرافیائی، سماجی، سیاسی و معاشی حالات کا مطالعہ کریں اور اپنے تجربات کو قلم بند کرتے رہیں۔‘‘

(ایضاً،ص 187)

یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ پہلی بار ٹیپو سلطان نے حصص بازار یا شیئر مارکیٹ کی شروعات کی تھی۔ اس نے ایک تجارتی کمپنی قائم کی تھی جس کا ہر کوئی شیئر خرید سکتا تھا۔ اس میں کم رقم لگانے والے کو زیادہ منافع دیا جاتا تھا۔

ٹیپو سلطان کی مستعمل توپ

State Talent search کی اسکیم اور State selection کا باقاعدہ طریقہ کار پہلی بار ٹیپو سلطان کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے جس کی بنیاد پر ملک کے کونے کونے سے گمنامی میں پڑے ہوئے افراد کو حکومت کا عملہ اور کارندہ بنایا جاتا اور انھیں ترقی دی جاتی۔ اعتماد اور اہمیت کے حامل محکمے ایسے ہی لوگوں کو سونپے جاتے۔ ٹیپو سلطان دیسی حکمرانوں میں پہلا حکمران تھا جو اسلحے کے معاملے میں خود کفیل ہو گیا تھا۔ بیدنور اور بنگلور میں اس نے ہتھیار بنانے کا کارخانہ لگوایا تھا جہاں ہر سال ایک ہزار سے زیادہ دستی بندوقیں بنائی جاتی تھیں اور حسب ضرورت گولہ اور بارود تیار کیے جاتے۔ اس کے کارخانے میں بنائے جانے والا گولہ بارود انگریزوں کے گولہ بارود سے بہتر تھا۔

ٹیپو سلطان کو توپ بنانے میں بھی اولیت حاصل ہے۔ ایک فرانسیسی انجینئر کی مدد سے اس نے توپ کا کارخانہ بھی بنایا تھا۔ ٹیپو سلطان غالباً ہندوستان کا پہلا میزائل مین تھا جس نے طغرق نامی راکٹ بنایا تھا اور اسے انگریزوں کے خلاف استعمال کیا تھا۔

شکر قند سے بہترین شکر بنانے کی ٹیکنالوجی بھی ٹیپو سلطان نے وضع کی تھی حالانکہ اس ترکیب کو اس نے ہمیشہ صیغہ راز میں رکھا۔ بحری جنگی جہازوں کے نقشے خود بناتا اور کس دھات کی چادروں اور کون سی لکڑی کا استعمال کہاں اور کیسے ہوگا وہی طے کرتا۔ وہ بہترین معمار تھا۔ اس کے بنائے ہوئے قلعے، سرنگا پٹنم کے محل کی مسجد، مسجد اولی اور دریائے دولت باغ محل کی منقش دیواریں اور حیدر علی کا مقبرہ اس کے فن تعمیر کے بہترین نمونے ہیں۔ دریائے دولت باغ محل میں جو اس نے ایئر کنڈیشننگ کا نظام لگایا تھا وہ بھی اس وقت اپنے آپ میں ایک نئی ایجاد تھی۔ اس نے کاویری ندی کے سیلاب سے سرنگا پٹنم کو بچانے کے لیے سیلاب کنٹرول کا جو طریقہ اختیار کیا تھا آج بھی وہی طریقہ رائج ہے۔ اس نے 1791 میں سرنگا پٹنم سے چند میل کی دوری پر ایک بند تعمیر کرایا تھا جس کے پشتے کی بلندی 70 فٹ تھی۔ اس نے زیر کنٹرول علاقوں میں نہروں اور تالابوں کا جال بچھا دیا اور اس کی دیکھ بھال کے لیے الگ سے ایک محکمہ بنایا تھا۔ ٹیپو نے عراق کے نجف اشرف میں جہاں پانی کی کمی رہتی تھی، دریائے فرات سے نہر نکال کر پانی پہنچانے کی پیش کش وہاں کے سلطان سے کی تھی۔

خطاطی سے اسے گہرا شغف تھا۔ اس کے سکّے فن خطاطی کے بہترین نمونے ہیں۔ رسالہ در خط طرز محمدی کے نام سے اس نے فن خطاطی پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں فن خطاطی کے اصول وضع کیے تھے۔ یہ کتاب فارسی میں تھی۔ علم نجوم پر بھی اس نے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کا نام زبرجد تھا۔ ٹیپو سلطان ایک نئی تقویم (کلنڈر) کا بھی موجد تھا جو شمسی اور قمری برسوں سے مختلف تھا۔ اس کی شروعات سال نبوّت سے ہوتی اور اس کا نام مولودی تھا۔ یہ مولودی کیلنڈر آج بھی کرناٹک اور تمل ناڈو میں زرعی معاملات کے لیے سرکاری طور پر استعمال ہوتا ہے۔

تصوف، موسیقی، تاریخ، طب، فن حرب، قانون اور

ٹیپو سلطان کو توپ بنانے میں بھی اولیت حاصل ہے۔ ایک فرانسیسی انجینئر کی مدد سے اس نے توپ کا کارخانہ بھی بنایا تھا۔ ٹیپو سلطان غالباً ہندوستان کا پہلا میزائل مین تھا جس نے طغرق نامی راکٹ بنایا تھا اور اسے انگریزوں کے خلاف استعمال کیا تھا۔

حدیث کے موضوع پر کم و بیش 45 کتابیں اس نے اپنی سرپرستی میں تصنیف یا ترجمہ کروائیں۔ اس نے اپنی رہنمائی میں حسن علی عزت کے ذریعے 1785 میں مفتاح القلوب کے نام سے میسور کی موسیقی پر ایک کتاب لکھوائی تھی۔ ٹیپو سلطان علم و سخن کا دلدادہ تھا۔ شعرا اور ادبا اس کے دربار کی زینت تھے۔ اسے ادب سے کافی شغف تھا۔ وہ صاحب قلم تھا۔ اچھی نثر لکھتا تھا۔ شاعری بھی آسانی سے کر لیتا۔ تحفۃ المجاہدین، وقائع منزل اور احکام نامہ جیسی کتابیں اس کی نگرانی میں تصنیف ہوئی۔ ان میں بہت سے مضامین اور اشعار خود سلطان کے تصنیف کردہ ہیں۔

ٹیپو سلطان کے علم و ادب سے شغف کا یہ عالم تھا کہ اس نے جمیع الامور کے نام سے ایک یونیورسٹی قائم کی تھی۔ اس نے ایک بڑی لائبریری بھی بنا رکھی تھی جس میں تمام علوم و فنون سے متعلق کتابیں موجود تھیں۔ اس میں دو ہزار عربی، فارسی، ترکی، اردو اور ہندی کے مخطوطات تھے۔ کچھ اس کے مخطوطات ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (جسے اب ایشیاٹک سوسائٹی آف کلکتہ کہتے ہیں) کچھ کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی کو بھیجے گئے، باقی فورٹ ولیم کالج کو دے دیے گئے۔ اس لائبریری کی اردو کی کتابیں آج بھی انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہیں۔

لیکن ٹیپو سلطان کی اس بے مثل شخصیت سے خود اسے اور اس کے تعلق سے ہندوستان کو غیر معمولی نقصان بھی پہنچا۔ اس کی یہ بے شمار خوبیاں اسے سیاسی طور پر اکیلا اور کمزور کر رہی تھیں۔ نظام جیسی بے عمل حکومت اور مراٹھے جیسے متعصب حکمرانوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر ٹیپو سلطان کو برباد نہیں کیا گیا تو وہ نہ صرف ان کے خطے پر بلکہ پورے جنوبی ہندوستان پر تسلط قائم کر لے گا۔ دوسری طرف انگریزوں کو بھی یہ لگنے لگا تھا کہ ان کی راہ میں یہ نہ صرف حائل ہے بلکہ اس کو موقع ملا تو وہ انھیں اس ملک سے در بدر کر سکتا ہے۔ لہٰذا ان سب نے مل کر ٹیپو کے خلاف ایک اتحاد قائم کر لیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے پوری دنیا جانتی ہے۔

■

Dr. Sajid Husain, Dept of Urdu Dyal Singh Evening College, Lodhi Road, Pragati Vihar, New Delhi - 110003

محمد فیروز دہلوی

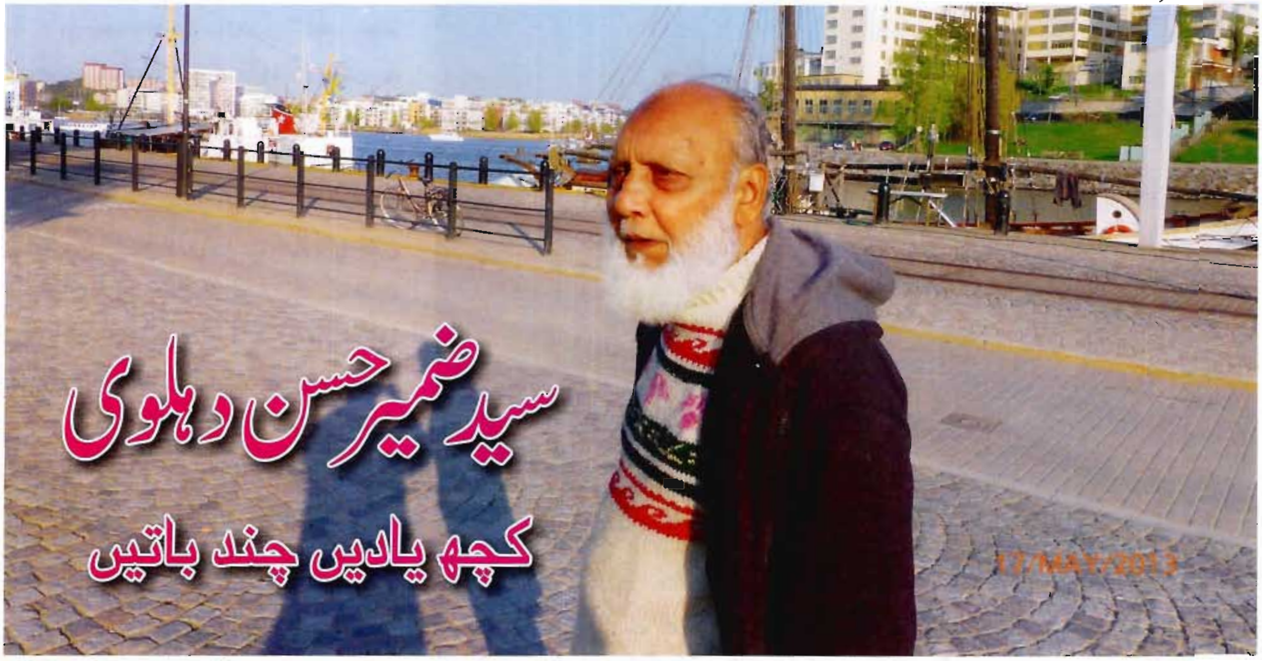

سید ضمیر حسن دہلوی

کچھ یادیں چند باتیں

جگ میں ضمیر تمھارے دم سے اجڑے دیار کا چرچا ہے
ورنہ اس کے چاہنے والے کب کے قبرستان گئے

اس شعر کے خالق ضمیر، سید ضمیر حسن دہلوی بھی 17 مئی 2014 دن کے ساڑھے گیارہ بجے دلی دروازہ کے باہر (عقب ایکسپریس بلڈنگ) واقع قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دلی کی زبان اور دہلوی تہذیب کے قصیدہ خواں، اجڑے دیار (دلّی) کے نوحہ خواں ضمیر حسن 4 مارچ 1940 کو پرانی دلی کے علاقہ کلاں محل کے ایک مہذب اور تعلیم یافتہ خاندان میں پیدا ہوئے۔ کوچہ چیلان کے پرائمری اسکول میں ابتدائی تعلیم ہوئی۔ اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول سے گیارہویں جماعت پاس کر کے اسکول ہی سے ملحق دلی کالج میں داخلہ لیا۔ پہلے پری میڈیکل اور پھر سوشل سائنس کے ساتھ بی اے کیا اور 1961 میں ایم اے (اردو) کر کے کالج ہی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوئے 31 مارچ 2005 کو اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہوئے۔

راقم الحروف 1950 سے ضمیر صاحب سے واقف تھا۔ چونکہ کچھ خاندانی قرابت داری تھی شادی وغمی پر خاندان کے دور نزدیک کے اقربا یکجا ہوتے تو ضمیر صاحب بھی اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ وہاں آتے۔ اپنے والدین کی پہلی اولاد ہونے کے باعث ہر دلعزیز تھے۔ راقم بھی بہن بھائیوں میں بڑا تھا اس لیے اکثر وبیشتر والدہ صاحبہ ساتھ لے جاتیں۔ والدہ صاحبہ یوں تو انتہائی نرم مزاج تھیں۔ لیکن بعض معاملات میں سختی سے پیش آتیں ان کا کہنا تھا جب کبھی کسی تقریب میں یا عزیز کے گھر جائیں تو ان کے ساتھ رہیں۔ اِدھر اُدھر نہ پھریں، ضمیر صاحب عمر میں مجھ سے بڑے تھے اس لیے وہ آزادی کے ساتھ ادھر ادھر گھومتے پھرتے تقریب گاہ یا کسی عزیز کے گھر کے باہر کوئی خوانچہ والا یا سودا بیچنے والا ہوتا تو اس کی بھی 'خیر خبر' لے آتے۔ لڑکپن میں جس طرح بچے کھیلتے کودتے اور شرارتیں کرتے ہیں ضمیر صاحب اس سے کوسوں دور تھے۔ عرصہ ہوا ان کی ایک تحریر پڑھی تھی وہ لکھتے ہیں کہ ''میری پیدائش مارچ 1940 کی ہے۔ اس لیے مجھے دوسری جنگ عظیم کی ہولناک تاثرات کی گھٹھری ہوئی پیدا وار سمجھیے میرا شعور گھٹنوں چلنے لگا تو اس نے تقسیم وطن کے بعد ہونے والے فسادات کا نظارہ کیا۔ چنانچہ میرے مزاج میں بچپن ہی سے خوف، کم حوصلگی اور بے دلی سما گئی۔ میں خاصا بزدل واقع ہوا ہوں اور اس بزدلی کو چھپاتا بھی نہیں کہ یہ میرے احساس کی تندی اور تیزی کی دلیل ہے بارہ برس کی عمر سے اپنے گرد وپیش سے پوری طرح باخبر ہوں۔ اتنا باخبر کہ اگر چاہتا تو شعر بھی کہہ سکتا تھا مگر یہاں میری کم حوصلگی اور تن آسانی رکاوٹ بن گئی۔ میں بنیادی طور پر جذباتی آدمی ہوں مگر میری محرومی دیکھیے کہ زندگی بھر کوئی جذباتی قدم اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکا عقل کی چناں وچنیں کا شکار رہا۔ خدا کی بزرگی اور برتری کا دل سے قائل ہوں۔ اس کی حکمتوں، تحیّر زائیوں پر نکتہ چینی کرنا میرے نزدیک عین کفر ہے اس لیے نہ دل کی بے بضاعتی اور غم کی فراوانی پر تعجب ہوتا ہے نہ اس طرفگی پر کڑھتا ہوں۔ کچھ نباہ سا کر لیا ہے۔ معیشت کے لیے کاربار وہ اختیار کیا جس میں مشقتِ مقرری کم ہے اور آسائشیں حتی المقدور، تعلیمی زندگی سائنس اور سوشل سائنس کے میدان سر کرتی ہوئی رفتہ رفتہ مادری زبان تک آ کے رک گئی، تخلیقی ذوق پیدا ہوا تو اس کی تسکین کا بھی سہل راستہ ڈھونڈ نکالا...''

احقر، ضمیر صاحب کے اس بیان سے پوری طرح اتفاق نہیں کرتا کیونکہ گزشتہ نصف صدی میں ضمیر صاحب کو قریب سے بھی دیکھا اور کچھ فاصلے سے بھی، سفر وحضر میں ساتھ رہا۔ تقریباً پچیس سال موصوف کے ساتھ درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دیئے انہیں بلند حوصلہ، نڈر بیباک اور دلیر پایا۔ انھوں نے شاعری بھی کی ان کا کلام شعری نشستوں اور مقامی مشاعروں میں بھی سنا گیا جرائد میں شائع بھی ہوا یہ الگ بات ہے کہ وہ پیشہ ور شاعر نہیں تھے۔ شوقیہ شعر کہتے تھے۔

ممکن ہے کہ مندرجہ بالا بیان میں عجز وانکسار سے کام لیا ہو۔ ہم سب جانتے ہیں کہ حالات حادثات اور سانحات آدمی کو بدل دیتے ہیں ان کے والد مرحوم سید نصیر حسن اور والدہ مرحومہ طاہرہ خاتون اصول پسند اور نظم وضبط والے تھے ضمیر صاحب اور ان کے چھوٹے بہن بھائیوں کی اس طرح تربیت کی کہ بچے ہمیشہ ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہے۔ سبھی اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب، وضعدار اور نظم وضبط کی زندگی گزارنے والے — دیکھا گیا ہے کہ جن گھروں میں والدین کے علاوہ بھی معمر لوگ ہوتے ہیں اور وہ بچوں پر نظر رکھتے ہیں وہاں چھوٹوں کے قدم ڈگمگاتے نہیں ان کے لیے زندگی گزارنے کے معیار وپیمانے مقرر ہوتے ہیں اور وہ ان

ے سرِ موانحراف نہیں کرتے۔ضمیر صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ان کا خاندان وسیع تھا (دادا، تایا چچا سبھی ایک ہی چھت کے نیچے رہتے تھے۔) لیکن حلقۂ احباب مختصر، فطرتاً کم آمیز اور کم گو، دوسروں کی زیادہ سنتے۔ خود کم بولتے، البتہ چند خاص دوستوں کی محفل میں جب کوئی غیر نہ ہو کچھ دل لگی کی باتیں ہو جاتیں۔ شائستہ لہجے میں پر لُطف فقرے۔ دوستوں کی دلچسپ گفتگو پر زیرِ لب مسکرانا اور جواباً کوئی ایسی ہی بات کہہ دینا کہ دوسرا خوش ہو جائے بدحظ نہ ہو یہی ان کا شعار تھا۔ کالج میں اسٹاف ایسوسی ایشن اور اسٹاف کونسل کی میٹنگوں میں بعض امور پر اساتذہ کے درمیان زوردار بحث ہوتی۔ کبھی کبھی بدمزگی اور تلخی کی نوبت بھی آجاتی۔ ایسے نازک مرحلوں میں ضمیر صاحب کو کبھی بہکتے اور بپھرتے نہیں دیکھا۔ وہ سنجیدگی، بردباری اور اعتدال کے ساتھ اپنا موقف بیان کرتے۔ جہاں کسی سے اختلاف کی نوبت آتی اسے بھی خوش اسلوبی سے اس طرح پیش کیا کہ مخالف پلٹ کر کچھ کہہ بھی نہیں سکا اور خاموش ہو گیا۔

یہاں میں قصیدہ خوانی نہیں کر رہا ہوں جو حقائق ہیں انھیں کم وبیش بتانے میں بخل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ بشرطیکہ ان سے کردارکشی نہ ہو۔ضمیر صاحب کی زندگی کے چند ایسے واقعات بھی ہیں جن کا چشم دید گواہ یہ راقم بھی ہے یہاں ان واقعات کے دہرانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ضمیر صاحب دلی کالج میں بی اے کے طالب علم تھے اور راقم اینگلو عربک اسکول کی دسویں کلاس میں۔کلاس روم کی کھڑکیاں کالج لائبریری کے سامنے کھلتی تھیں۔کلاس روم اور لائبریری کے درمیان کافی چوڑا کھلا راستہ اور اس میں پرنسپل روم کے سامنے 'شجر تمنا' (اس درخت کی اپنی الگ کہانی ہے) اس کلاس اور اس سے ملحق دوسری کلاس کے طلبہ کالج میں پڑھنے والے طلبا وطالبات کی حرکات وسکنات کا نظارہ کرتے۔ ایک روز دیکھا ضمیر صاحب کی پیشانی پر پٹی بندھی ہوئی ہے دائیں جانب بوشرٹ پر خون بھی نظر آیا۔ تشویش ہوئی کہ یہ کیا ماجرا ہے اردو گرد چند طلبہ، عمر کے تفاوت کے باعث کسی سے پوچھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اگلے روز معلوم ہوا کہ کسی لڑکے سے جھگڑا ہوا تھا اور نوبت ہاتھا پائی تک آگئی۔ تعجب ہوا کہ ضمیر صاحب اور جھگڑا...... عرصہ تک تفصیلات معلوم نہ ہوسکیں۔ یہ پندرہ سولہ برس پہلے کی بات ہے کہ حیدرآباد میں این سی ای آر ٹی کی ایک ورکشاپ میں دیگر شرکاء کے ساتھ ہم دونوں بھی مدعو تھے۔ حیدرآباد کے ایک ہوٹل میں قیام تھا۔ضمیر صاحب احقر کے روم پارٹنر تھے۔شب میں کھانے کے بعد ہوٹل کے لان میں ہم لوگ ٹہلتے تھے۔ ایک روز دریافت کیا کہ "ضمیر صاحب جب آپ بی۔اے میں پڑھتے تھے تو کسی لڑکے سے آپ کا جھگڑا ہوا تھا ہم نے آپ کے سر پر پٹی بندھی ہوئی دیکھی تھی۔ ضمیر صاحب مسکرائے اور پھر گویا ہوئے یہ تو بہت پرانی بات ہے آپ کو ابھی تک یاد ہے......"

"بات ہی کچھ ایسی تھی یاد کیوں نہ رہتی......" راقم کا جواب سن کر ضمیر صاحب سنجیدہ ہو گئے بھئی ٹھیک کہتے ہیں بعض باتیں آدمی کبھی نہیں بھولتا، ہوا یہ کہ سیکنڈ ایئر کا ایک لڑکا بہت بدتمیز تھا بیگ صاحب (پرنسپل دلی کالج) کئی بار تنبیہ کر چکے تھے۔ مگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا تھا۔ اس دن کینٹین کے پاس ہمارے سامنے ایک لڑکی پر فقرے کسے۔ لڑکی نے کچھ کہا جواب میں لڑکے نے نازیبا کلمات ادا کیے۔ لڑکی رو پڑی تب میں نے لڑکے کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ بدکلامی کرنے لگا۔ لڑکی نے جب یہ دیکھا تو وہ پرنسپل روم کی جانب بھاگی تا کہ بیگ صاحب سے شکایت کرے۔ یہ دیکھ کر لڑکے نے میرا گریبان پکڑ کر ہاتھ اٹھانا چاہا تھا کہ چند سینئر لڑکے بھی وہاں آگئے بیچ بچاؤ کی کوشش کی اس نالائق نے گریبان چھوڑ کر زور سے دھکا دیا اور میاں ہمارا سر سامنے لگے درخت سے ٹکرایا۔ نتیجہ میں سر پر زخم آیا اور پٹی بندھی۔ بعد ازاں بیگ صاحب نے دونوں کو بلایا اور اس لڑکے کو کالج سے نکال دیا بیگ صاحب نے ہم سے کہا "ضمیر تمہیں اپنا کیریئر بنانا ہے ڈھول ڈھپے سے دور رہا کرو۔ تم لڑکی کی حمایت میں بولے یہ اچھا کیا آئندہ ہاتھا پائی کی نوبت نہ آئے۔" بس اتنی سی بات تھی جس کا بتنگڑ بنا دیا گیا اور کالج میں مشہور ہو گیا کہ یہ رقابت کا معاملہ تھا۔ بھائی ہم بھی اولادِ آدم ہیں ہمارے سینہ میں بھی دل دھڑکتا ہے۔ کو ایجوکیشن میں سب ساتھ پڑھتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کسی لڑکے کا کسی لڑکی سے کوئی نہ کوئی تعلق ہو۔ اس وقت کالج میں کئی حسین اور طرح دار لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ ایک صاحبہ تھیں لطیف فاطمہ بلا کی خوبصورت، لیے دیے رہتیں۔ فلاسفی کی اسٹوڈنٹ سیدھا آنا سیدھا جانا معلوم ہوا کہ بیگ صاحب کے کسی واقف کار کی صاحبزادی ہیں۔ کالج میں آمد کا وقت مقرر تھا۔ لڑکے ایک جھلک دیکھنے کے لیے دو رویہ کھڑے ہو جاتے ہم بھی یہ تماشا دیکھتے ایک روز بیگ صاحب سے کسی کاغذ پر دستخط کراتے تھے پرنسپل روم میں پہنچے تو لطیف فاطمہ پہلے سے وہاں موجود تھیں بیگ صاحب نظریں جھکائے فائل پڑھ رہے تھے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا پھر فائل بند کیا، مخاطب ہوئے فاطمہ! انہیں جانتی ہو؟

"سر شاید یہ بھی اسٹوڈنٹ ہیں" "یہ ضمیر حسن ہیں ان سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں ایک روز کالج کا نام روشن کریں گے..." بھئی ہم دفتر سے باہر آئے بیگ صاحب کا جملہ ذہن میں گونجتا رہا۔ ایک دو روز بعد دیکھا سامنے سے لطیف فاطمہ آرہی ہیں قریب آکر آداب کہا اور کلاس میں چلی گئیں اب یہ معمول ہو گیا کہ جب دیکھتیں کبھی آداب کبھی سلام— سلام کا جواب دیتے وقت کچھ خفت محسوس کرتے کیونکہ جونیئر اور سینئر اسٹوڈنٹ ہمیں دیکھ کر مسکراتے کبھی کوئی اشارہ بھی کرتا۔ دو تین ہفتے گزرے ہوں گے کہ چرچے ہونے لگے ضمیر بھی پٹری سے اُتر گئے کسی کی زلف کے اسیر ہو گئے۔ فکر لاحق ہوئی کہ بیگ صاحب اور گھر تک بات پہنچی تو خیر نہیں۔ اب ہم لطیف فاطمہ کو دور سے دیکھ کر کسی دوسری سمت چلے جاتے تا کہ آمنا سامنا نہ ہو اس روز بیگ صاحب تعارف نہ کراتے تو اس علیک سلیک کی نوبت ہی نہیں آتی۔ بی۔اے کا فائنل ایر تھا امتحانات کے بعد لطیف فاطمہ کالج میں نظر نہیں آئیں۔ اللہ اللہ خیر سلّا"

"بعد میں موصوفہ کہیں نظر آئیں......؟ اس استفسار پر ضمیر صاحب نے بتایا کہ بیگ صاحب ہی نے اپنے ایک شناسا سے ان کی شادی کرادی تھی غالباً پشاور کے رہنے والے تھے عرصہ سے دہلی میں رہتے تھے تاج محمد خاں، میر صاحب کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔ ایک دو بار کناٹ پیلس اور قرول باغ میں انھیں دیکھا۔ کناٹ پیلس میں اپنے شوہر کے ساتھ کافی ہاؤس کے باہر نظر آئیں بڑے تپاک سے ملیں اور میر صاحب سے تعارف کرایا "یہ بھی دلی کالج میں پڑھتے تھے اور بیگ صاحب کے چہیتے اسٹوڈنٹ ہیں۔"

آپ کو ایک اور بات بتادوں کہ آج کے مشہور اداکار شاہ رخ خان ان کے ہی صاحبزادے ہیں ایک بار بمبئی میں شاہ رخ سے ملاقات ہوئی تو انھیں بتایا کہ ان کی والدہ صاحبہ ہمارے ساتھ کالج میں پڑھتی تھیں۔ بہت خوش ہوا اور اپنا پرسنل نمبر دیا کہ اب جب بھی بمبئی آئیں تو فون کریں میں گھر پر اپنے بچوں سے ملاقات کراؤں گا...... اس وقت میرے بیٹے مونس وہاں پی ایچ ڈی کر رہے تھے میں کئی بار بعد میں بمبئی گیا لیکن کبھی شاہ رخ کو فون نہیں کیا دیکھا چھوٹے بڑے شاہ رخ کے دیوانے ہیں ایک نظر دیکھنے کے لئے گھنٹوں کھڑے رہتے ہیں۔"

قارئین! بات ضمیر صاحب کی دوران طالب علمی سے شروع ہوئی تھی اور پہنچی شاہ رخ خاں تک اب ہم

پیچھے لوٹتے ہیں۔ 1961 میں ایم اے (اردو) کیا تھا کہ بیگ صاحب نے شعبۂ اردو میں لیکچرر مقرر کردیا۔ اللہ بیگ صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ان کا قاعدہ تھا کہ دلی کالج کا جو طالب علم ایم اے فرسٹ کلاس لاتا تھا اسی شعبہ میں بحیثیت لیکچرر اس کا تقرر کرتے اگر ایک سے زاید ہوتے تو جس کے نمبر دوسروں سے زیادہ ہوتے تو اسے ترجیح دیتے۔ لیکچرر شپ کے لیے جو سلیکشن کمیٹی ہوتی ہے عام طور پر اس میں متعلقہ شعبہ کے صدر (دلی یونیورسٹی) سبجیکٹ ایکسپرٹ اور وی سی کے نمائندے (Nominee) ہوتے ہیں۔ ضمیر صاحب کی سلیکشن کمیٹی میں صدر شعبۂ اردو خواجہ احمد فاروقی صاحب تھے انہوں نے انٹرویو ختم ہونے کے بعد ضمیر صاحب کو نا اہل قرار دیتے ہوئے کسی دوسرے امیدوار کا نام پیش کیا مگر بیگ صاحب کے آگے ان کی ایک نہ چلی اور ضمیر صاحب کا تقرر ہوگیا۔ ضمیر صاحب کا کہنا تھا کہ جس وقت جوائن کرنے کے لیے بیگ صاحب کے کمرے میں پہنچا تو انہوں نے مجھے گلے لگایا اپنے سامنے کرسی پر بٹھایا کوکا کولا منگائی اور کہا ''آج سے تم ٹیچنگ اسٹاف میں ہو خواجہ صاحب کیا سوچتے ہیں اور کہتے ہیں میں اُس سے اتفاق نہیں کرتا۔ اب تمہیں یہ ثابت کرنا ہے کہ دلی کالج کی اس پوسٹ کے لیے تم ہی صحیح امیدوار تھے۔'' ضمیر صاحب نے بیگ صاحب کی بات گرہ میں باندھی اب وہ پہلے سے زیادہ سنجیدہ ہوگئے۔ ضمیر صاحب بتاتے ہیں کہ جوائن کرنے کے بعد جب اسٹاف روم میں پہلا قدم رکھا تو ٹانگیں کپکپاری تھیں۔ وہاں سبھی سینئر استاد تھے اور ضمیر صاحب ان ہی کے سامنے کے طالب علم، اس وقت شعبۂ اردو میں جاوید وششٹ صاحب، ظہیر احمد صدیقی صاحب پہلے سے موجود تھے۔ چند ماہ قبل ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا بحیثیت لیکچرر تقرر ہوا تھا۔ جاوید وششٹ صاحب نے اپنے عزیز شاگرد ضمیر حسن صاحب کا سب سے تعارف کرایا مبارک سلامت کے بعد بزرگوں کے مشفقانہ کلمات نے حوصلہ بخشا۔ کلاسیں پڑھانا شروع کیں اور چند ماہ میں ایک مقبول استاد بن گئے۔ پڑھانے کے ساتھ لکھنا بھی شروع کیا۔ ہونہار طلبہ کی سرپرستی کی، بیت بازی، غزل سرائی، ڈبیٹ اور ریڈیو ٹاک کی تیاری کرائی۔ پوری محنت اور لگن کے ساتھ درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی بنیادی طور پر تحقیق کے آدمی تھے۔ انھوں نے ضمیر صاحب کو تحقیق کے لیے اکسایا۔ 1964 میں ضمیر صاحب نے ''دہلی میں اردو نثر کا ارتقا 1900 سے 1947ء تک'' کے عنوان سے دلی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹریشن کرایا۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی ان کے نگراں تھے۔ خواجہ صاحب اب ان کی صلاحیتوں کے معترف تھے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ضمیر صاحب نے کام بھی شروع کیا لیکن بوجوہ پی ایچ ڈی کا یہ مقالہ مکمل نہ ہوسکا۔

1969 میں ضمیر صاحب کی شادی دلی کے ایک متمول گھرانے میں ہوئی۔ اہلیہ پڑھی لکھی، سمجھدار سلیقہ شعار نیک خاتون، صحیح معنوں میں شریک حیات، اللہ نے انھیں ایک بیٹی تابندہ دو بیٹے ابوذر مونس اور انس تبریز سے نوازا۔ ضمیر صاحب پرانی دلی میں بلبلی خانے کے ایک بالا خانے میں رہتے تھے۔ خود پہلے سے نظم وضبط کے عادی تھے بچوں کی بھی اسی طرح تربیت کی۔ کفایت شعاری اور منصوبہ بندی سے زندگی گزارنے کا ایک فائدہ

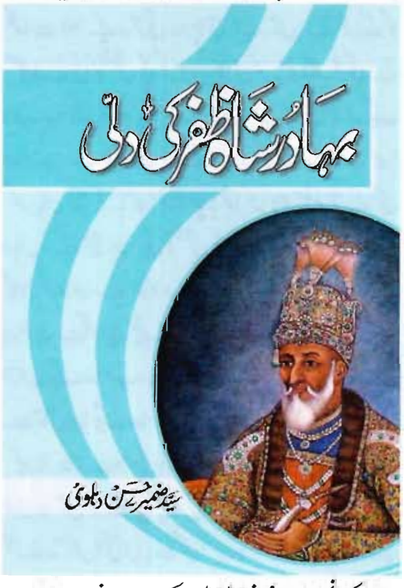

یہ ہوا کہ انھوں نے نوئیڈا میں ایک پلاٹ خریدا۔ احباب کو پلاٹ دکھانے لے گئے تو تعجب ہوا کہ ضمیر صاحب جو پرانی دلی کے باسی اور مجلسی زندگی کے عادی ہیں کس طرح اس ویرانے میں رہیں گے۔ مگر ضمیر صاحب نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ یہاں مکان ضرور بنائیں گے اور پھر یہیں آکر رہیں گے کیونکہ پرانی دلی کی جن پرسکون گلیوں اور محلوں میں وہ پلے بڑھے تھے اب وہاں ہر وقت شوروغل، کارخانے فیکٹریوں نے پورا ماحول آلودہ کردیا تھا۔ شہر کی آبادی ہر پل بڑھ رہی تھی اور دلی کے مضافات میں نئی نئی کالونیاں وجود میں آرہی تھیں اور اس سب کی دین نوئیڈا کا وہ ویرانہ تھا جہاں آج رہائشی اور کمرشیل علاقوں کی قیمت دلی سے کہیں زیادہ ہے۔ سیکٹر 26 میں لب سڑک ضمیر صاحب کا ذاتی مکان تعمیر ہوا انھوں نے اس کا نام 'دہلویز' (Dehlavies) رکھا 1987 میں وہاں منتقل ہوگئے۔ کالج پرانی دہلی میں اور قیام گاہ نوئیڈا میں بسوں سے آمد ورفت آنے جانے کی صعوبت برداشت کی مگر ہمیشہ وقت پر کالج پہنچے۔ کبھی بسوں کی تاخیر یا خرابی کا شکوہ نہیں کیا۔

ادھر ادھر کی باتیں تو بہت سی ہوگئیں جو سید ضمیر حسن سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن ''سید ضمیر حسن دہلوی'' کا وہ روپ سامنے نہیں آیا جس سے وہ جانے پہچانے جاتے ہیں اور ان کی وفات کے بعد بھی لوگ انھیں یاد کرکے آبدیدہ ہیں۔

یہ ضمیر صاحب ہی نے بتایا تھا کہ اردو ایم اے کے زمانے میں انھوں نے انشائیے لکھنے شروع کیے تھے بزم ادب کی ایک مجلس میں بیگ صاحب نے ان کا انشائیہ سنا تو انہیں اپنے دفتر میں بلا کر تاکید کی کہ ''مرزا فرحت اللہ بیگ، ملا واحدی، خواجہ حسن نظامی، اشرف صبوحی، خواجہ محمد شفیع اور شاہد احمد دہلوی کی تحریروں کو بغور پڑھو۔'' اور آئندہ جو کچھ لکھو ایک نظر مجھے دکھا دو چنانچہ ضمیر صاحب نے ایسا ہی کیا۔ بیگ صاحب کے ساتھ ساتھ شعبۂ اردو کے سینئر استاد اور ڈاکٹر شیو پرشاد جاوید وششٹ نے بھی ان کی سرپرستی کی۔

ولی کے بزرگوں کی تحریروں نے انھیں اس قدر متاثر کیا کہ وہ اس رنگ میں رنگ گئے خود ہی کہتے ہیں کہ ''انشائیے کا مطالعہ کیا، مزاح نگاروں کو پڑھا، طبیعت ذرا سنبھلی۔ یہ کام نسبتاً آسان لگا۔ آہستہ آہستہ لکھنا بھی شروع کیا۔ محنت سے زیادہ داد ملنے لگی انشائیے کے ذیل میں اتفاقاً دلی کی مخصوص نثر بھی سامنے آئی۔ روزمرہ بچپن سے کان میں پڑی تھی۔ دلی کے روڑے تھے۔ جی چاہا کہ اس میں کچھ لکھا جائے۔ گھٹنے پیٹ کی طرف جھکتے ہیں۔ لکھنا شروع کیا تو بس اس کے ہوگئے۔'' دوران طالب علمی اور تدریسی فرائض انجام دیتے ہوئے ضمیر صاحب نے کئی افسانے لکھے جو ہندوپاک کے جرائد میں شائع ہوئے۔ لیکن جو شہرت اور مقبولیت انشائیوں خاکوں اور دلی کی تہذیب پر لکھے گئے مضامین سے ملی۔ وہ ضمیر صاحب کے افسانوں کو نہ مل سکی۔ ضمیر صاحب کے بیشتر مداح اس سے بھی واقف نہیں کہ انھوں نے کبھی افسانے بھی لکھے تھے۔ حالانکہ ان کے افسانوں ''میں نے ایک عورت دیکھی'' ستوانسے شہزادے اور 'موہنا' کے کچھ دن چرچے بھی ہوئے۔

سید ضمیر حسن دہلوی کی تصنیف وتالیفات پر ایک نظر ڈالیں تو ان کی پہلی کتاب 'فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ' 1963 میں شائع ہوئی۔ نصابی ضرورت کے تحت لکھی گئی اس کتاب میں زبان وبیان اور لکھنوی تہذیب کا جائزہ لیا گیا تھا اور فسانۂ عجائب کے حقیقی مرتبہ سے روشناس کرایا گیا۔

دوسری کتاب 'دلی سے دلی تک' انشائیوں اور خاکوں کا مجموعہ ہے یہ کتاب 1964 میں شائع ہوئی اس

کے بیشتر انشائیے اور خاکے رسائل میں پہلے ہی شائع ہوچکے تھے مگر کتاب میں یکجا ہونے پر کتاب مقبول ہوئی اور یہیں سے سید ضمیر حسن دہلوی کی الگ شناخت بنی، تیسری کتاب 'دلی والے' 1967 میں منظر عام پر آئی اسی میں دلی کے معروف اور غیر معروف شخصیتوں پر لکھے گئے خاکے تھے۔ 1968 میں ضمیر صاحب نے میر باقر علی داستان گو کی کتاب ''خلیل خاں فاختہ مرتب کی۔ 1970 میں دلی کے معروف عالم دین اور مجاہد آزادی سحبان الہند مولانا احمد سعید کے مکاتیب مرتب کیے۔ مولانا موصوف سے ضمیر صاحب کی قرابت داری بھی تھی۔ 1972 میں 'غالب کی دلی' شائع ہوئی۔ اسی کتاب پر یوپی اردو اکادمی سے انعام ملا۔

ضمیر صاحب نے اردو اکادمی دلی کے لیے سید وزیر حسن کی کتاب 'دلی کا آخری دیدار' اور علامہ راشد الخیری کی کتاب، 'دلی کی آخری بہار' مرتب کی یہ کتابیں بالترتیب 1985 اور 1987 میں منظر عام پر آئیں علاوہ ازیں اردو اکادمی نے ضمیر صاحب کی کتاب 'دہلوی اردو' بھی شائع کی اس کتاب میں اردو کی ابتدا سے ارتقا تک اور مغلیہ عہد میں دہلوی اردو کی نشوونما کا جائزہ پیش کیا ہے۔

2008 میں انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی نے 'دہلی کے محاورے' شائع کی یہ دراصل دہلوی محاورات اور کہاوتوں کی لغت ہے۔ یہی ضمیر صاحب کی آخری کتاب بھی ہے اس دوران بعض کتابوں کے نئے ایڈیشن بھی ترمیم واضافے کے ساتھ منظر عام پر آئے۔ افسانوں کا مجموعہ 'میں نے ایک عورت دیکھی' 1996 میں طبع ہوا اس کا دوسرا ایڈیشن 2006 میں 'دلی والیاں' کے عنوان سے اشاعت پذیر ہوا۔ دلی سے دلی تک کا نیا ایڈیشن 2009 میں منظر عام پر آیا تو اس میں انشائیوں اور خاکوں کے ساتھ دہلی کی تہذیب اور معاشرتی زندگی پر لکھے گئے مضامین بھی شامل کیے گئے اس کتاب کا نام اب 'بہادر شاہ ظفر کی دلی' ہے۔

ضمیر صاحب نے نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی کے لیے کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ اور دلی کی تہذیب ومعاشرت پر انگریزی میں مضامین لکھے جو انگریزی روزناموں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا احمد سعید دہلوی کے ناول 'شوکت آرا بیگم' کو بھی ضمیر صاحب نے ہی ایڈٹ کیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ سید ضمیر حسن دہلوی نے نثر ونظم میں جو کچھ بھی لکھا اس کا مرکز ومحور فصیل بند شہر (شاہجہاں آباد) ہی رہا۔ ان کے افسانوں کے کردار یا واقعات

ہوں یا انشائیے سب میں اسی قدیم شہر کے ہنستے بولتے خوشحال اور ملول افراد، معاشرت کے رنگ، رسم ورواج، میلے ٹھیلے، تیج تہوار ہر جگہ نمایاں ہیں ان کی تحریروں کا حسن دلی کا روز مرہ محاورے اور چٹخارے دار زبان ہے ایسی زبان جو مرزا فرحت اللہ بیگ، اشرف صبوحی، شاہد احمد دہلوی اور مرزا محمود بیگ کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔

سید ضمیر حسن دہلوی کو خود بھی اس کا احساس تھا انھوں نے اپنی ایک تحریر میں بیان کیا ہے۔

''احباب میرے اکثر مجھ سے کہتے ہیں کہ تو دلی کی زبان بولتا ہے لہجے میں کوثر وتسنیم کی روانی اور قند ونبات کی مٹھاس ہے میں بھلا اس ضمن میں کیا عرض کروں۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ اسے الطافِ رحمانی سے تعبیر کروں تو بجا ہے اور فیضان خاکِ پاک دہلی کا کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔''

اردو اکادمی دہلی نے 1995 میں ضمیر صاحب کو تخلیقی نثر کے ایوارڈ مبلغ 21 ہزار روپے سے نوازا۔ ضمیر صاحب اب ہمارے درمیان نہیں رہے ان کی جس قدر زندگی احقر کے سامنے ہے بلا تکلف کہہ سکتا ہوں کہ ضمیر صاحب نے ہر اعتبار سے بھرپور اور پرُمسرت زندگی بسر کی۔ خوشحالی، شہرت اور مقبولیت ان کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ انھوں نے سیر وسیاحت کا لطف اُٹھایا۔ اپنی بیٹی بیٹوں کی شادی بیاہ سے پہلے ہی فارغ ہوچکے تھے۔ حج وعمرہ کی سعادت حاصل کی۔ گزشتہ سال دو ماہ اپنے بڑے بیٹے ابوذر مونس کے ساتھ اسٹاک ہوم (سویڈن) میں رہے۔ جہاں وہ مارکیٹنگ ڈائریکٹر ہیں۔ چھوٹے بیٹے انس تبریز جو انھیں کے ساتھ نوئیڈا میں رہتے ہیں ذاکر حسین پوسٹ گریجویٹ کالج کے شعبۂ انگریزی میں لیکچرر ہیں۔

مضبوط کاٹھی، بھرے پرے جسم والے ہمیشہ تندرست اور صحت مند نظر آئے لیکن قدرت کا عجب نظام ہے۔ ہر کمال کا زوال ہے۔ معلوم ہوا 28 اپریل کو اچانک گھر پر طبیعت خراب ہوئی فوراً ڈاکٹر سے رجوع کیا گیا۔ علاج شروع ہوا۔ افاقہ نہ ہونے پر یکم مئی کو کیلاش ہسپتال (نوئیڈا) میں داخل کیا گیا۔ کچھ فالج کا اثر تھا بعد ازاں ڈاکٹروں نے بتایا برین ہیمبرج ہوا ہے 3 مئی کو ڈاکٹر مظہر احمد نے انس کے حوالے سے خبر دی۔ یقین نہیں آیا ابھی دو مہینے پہلے کی بات ہے غالب اکیڈمی (نئی دلی) میں 'غالب کی دلی اور دلی والے' کے موضوع پر ایک روزہ سیمینار تھا۔ پہلے اجلاس میں ضمیر صاحب اور احقر دونوں اسٹیج پر موجود تھے۔ سر پر گرم ٹوپی شیروانی اور تنگ مہری کا پاجامہ پہنے ہوئے چہرے پر بشاشت تھی۔ حج کرکے لوٹے تھے تو داڑھی کا اضافہ ہوگیا تھا اب وہ پہلے سے زیادہ سفید اور گھنی تھی کئی ماہ بعد ملاقات ہوئی تھی اس لیے اجلاس ختم ہونے پر اسٹیج سے اُتر کر اگلی صف کی کرسیوں پر آبیٹھے۔ ضمیر صاحب نے میری کتاب 'دلی اور دلی والے' (چند تہذیبی مرقعے) کے تعلق سے استفسار کیا۔ بتایا کہ علالت کے باعث ابھی پوری نہیں کرسکا دو تین ماہ میں کتاب انشاء اللہ پریس میں چلی جائے گی۔ فرمایا ''جو بھی لکھنا ہے لکھ ڈالو میاں ہمارے بعد سناٹا ہے دلی کے تعلق سے کہنے سننے والے لوگ کتنے رہ گئے ہیں...' 17 مئی کو صبح ساڑھے آٹھ بجے جب یہ خبر ملی کہ رات کو بارہ بجے ضمیر صاحب نے اس دارفانی سے کوچ کیا تو اس سناؤنی سے واقعی سناٹا چھا گیا!!

کسے معلوم تھا کہ یہ ہم دونوں کی آخری ملاقات ہوگی اب غالب کا یہ شعر بار بار یاد آرہا ہے:

ہاں، کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

■

Mohd Feeroz Dehlavi, 1730, First Floor, Koocha Dakhni Rai, Darya Ganj, New Delhi - 110002

ندیم صدیقی

اردو طباعت و اشاعت کا مسیحا

احمد مرزا جمیل

راقم نے کم وبیش 25 برس اُردو اخبارات میں گزارے ہیں اورصرف کاتبوں کے تجربات پر ایک الگ سے مضمون لکھا جاسکتا ہے۔

اخبارات کے دفتر میں کاتبوں کا بول بالا نہیں بلکہ ان کی حکمرانی تھی ایک روایت ہے کہ اخباری دفتر میں کاتبوں کے لیے پینے کے پانی کا گھڑا (مٹکا) ٹوٹ گیا تھا، جسے دوتین دن ہوچکے تھے۔ انتظامیہ کو اطلاع دی جاچکی تھی مگر کوئی توجہ نہیں دی گئی تو اچانک ایک رات 8 بجے کے بعد کاتبوں نے اپنے اپنے قلم دان سمیٹ لیے اور منتظمِ اعلیٰ کو بلا کر اُسی وقت گھڑے منگوانے کی وارننگ دی کہ جب تک گھڑے نہیں آئیں گے کاتب قلم نہیں اٹھائیں گے۔ ذمے دار نے بڑی منت سماجت کی کہ اب رات میں کہیں گھڑے نہیں مل سکتے ۔کل صبح اوّل وقت میں گھڑے منگوا لیے جائیں گے مگر کاتبوں نے ایک نہ سنی۔ چارو ناچار آدمی دوڑائے گئے۔ کسی گھڑے والے کے گھر کا پتہ لگایا گیا اور اس کی دُکان کھلوا کر، ڈیڑھ گھنٹے میں گھڑے دفتر میں پہنچائے گئے۔

اس واقعے کو یہاں درج کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کل کسی بھی اُردو اخبار یا اشاعتی ادارے میں کاتب کی کتنی اہمیت یا ضرورت تھی اور کاتبوں کو اس اہمیت کا کتنا احساس تھا اور وہ اپنی بات کیسے منوانے پر قادر تھے، ورنہ تو اگلی صبح اخبار کا بازار میں آنا، ممکن ہی نہیں تھا، کاتبوں کے تعلق سے ایسے ایک نہیں کئی واقعات ہیں۔ مختصر یہ کہ اُردو کی کوئی بھی اشاعت چاہے وہ اخبار کی شکل میں ہو، رسالے یا کتاب کی شکل میں، کاتب کے بغیر اُس کا وجود ناممکن تھا۔

اس صورت حال میں کسی رسالے، کسی کتاب کا بہ عجلت چھپنا بھی ایک کارِ محال تھا۔ اُس زمانے میں اُردو کا ٹائپ بھی بنایا گیا، مولانا ابوالکلام آزاد کے پرچے اس میں چھپے بھی مگر اُردو والوں نے اُسے قبول نہیں کیا۔ کتابت کے حوالے سے مولانا آزاد کے تاثرات بھی تاریخ کا حصہ ہیں، بزرگوں سے روایت ہے کہ مولانا آزاد کہتے تھے کہ جب تک اُردو کتابت، مشینی طور اختیار نہیں کی جائے گی تب تک اردو اور اس کی طباعت ترقی نہیں کرسکتی۔ یہ بات صحیح بھی ثابت ہوئی۔

اُردو روزناموں کے عملے میں سب سے بڑی نفری کاتبوں ہی کی ہوتی تھی۔ مجال تھی کہ کوئی اُن سے اختلاف کرے۔ اچھے اچھے شاعر و ادیب بھی اُن کے رعب میں رہتے تھے۔

یہاں اس کا اعتراف نہ کرنا خلافِ حق ہوگا کہ کتابت کے شعبے میں ایسے ایسے فنکار بھی تھے کہ جو اپنا جواب آپ تھے۔ کوئی اُردو پریس ایسا نہیں تھا جہاں اُردو کاتب نہ ہوں۔ ان میں سب 'فنکار' تھے؟ ایسا نہیں تھا مگر اس طرح بہت سے لوگوں کی روزی روٹی چلتی تھی اور اُردو کی طباعتی دُنیا انھی کاتبوں کی رہینِ منت رہی۔

دکن کے حکمراں اُردو دوستی کے لیے مشہور ہیں انھوں نے بھی اس ضمن میں ماہرین کو کام سے لگایا مگر نستعلیق کا ٹائپ نہیں بننا تھا، نہ بن سکا۔

وہ جو کہا جاتا ہے کہ قدرت کی طرف سے ایک وقت متعین ہوتا ہے۔ بشرطیکہ آدمی کوشش میں لگا رہے کہ کوئی کوشش رائیگاں نہیں جاتی۔ اس کی واضح مثال ہمارے عہد میں کمپیوٹر کے ذریعے کتابت کے حوالے سے احمد مرزا جمیل کی ہے۔

1980 کے آس پاس کا زمانہ تھا جب یہ مژدہ سنا گیا کہ جلد ہی اردو زبان دستی کتابت کی زنجیر سے آزاد ہوجائے گی۔

اُردو کے کاتبوں وغیرہ نے جب یہ خبر سنی تو ہونہہ کے ساتھ کہا: ''یہ کیسے ممکن ہے کہ نستعلیق کتابت، مشین کے ذریعے ہو...........!! اس کا بھی حشر وہی ہوگا جو اُردو کے نسخ ٹائپ کا ہوا۔''

اس ناممکن کو ممکن بنانے والے احمد مرزا جمیل تھے۔ اُن کے تعلق سے ہم نے اب تک جو کچھ پڑھا ہے اس کا اِجمال یوں ہے۔ 21 فروری 1921 کو محلے چتلی قبر (دہلی) میں پیدا ہونے والے احمد مرزا جمیل کے والد نور احمد اپنے وقت کے صاحبِ طرز طغرا نویس ہی نہیں تھے بلکہ نقاشی، مصوری اور خوش نویسی ان کا ذوق وشوق تھا۔ احمد مرزا جمیل کو یہ سب خوبیاں ورثے میں ملی تھیں، ان کا خاندان تلاشِ معاش میں دہلی سے ممبئی آ گیا اور پھر ممبئی کے مشہور جے جے اسکول آف آرٹس میں احمد مرزا جمیل نے تعلیم حاصل کی گویا اُنھیں اسکول آف آرٹس میں اپنی وراثت کو باقاعدہ ایک فن کی طرح سیکھنے کا موقع ملا۔ اس طرح احمد مرزا جمیل کے فنی شعور نے جِلا پائی۔ طالب علمی کے زمانے میں مصوری کے مقابلوں میں انھوں نے صرف حصہ ہی نہیں لیا بلکہ فتح بھی اُن کا نصیب بنی۔ وہ 1945 تک ممبئی میں رہے اور فلموں میں ڈیزائنر کے طور پر کارکردگی انجام دی، پھر کولکاتا میں بھی اسی شعبے میں کام کیا۔ قدرت کے پروگرام عجب ہوتے ہیں، وہ پیدا کہیں کرتی ہے، تربیت کسی اور مقام پر کرتی ہے اور اصل کام جو کسی کے وہم وگمان میں نہیں ہوتا وہ کہیں اور لیتی ہے۔ 1950 میں حالات نے اُنھیں (احمد مرزا جمیل کو) پاکستان ہجرت پر مجبور کیا۔

کراچی کی ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں آرٹ ڈائریکٹر کے طور پر اُنھیں ملازمت ملی، انھی دنوں احمد مرزا جمیل نے بانیِ پاکستان محمد علی جناح کا وہ پورٹریٹ بنایا، جو گزشتہ 6 دہائیوں سے تواتر کے ساتھ پاکستان بھر میں

چھپ رہا ہے۔ واضح رہے کہ اس اسکیچ کو نقادانِ فن نے شاہکار قرار دیا ہے۔

بعد میں کراچی ہی میں انھوں نے اپنا ذاتی اشاعتی ادارہ ایلیٹ پبلشرز کے نام سے قائم کیا، جس نے اشاعتی میدان میں بڑا نام کمایا۔

دیکھا جائے تو یہ ساری کارکردگی ان کے اُس کارنامے کی تمہید تھی، جس کے لیے قدرت نے انھیں منتخب و مرتب کیا تھا۔ روایت ہے کہ 1960 کے آس پاس کا زمانہ تھا، احمد مرزا جمیل اپنے ندیم دیرینہ سید مطلوب الحسن زیدی جو طباعتی شعبے کی ایک ماہر شخصیت کے طور پر کراچی میں معروف تھے، اُن سے خطِ نستعلیق کے میکانیکی مسئلے پر اکثر بحث و مباحثہ کرتے اور چند ناکام تجربے بھی کیے، بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ حروف کے ٹکڑوں کے بجائے، لخت لخت الفاظ بنائے جائیں یعنی لفظوں کو یونٹ کی شکل دے دی جائے۔ مثلاً 'پز' لکھنا ہے تو 'پ' اور 'ز' کو جدا نہ کیا جائے بلکہ 'پز' ہی کا یونٹ بنا دیا جائے جو ہر ضرورت پر کام آئے۔ مثال کے طور پر 'فر' کے یونٹ میں 'مسا' جوڑ دیا جائے تو 'مسافر' ہو جائے گا اور اگر اس کے اخیر میں 'ئل' لگا دیا جائے تو وہ 'مسائل' پڑھا جائے گا۔ یہ فارمولہ تو طے پا گیا مگر اس کے عملی تجربے کی راہ آسان نہیں تھی۔

اسے خدا کی حکمت کہیے کہ سنگاپور کی پرنٹنگ ٹیکنالوجی کی ایک نمائش میں احمد مرزا جمیل پہنچے اور ایک اسٹال پر انھوں نے چینی زبان کو کمپوز ہوتے دیکھا تو قدرت نے ان کے ذہن میں امید کی ایک مشعل روشن کی کہ ''جب چینیوں نے اپنی زبان کے 80 ہزار کیریکٹرس قابو میں کر لیے ہیں تو ہم اپنی زبان میں یہ عمل کیوں نہیں کر سکتے؟''

ایک مشہور برطانوی ادارے مونوٹائپ کارپوریشن والوں سے بصورت ناکامی، تمام نقصان کی بھرپائی اپنے ذمے لیتے ہوئے معاہدہ کیا اور کام شروع ہوا، اُسی زمانے میں پاکستان کے سب سے بڑے اُردو اخبار روزنامہ جنگ کا لاہور ایڈیشن جاری ہونے والا تھا، اس کے مالکان کو جب اطلاع ملی کہ خطِ نستعلیق کمپیوٹر میں منتقل ہونے والا ہے تو انھوں نے احمد مرزا جمیل سے رابطہ کر کے اپنے اخبار کے لاہور ایڈیشن کے منصوبے کو مؤخر کرتے ہوئے اس کام میں ان کی طرف بہر طور دستِ تعاون بڑھایا۔

خطِ نستعلیق کے اوّل اوّل نمونے میں چھ ماہ کا وقت صَرف ہوا۔ بعدۂ حکومت پاکستان کی طرف سے اُن کی مدد کی گئی اور ایک پریس کانفرنس میں باقاعدہ 'خطِ نستعلیق' کی برقی کتابت کی کامیابی کا مژدہ سنایا گیا تو یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح چہار طرف پھیل گئی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ احمد مرزا جمیل کی مشکلات میں اضافہ بھی ہوا۔ ان کے رفقائے کار کا خیال تھا بیس پچیس کاتبوں کو یکجا کر کے اُن سے لفظوں کے یونٹ (ترسیمے) لکھوا لیے جائیں گے، لیکن اس میں ایک مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ یہ کاتب حضرات الگ الگ اساتذہ کے تربیت یافتہ ہونگے لہٰذا سب کے 'خط' میں کچھ نہ کچھ فرق ہونا یقینی ہے جس سے تحریر میں ہم آہنگی نہ پیدا ہوگی اور کسی ایک کاتب سے معینہ وقت میں تمام یونٹ لکھوانا بھی ناممکن عمل تھا۔

بہرحال احمد مرزا جمیل نے اس کام کا بیڑا خود اٹھایا اور صرف چھ ماہ میں 10×10 اِنچ کے سولہ ہزار یونٹ (ترسیمے) تیار کر لیے، جس سے کم و بیش ڈھائی لاکھ الفاظ وجود پا سکتے تھے۔ شکر ربی کہ اس طرح کمپیوٹر سے کتابت (کمپوزنگ) کا اُردو میں ایک انقلابی عمل شروع ہوا۔

مشینی عمل کی اکثر ایجادات مغرب کی دین ہیں مگر احمد مرزا جمیل نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر استقلال کے ساتھ مسلسل کوششیں کی جائے تو اس دور میں بھی ایجاد کا سہرا مشرق کے سَر بندھ سکتا ہے بلکہ ان کی مساعی احسن نے اس عمل ہی کو نہیں ان کے نام کو بھی تاریخ میں درج کر دیا۔ یہاں یہ بات بھی اندراج چاہتی ہے کہ کامیابی کے نشے میں احمد مرزا جمیل اپنے بابا نور احمد کو نہیں بھولے اور اپنی ایجاد کو اُن سے منسوب کر کے اسے 'نوری نستعلیق' کا نام دے دیا۔

روزنامہ جنگ کے لاہور ایڈیشن کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ اُردو کا اوّلین اخبار ہے جو سب سے پہلے کمپیوٹر کے ذریعے نستعلیق فونٹ میں جاری ہوا، اسی طرح جالندھر کا روزنامہ ہند سماچار بھی ہندوستان کا پہلا اُردو اخبار ہے جس نے دستی کتابت کو ترک کر کے' کمپیوٹر کے ذریعے نوری نستعلیق میں اپنی اشاعت کو حسین و جمیل بنایا اور اب تو گھروں میں بھی نستعلیق کا یہ نور عام ہو گیا ہے۔

احمد مرزا جمیل کی اس ایجاد پر پاکستان بھر میں تحسین کی گئی۔ پاکستان کے ایک ممتاز شاعر مولانا انجم فوقی بدایونی نے برقی کتابت کے موجد کی اس کامیابی پر اس شعر کے ذریعے تحسین کی تھی:

ہم جو چاہیں خود ہی لکھ دیں
سادہ کاغذ ہیں تقدیریں

اگر یہ کہا جائے تو ہرگز غلط نہ ہوگا کہ مرزا احمد جمیل کی اس ایجاد نے اُردو زبان کو ڈولی اور کہاروں کے کاندھوں سے اُتار کر جمبو جیٹ میں بٹھا دیا۔ کل اگر سَو، سَوا سَو صفحات کی کوئی کتاب بہ عجلت چھپوانی ہوتی تھی تو حضرتِ کاتب کے ٹھیے کے چکّر پر چکر لگانے پڑتے تھے۔ ان کے ناز اور نخرے اُٹھانے کے ساتھ لوگوں نے ان کے گھر کا سودا سلف بھی بازار سے لا کر دیا ہے اور کتابت کی منہ مانگی اُجرت بھی۔

مگر اسی کے ساتھ ساتھ ہم اُردو والوں کی یہ احسان فراموشی بھی تاریخ میں درج ہوگئی کہ جب 17 فروری 2014 کو احمد مرزا جمیل کا انتقال ہوا تو پاکستان کے اُردو اخبار سمیت کسی بھی ذریعۂ ابلاغ نے ان کی رحلت کی خبر کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا، جب کسی طور دو عشروں بعد اُن کی سنامی ممبئی پہنچی تو یہاں احمد مرزا جمیل کی اس ایجاد کو فروغ دینے والے سید منظر زیدی نے بذریعہ فون مرحوم کے اہلِ خانہ سے کراچی میں تصدیق کی اور دوسرے دن ممبئی کے اُردو اخبارات کے ذریعے یہ خبر عام ہوئی۔

14 اگست 1982 کو پاکستانی حکومت کی طرف سے احمد مرزا جمیل کو ملک کا ایک مؤقر ایوارڈ بنام 'تمغۂ امتیاز' تفویض کیا گیا مگر مرحوم کا سب سے بڑا اعزاز تو اُردو کا 'نوری نستعلیق' فونٹ ہے کہ یہ جب جب اور جہاں جہاں کمپوز ہوگا وہاں وہاں احمد مرزا جمیل اُردو کے تئیں اپنی مثالی جستجو نیز اپنے استقلال کی یاد دلاتے رہیں گے اور نو بہ نو منزلوں کی آرزو و جستجو کرنے والوں کے دلوں میں حوصلے کی شمع روشن کرتے رہیں گے۔ یقیناً ایسے لوگ مرتے نہیں، اپنی مساعی کے نتیجے میں زندۂ جاوید ہو جاتے ہیں۔

■

Nadeem Siddiqui, F-9,Ist Floor, Rizvi Baugh, Opp Rly Station MUMBRA (Thane)400612

وسیم فرحت کارنجوی

خمار کی سرور آگیں شاعری

نیاز فتح پوری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''دو طرح کے فنکاروں پر کچھ لکھنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ایک تو وہ کہ جن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہو اور دوسرے وہ کہ جن پر کچھ نہ لکھا گیا ہو۔'' خمار بارہ بنکوی کا شمار ثانی الذکر میں کیا جانا چاہیے۔ سخت حیرت ہوتی ہے کہ خمار جیسے البیلے اور کیف آگیں شاعر کے متعلق بعینہٖ اردو ادب میں کچھ نہیں لکھا گیا اور یہاں وہاں سے اگر کچھ مل بھی جائے تو اس سے کسی حتمی فیصلے پر پہنچنا محال ہوگا۔

خمار، خالص تغزل کا شاعر، تغزل کا یہ عالم کہ نعتوں، منقبتوں اور سلاموں پر بھی اسی تغزل کا اثر دکھائی پڑتا ہے۔ شعوری لاشعوری طور پر خمار خود کو تغزل سے دور نہیں رکھ پائے۔ اردو شاعری کی تثلیث، رندی، عاشقی اور تصوف میں اول الذکر دو میلانات پر ہی خمار نے اکتفا کیا۔

ایک طویل عرصے تک خود کو کسی ایک ہی زاویۂ فکر پر قائم رکھنا بھی بجائے خود ایک کمال ہے۔ وگرنہ انسانی نفسیات ہر دہائی اپنی اساس بدلتی رہتی ہے۔ جگر مرادآبادی کی شاگردی قبول کرنے کے باوجود خمار کا رنگِ سخن جگر سے قدرے مختلف ہے۔ رندی و عاشقی میں خمار عاشقی کو ترجیح دیتے ہیں۔ عبدالحمید عدم لاہوری، جگر مرادآبادی اور اصغر گونڈوی، ان تینوں کی شاعری کسی ایک ہی دائرۂ فکر کے ارد گرد گھومتی ہے۔ عدم خرابات، جگر عاشقی اور اصغر تصوف۔ بہت احتیاط اور ذمے داری کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ مذکورہ تینوں ہی شعرا کے یہاں متعدد مرتبہ مضامین کی تکرار بری طرح کھلتی ہے۔ عدم کی مے پرستی، جگر کی عاشقانہ سرمستی اور اصغر کی تصوف مزاجی اول اول تو خیر قاری بہ ہزار دلچسپی پڑھ لیتا ہے لیکن پھر ان کی تکرار ناقابلِ مطالعہ بنتی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف خمار کے یہاں آپ مکمل شعری مجموعہ پڑھتے جائیے لیکن کہیں بوریت محسوس نہ ہوگی۔ اب ظاہر ہے کہ خمار بھی موضوعیت کے ضمن میں مذکورہ بالا تینوں فنکاروں کے ہی ہم قبیلہ ہیں تاہم خمار کی شاعری کا تنوع اور تازہ کاری قرات پر بار نہیں ہوتی۔

خمار کی شاعری میں بلا کی غنائیت موجود ہے۔ ان کے یہاں مصرعے کچھ اس طرح سجے سجائے اور ڈھلے ڈھلائے ہوئے ہوتے ہیں کہ نغمگی خود بہ خود پیدا ہوتی جاتی ہے۔ پڑھتے وقت قاری ایک نوع کا لطف محسوس کرتا ہے۔ ایک خاص لفظیات اور اساسِ شعر کے ساتھ زندگی بھر ثابت قدم رہنا بھی خمار ہی کا خاصہ ہے۔ خمار کی شاعری میں عشق و معاشقے کے مضامین والہانہ پن اور جمالیاتی کیف سے معمور ہوتے ہیں۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ ہر مرتبہ یہی جمالیات ایک نئے ڈھب میں ایک نئے طور پر سامنے آتی ہے، جو میری اپنی دانست میں تازہ کاری کی عمدہ مثال ہے:

بھولے ہیں رفتہ رفتہ انھیں مدتوں میں ہم
قسطوں میں خودکشی کا مزہ ہم سے پوچھیے

وہ جان ہی گئے کہ ہمیں ان سے پیار ہے
آنکھوں کی مخبری کا مزہ ہم سے پوچھیے

برسے بغیر ہی جو گھٹا گھر کے کھل گئی
اک بے وفا کا عہدِ وفا یاد آگیا

مجھ کو محرومیِ نظارہ قبول
آپ جلوے نہ اپنے عام کریں

دل کو ترکِ محبت پہ کیا کیا ہے ناز
لیکن ان کا اگر سامنا ہوگیا

جھنجھلائے ہیں، لجائے ہیں، پھر مسکرائے ہیں
کس اہتمام سے انھیں ہم یاد آئے ہیں

آہ جن اشکوں کو پی جانا پڑا
اف جو دریا رخ بدل کر رہ گئے

حسن کی مہربانیاں عشق کے حق میں زہر ہیں
حسن کے اجتناب تک عشق کی زندگی سمجھ

عقل کہے کہ بار بار ان کو نہ آزمائیے
عشق کہے کہ ایک بار اور فریب کھائیے

آگے جبینِ شوق تجھے اختیار ہے
یہ دیر ہے یہ کعبہ ہے یہ کوئے یار ہے

الفاظ میں نہ ڈھونڈ مری بے قراریاں
اے بے خبر زباں نہیں دل بے قرار ہے

موضوعاتی مطالعے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ خمار کے یہاں رموزِ عشق کی معاملہ بندی، رندی، دوستوں کے تلخ تجربات کا ذکر، حضرتِ واعظ سے روایتی چھیڑ چھاڑ اور بعضے حقائقِ زیست۔ ان تمام میں عشق کا تناسب قدرے زیادہ بنتا ہے۔ جس کی چند مثالیں اوپر درج کی گئی ہیں۔

عشق کی معاملہ بندی میں خمار کے یہاں اکتاہٹ کہیں نہیں ملتی۔ ان کے عشق اور معاملاتِ عشق کی صحت مندی اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ رومانیت کی ہلڑ بازی سے ان کی شاعری پاک ہے۔ عشق کی یہی شستگی اور شائستگی انھیں اپنے ہم عصروں کے ہجوم سے مستثنیٰ کرتی ہے۔ بلکہ چند مقامات پر خمار کے محبوب یا معشوق کی پاکیزگی حسرت سے بھی آگے بڑھ گئی۔ شرافتِ عشق یا تطہیرِ عشق کے معاملے میں خمار کا وہی شعری رویہ دیکھنے کو ملتا ہے جو مولانا حسرت موہانی نے اپنایا تھا۔ کئی جگہ خمار کی عشقیہ دردمندی اپنے مواج دھارے کے ساتھ کائناتِ شاعر کو ڈانواڈول کرتی نظر آتی ہے۔ خمار کے یہاں عشق کی واردات بہت زیادہ طنطنے یا شور و غل کے ساتھ رقم نہیں ہوئی، بلکہ محسوس

ہوتا ہے شاعر کی خلوت میں بقول خلیل فرحت کارنجوی "آپ ہی ہو گئے مخاطب آپ ہی فرماتے گئے" کی سی کیفیت ہے۔ خمار کا عشق بہ زور اور بہ بانگِ دہل خود کو منوانے پر ہرگز آمادہ نہیں۔ ان کی شاعری اپنے عشق کو، سرگوشی کے ساتھ میٹھے لہجے میں، تسلیم کروانے کا ہنر جانتی ہے۔

روزِ ازل سے ہی عشق کا موضوع نظم و نثر، ہر دو جانب چھایا ہوا ہے۔ اور بہ خدا، یہ عنوان ہی کچھ ایسا ہے کہ اس کی کوئی زمانی قید نہیں ہے۔ یہی وہ موضوع ہے جو ہر عمر کے قاری کے لیے موزوں ثابت ہوتا ہے۔

اردو فارسی شاعری میں ہزار ہا کتابیں اسی موضوعِ خاص پر رقم ہوئی ہیں۔ ایک ہی ہدف پر سیکڑوں نشانہ باز لاتعداد تیر لگا چکے ہیں۔ اب جب آپ خمار کے یہاں یہی عنوان پڑھتے ہیں تو اول صفحے سے ہی تازہ کاری کی ایک دنیا آباد نظر آتی ہے۔ ان کے شعری مجموعہ 'شب تاب' کی پہلی غزل سے ہی مشاہداتی ندرت محسوس ہو جاتی ہے:

بھولے ہیں رفتہ رفتہ انھیں مدتوں میں ہم
قسطوں میں خودکشی کا مزہ ہم سے پوچھیے

شاہ حاتم دہلوی سے لے کر جگر مرادآبادی تک نجانے کتنے شاعروں نے معشوق کو بھولنے اور اس کی اذیت کو بیان کیا ہے لیکن آپ محسوس کیجیے کہ رفتہ رفتہ بھولنا اور اس بتدریج بھولے جانے کو قسطوں میں خودکشی سے تعبیر کرنا کیسی نئی بات ہے اور پھر بعینہٖ جب شعری تناسب نکالا جائے تو کس قدر حسین تناسب نکلتا ہے، بھولنا مرادف خودکشی، رفتہ رفتہ مرادف قسط وار۔ یہی وہ شعری حسن ہے جو خمار کی شاعری کو زندہ رکھے گا۔

ٹھیک اسی طرح الفاظ کے انتخاب میں بھی خمار بڑی قدرت رکھتے ہیں۔ "آنکھوں کی مخبری کا مزہ ہم سے پوچھیے"، اس مصرع میں لفظ 'مخبری' ہر چند کہ غیر شعری ہے بلکہ ایسے نازک مقام پر اس قدر سخت اور کرخت لفظ کسی صورت روا نہ ہوتا لیکن خمار کی ماہرانہ چابکدستی کی داد ہی دیتے بنتی ہے کہ ایک غیر شعری لفظ کو بھی شعری پیرایے میں کچھ اس ڈھب سے پیش کیا ہے کہ مکمل شعر کی اساس بنا دیا۔ 'بر سے بغیر ہی جو گھٹا گھر کے کھل گئی'، ایفائے وعدہ نہ ہونے کے لیے کس قدر حسین اور لطیف استعارہ خمار بروئے کار لاتے ہیں۔ محض اس استعارے سے شعر میں بلا کی جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔ خمار کے یہاں میں نے جو ایک بات شدت سے محسوس کی ہے وہ ان کی سلاست اور ندرتِ خیال ہے:

مجھ کو محرومیِ نظارہ قبول
آپ جلوے نہ اپنے عام کریں

جلووں کے عام ہونے سے عاشق کو کوفت پہنچتی ہے، اس مضمون کو کئی اساتذہ نے باندھا ہے لیکن خمار کے یہاں یہ مضمون جس تازہ کاری اور ندرت کے ساتھ نظم ہوا ہے وہ 'حدیثِ دیگر' ہے۔ یہی وہ شاعرانہ وصف ہے جو خمار کو منتہائے خصوص تک پہنچانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

حضرتِ جوش کی زمین 'سوزِ غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا' میں خمار کی غزل بھی بڑی روانی رکھتی ہے اور مندرج شعر میں مصرع ثانی 'مجھ کو خود میری تمناؤں نے برباد کیا' بے ساختہ اور بولتا ہوا مصرع ہے۔ ایسے مصرعے شاعر کے قلب میں اتارے جاتے ہیں، جنھیں اصطلاحاً آمد سے معنون کیا جاتا ہے۔

میرے آبائی وطن کارنجہ لاڈ کے ایک کل ہند مشاعرے میں حضرتِ خمار تشریف لائے تھے۔ وہاں خمار نے شعر پڑھا:

الفاظ میں نہ ڈھونڈ مری بے قراریاں
ظالم! زباں نہیں مرا دل بے قرار ہے

اب جو میں 'شب تاب' دیکھتا ہوں تو اس شعر کا مصرع ثانی کچھ تبدیلی کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ خدا جانے کیا معاملہ رہا ہو لیکن دوسرے مصرع سے اگر لفظ 'ظالم' نکال دیا جائے تو بیان کا زور یکسر ختم ہو جاتا ہے:

نازاں تھے ضبطِ غم پہ بہت حضرتِ خمار
رو رو دیے جو پیار کے دن یاد آ گئے
آپ نے دن بنا دیا تھا جسے
زندگی بھر وہ رات یاد آئی
اب ان حدود میں لایا ہے انتظار مجھے
وہ آ بھی جائیں تو آئے نہ اعتبار مجھے
جشنِ سجود پائے صنم پہ منائیے
یہ کفر ہے تو کفر پہ ایمان لائیے
سنا ہے ہمیں وہ بھلانے لگے ہیں
تو کیا ہم انھیں یاد آنے لگے ہیں
پایا انھیں تو ہجر کے صدمے رلا گئے
منزل ملی تو راہ کے غم یاد آ گئے
عاشقی بقیدِ شوق، کفر ہے عاشقی نہیں
اس کی خوشی پہ جان دے، تیری خوشی خوشی نہیں
افشائے رازِ عشق کا خطرہ نہیں رہا
دھمکی میں رازداروں کے آنے کے دن گئے

مندرجہ بالا اول شعر میں 'رو رو دیے' محاورہ سیدھے دل میں اتر جاتا ہے۔ شاعر جس کرب اور جس جذبے کو قاری تک پہنچانا چاہتا ہے اس عمل میں سر بہ سر کامیاب نظر آتا ہے۔ دوسرے شعر کا مضمون ہر چند کہ بری طرح پامال ہے تاہم حضرتِ خمار کی مشاقی اور خداداد تخلیقیت کا کیا کہنا کہ کمال درجے کی تازہ کاری کے ساتھ ایک پامال موضوع کو بھی نئے انداز میں نظم کر دیا۔ تیسرے شعر میں بھی بلا کی روانی ہے۔ عاشق کی وارفتگی کا ذکر اس سے اچھا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اسی مضمون کو مرحوم خلیل فرحت کارنجوی والدِ بزرگ وار نے یوں باندھا تھا:

دل سے مرے تنہائی کی شدت نہیں جاتی
اب تو بھی چلا آئے تو وحشت نہیں جاتی

چوتھے شعر کا مصرع 'یہ کفر ہے تو کفر پہ ایمان لائیے'... کیا کہنے ہیں! کیا غنائیت ہے، مصرع اس درجہ شگفتہ ہے کہ از خود نغمگی پیدا کر لے۔ کچھ اسی نہج کے مصرعے اور اشعار خمار کی مقبولیت کا سرچشمہ رہے ہیں۔ شبلی نعمانی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف 'موازنۂ انیس و دبیر' میں فرماتے ہیں کہ:

"ترکیبِ الفاظ کے لحاظ سے شعر کی بڑی خوبی یہ

ہے کہ کلام کے اجزا کی جو اصلی ترتیب ہے وہ بحالِ خود قایم رہے۔ نظم کا درحقیقت سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ اگر اس کو نثر کرنا چاہیں تو نہ ہو سکے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب شعر میں الفاظ کی وہی ترتیب قایم رہے جو نثر میں معمولاً ہوا کرتی ہے''۔ اب آپ مولانا شبلی کی رائے کو سامنے رکھیے اور غور کیجیے کہ واقعی خمار اس کسوٹی پر بھی کھرے اترتے ہیں۔

خمار کی عشقیہ شاعری پڑھتے وقت یہ واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں پھوہڑ پن نہیں ہے۔ وہ فکر کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں نیز اپنے خیال کو خوبصورت سانچے میں ڈھالنے پر بھی قادر نظر آتے ہیں۔ بلاغتِ کلام کے لیے صرف یہ ضروری نہیں کہ بہت سنگین اور ادق فلسفیانہ مضامین نظم کیے جائیں۔ بلکہ اس کا انحصار طرزِ فکر اور اسلوبِ بیان پر ہوتا ہے، پھر چاہے کوئی مضمون رقم کر لیں۔ خمار کے ہم عصروں میں بعض شعرا کے یہاں عشق کے نام پر محض پھوہڑ پن رقم ہو گیا ہے۔ چاہے وہ اربابِ ذوق والے جدیدیت پسند ہوں، رومانیت والے ہوں یا ترقی پسند۔ عشق اور وارداتِ عشق کا نظم ہونا اس قدر آسان نہیں جتنا محسوس ہوتا ہے۔ اسی فریب میں لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں اور پھر سوائے الہڑ پن کوئی دوسرا نتیجہ ان کی شاعری سے اخذ کرنا مشکل ہو جاتا ہے جس کی ایک مثال اختر شیرانی ہیں۔ سلمہ سے دل لگا کر، جہاں ریحانہ رہتی تھی، وغیرہ وغیرہ۔

خمار کی شاعری رکاکت یا فحاشت سے یکسر پاک ہے۔ انھوں نے مضامین کے نظم کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے کہ کہیں ذم کا پہلو نہ نکل آئے یا کہیں ذو معنویت نہ ظاہر ہو۔

خمار کی شاعری میں عاشق ناکام ضرور ہے لیکن صرف بازی سے۔ حوصلہ و عزم تو اب بھی اس کے پاس ہے جس سے وہ ہمیں زندہ رہنے اور عشق کرنے کا فن سکھاتا ہے۔

اس لحاظ سے غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ بالواسطہ خمار ہمیں زیست کرنے کا ہنر سکھاتے ہیں۔ وہ ہمیں ہماری ہر شکست پر حوصلہ بخشتے ہیں، اور یہی وہ جذبۂ ہمدردی ہے جو دیر تک قاری کو باندھے رکھتا ہے۔ خمار کی شاعری سمجھنے کے لیے قاری کو دور کی کوڑی نہیں لانی پڑتی۔ ان کا ہر شعر سیدھے سیدھے دل میں اتر جاتا ہے۔ بغیر ذہنی مشقت کے خمار ترسیل سر انجام دیتے ہیں۔ بہت سیدھے سادھے اور بالکل سامنے کے موضوعات کو خمار نے ہاتھ لگایا ہے، جس کی ایک وجہ شاید یہ بھی رہی ہو کہ خمار کا ذریعۂ معاش مشاعرے ہی ہوا کرتے تھے اور گزشتہ پچاس برسوں میں ہر ذی فہم یہ بات جانتا ہے کہ مشاعروں میں تصوف کے ادق اور پیچیدہ رموز، انسانی شخصیات کے گہرے فلسفیانہ مضامین والی شاعری سے شاعر بہت لمبا سفر طے نہیں کر سکتا۔ شاید اسی لیے خمار نے ایسے سخت مضامین کو نہ چھونے میں ہی بہتری سمجھی ہو۔ بقول جگر:

لطف کچھ دامن بچا کر ہی گزر جانے میں ہے

لیکن باوجود اس کے، خمار کی عوامی شاعری یا پھر مشاعراتی شاعری عامیانہ نہیں ہے۔ ان کی مشاعروں والی شاعری میں بھی فکر کا عنصر پایا جاتا ہے۔ نیاز فتح پوری نے لکھا ہے کہ ''میں کسی شاعر کے کلام پر گفتگو کرنے سے قبل یہ دیکھتا ہوں کہ وہ فطرت کی جانب سے شاعر بنا کر بھیجا گیا ہے یا وہ اپنے آپ کو شاعر کی حیثیت سے پیش کرنے میں

فطرت سے جنگ کر رہا ہے'' (نگار لکھنو، بہادر شاہ ظفر نمبر، ظفر کی شاعری از مدیر، جنوری 1930 ص نمبر 3) اس ضمن میں بلا خوف تردد کہا جا سکتا ہے کہ خمار فطرت کی جانب سے شاعر بنا کر اتارے گئے تھے۔ ان کی شاعری میں غضب کی تخلیقیت اسی بات کا اشارہ کرتی ہے۔

خمار کا شمار ان حساس ترین شاعروں میں کیا جانا چاہیے جنھیں خوشی کی بجائے غم عزیز ہو۔ جو عارضی مسکرانے پہ مستقل اداسی کو مقدم جانتے ہوں۔ وہ غمِ آفاق کو غمِ عاشقاں بنا کر رسوا کرنے کے قائل نہیں بلکہ غمِ عاشقاں اور غمِ حیات کو غمِ آفاق میں ڈھال کر اس کا وقار بڑھانے میں ماہر ہیں۔ ان کی خودداری طبع کسی نامرادی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ خود ارشاد فرماتے ہیں کہ:

عشق ہے تشنگی کا نام، توڑ دے گر ملے بھی جام
شدتِ تشنگی نہ دیکھ، لذتِ تشنگی سمجھ

عشق و عاشقی کے بعد خمار نے جن موضوعات کو (گاہے گاہے ہی سہی) ہاتھ لگایا ہے ان میں حضرتِ ناصح اور ان کے ساتھ شوخی، دوست نما دشمن یا دشمن نما دوست قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ان موضوعات کا تناسب ایک غزل میں ایک آدھ شعر تک ہی محدود ہے:

کہنے کو زندگی تھی بہت مختصر مگر
کچھ یوں بسر ہوئی کہ خدا یاد آ گیا
دل سلگتا رہا آشیانے کے بعد
آگ ٹھنڈی ہوئی اک زمانے کے بعد

حقائقِ زیست اور تلخ تجربات کو بھی حضرتِ خمار نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ کسی فرد کی شکستِ ظاہری اس وقت تک تکمیل کو نہ پہنچے گی جب تک وہ اپنے حوصلے سے نہ ہار جائے۔ اس موضوع پر بھی خمار سے بالکل نئے مضمون رقم ہو گئے ہیں:

انسان جیتے جی کرے توبہ خطاؤں سے
مجبوریوں نے کتنے فرشتے بنائے ہیں

اس شعر کی جس قدر تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ ایک آفاقی صداقت کس خوبصورتی اور سلاست کے ساتھ خمار نے نظم کر لی ہے۔ انسانی شخصیت کے اس پہلو پر ماہر نفسیات نے کئی کئی کتابیں لکھ رکھی ہیں لیکن ایسی ترسیل تو شاید ان کے بھی نصیب میں نہیں۔ یہ شعر خمار کے ان شعروں میں سے ایک ہے جس پر طبیعت جھوم جھوم اٹھے۔ مصرع اولیٰ کا دعویٰ اور ثانی کی دلیل نے شعر کو سرمۂ دنبالہ دار بنا دیا ہے۔ کوئی غیر شاعر محض اس جیسا ایک شعر کہہ لے تو میں اسے شاعر تسلیم کر لوں۔

عشق و حقائقِ زیست کے بعد خمار کے یہاں تیسرا اہم موضوع دوست ہے۔ اس سلسلے کے اشعار ملاحظہ کریں:

غم تو ہے عین زندگی لیکن
غمگساروں نے مار ڈالا ہے
غمِ جاں بھی لے لے تو گوارا ہمیں لیکن
غمخواروں کے احسان سے اللہ بچائے
دشمنوں سے پیار ہوتا جائے گا
دوستوں کو آزماتے جائیے
دوستوں کی جو یاد آتی ہے
دوستی کانپ کانپ جاتی ہے
الٰہی مرے دوست ہوں خیریت
یہ کیوں گھر میں پتھر نہیں آ رہے ہیں
یاد کرنے پہ بھی دوست آئیں نہ یاد
دوستوں کے کرم یاد آتے رہے

تیسرا شعر 'دشمنوں سے پیار ہوتا جائے گا' دوستی کی اس سے

اچھی وضاحت اور کیا ہو سکتی ہے۔ کوئی عجب نہ ہوگا کہ زخم خوردگانِ رفیق ایسے شعروں پہ جھوم اٹھیں۔ آپ بیتی کو جگ بیتی اور جگ بیتی کو آپ بیتی بناتے وقت کئی ایک حضرات دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اس معاملے میں دامنِ فن بچاتے بچاتے قدم اٹھانے پڑتے ہیں اور بہت کم شعرا اس فن میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔ وگرنہ اظہارِ مافی الضمیر تو کوئی مشکل کام نہیں۔ بلاشبہ اردو غزل کے اولین جدید شاعر ابوالمعانی میرزا یگانہ چنگیزی اس فن میں صد فیصد کامیاب ہوئے ہیں اور اب جب ذکرِ خمار چل رہا ہے تو عرض ہے کہ آپ بیتی کو جگ بیتی اور جگ بیتی کو آپ بیتی کر لینے میں خمار بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ شاعر جتنے اشعار تخلیق کرتا ہے، کوئی ضروری نہیں کہ ان میں درج بیانات یا واقعات خود شاعر سے ہو گزرے ہوں۔ بعض مرتبہ خود بیتی ہوتی ہے اور بعض جگ بیتی۔ ان دونوں کا باہمی امتزاج ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ خمار کے یہاں دوست نما دشمن سے متعلقہ جتنے اشعار ہیں وہ اس کلیے پر پورے اترتے ہیں۔

اس کے بعد خمار کے یہاں زہد و ورع و پند سے علاقہ رکھتی ہوئی شوخی دیکھنے کو ملتی ہے، لیکن لطف کی بات تو یہ ہے کہ یہ شوخی کبھی سنجیدگی میں نہیں بدلتی۔ ملاحظہ فرمائیں:

محبت کو سمجھنا ہے تو زاہد خود محبت کر
کنارے سے کبھی اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا

تیری باتوں کو میں نے اے واعظ
احتراماً ہنسی میں ٹالا ہے

اول شعر کا پہلا مصرع کس قدر بولتا ہوا مصرع ہے۔ اور ایک پامال موضوع خمار کے یہاں تازگی کے ساتھ در آیا ہے۔ اسی مضمون کو میرزا یگانہ نے باندھا کہ اب اس کے بعد اس سے اچھا اور کہیں نہ ہوگا۔ فرماتے ہیں:

جیسے دوزخ کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہو
کس قدر واعظِ مکار ڈراتا ہے مجھے

دوسرے شعر میں لفظ 'احتراماً' نے شعر کو دو آتشہ کر دیا ہے۔ اس ایک لفظ میں کتنے طوفان چھپے بیٹھے ہیں جو ہنسی میں ٹل جانے کی بنا پر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ خمار کی بذلہ سنجی اور شوخیِ طبع کا جواب نہیں۔

اب اس کے بعد ایک اہم اور آخری موضوع کائناتِ انگبیں ہے جسے ہم رندی سے جانتے ہیں:

گزرے ہیں مے کدے سے جو توبہ کے بعد ہم
کچھ دور عادتاً بھی قدم لڑکھڑائے ہیں

جام بہ دست و مے بہ جام، یوں ہی گزار صبح و شام
زیست کی تلخیِ مدام کو، پی کے پلا کے بھول جا

کوائف: خمار بارہ بنکوی

1919 تا 1999

پیدائش: 20 ستمبر 1919

وفات: 20 فروری 1999

اصل نام: محمد حیدر خاں

وطن مالوف: بارہ بنکی، اتر پردیش

تحریک شعر: ان کے چچا قرار بارہ بنکوی خود ایک مشہور شاعر تھے جنھوں نے خمار کو شاعری کی راہ پر لگایا۔

شعری مجموعے: شب تاب، آتشِ تار، حدیث دیگراں، رقصِ مے

فلمیں: شاہجہاں، بارہ دری، ساز اور آواز، مہندی، لو اینڈ گاڈ وغیرہ کے لیے نغمہ نگاری کی۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ رندی اور خمار جزوِ لاینفک ہیں لیکن باوجود اس کے خمار کے یہاں یہ موضوع کچھ کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ کہیں کہیں برسبیلِ تذکرہ آ جائے تو آ جائے۔ بمقابلۂ جگر، خمار نے رندی کو اپنی شاعری پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ وہ جانتے تھے، گو کہ شراب کا سرور جلد نہیں اترتا تاہم شراب کے موضوعات اور منظر نامے بہت جلد دھندلے پڑ جاتے ہیں۔ ان کی مقبولیت عارضی ہوتی ہے۔ وگرنہ کیا وجہ ہے کہ ریاض خیرآبادی جیسا بلند فکر شاعر محض خرابات کی وجہ سے فراموش کر دیا گیا۔ عدم لاہوری کے مجموعے 'خرابات' کو بھی نسیانی دیمک چاٹ گئی۔ غرض کہ اس موضوع کو فارسی شاعری میں ہو تو ہو، اردو شاعری میں دوام حاصل نہیں ہے۔ تمدن کی بدلتی قدریں اسے بے کم و کاست قبول نہیں کر پاتیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ ایسے معاملات میں شعر محض شاعر کا ذاتی اظہار ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسی فکر کو آفاقیت کا لمس نہیں ملتا۔ بہرحال۔

مضمون کے خاتمے پر یہ آخری زمرہ بھی ملاحظہ کریں کہ ہر شاعر اپنے پیش رووں سے کسی نہ کسی زاویے سے ضرور اثر قبول کرتا ہے۔ شعوری لاشعوری، ہر دو حالت میں شاعر پر اپنے آفریدہ پیش رو کا پرتو ضرور دکھائی پڑتا ہے۔ اپنی اس بات کی صراحت کے لیے خمار کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں۔

میرزا غالب کا مشہورِ زمانہ شعر:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

یا پھر:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

خمار فرماتے ہیں:

رنج حد سے گزر کر خوشی بن گیا
ہوگئے پار ہم ڈوب جانے کے بعد

غالب کا خوبصورت شعر:

سفینہ جب کہ کنارے سے آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

خمار نے کہا کہ:

مر مر کے طے ہوا سفرِ زندگی مگر
منزل جب آ گئی ہے تو کیا یاد کیجیے

ابوالاثر حفیظ جالندھری فرماتے ہیں:

منظور منظور اے اہلِ دنیا
اللہ میرا باقی تمھارا

خمار نے کہا کہ:

بخش دے یارب اہلِ ہوس کو بہشت
مجھ کو کیا چاہیے تجھ کو پانے کے بعد

خمار کے یہاں ایسے کئی مقامات ہیں جہاں اساتذہ کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔ ہر حساس آدمی کی طرح خمار بھی انقلابِ زمانہ اور ستم ظریفی حالات سے نبرد آزما ہوتے نظر آتے ہیں۔ روح فرسا سانحات ہوں یا تباہ کن واقعات، خمار یہاں بھی اپنے قلم کی بوقلمونی کا اظہار کرتے ہیں۔ 1947 کے شرمناک فسادات سے متاثر ہو کر کہی گئی نظم اسی جذبے کی غماز ہے:

وقت نے انگڑائی لی ہے آجکل
چشمِ شاعر میں نمی ہے آجکل
زندگی کا ذکر کیا اس دور میں
موت بھی سہمی ہوئی ہے آجکل

ترنم بے حد پختہ تھا اور محض ایک یا دو ترنم پر ہی پڑھا کرتے تھے۔ اسی خاطر ایک یا دو ہی بحور میں زیادہ سے زیادہ غزلیں نظر آتی ہیں۔ ہم اسے خمار کی پیشہ ورانہ ضرورت سے معنون کر سکتے ہیں۔ بہرکیف۔ نیاز فتح پوری نے مولانا حسرت موہانی کے متعلق کہا تھا کہ ''ان کی شاعری شباب کی شاعری تھی جو شباب ہی کے ساتھ رخصت ہوگئی'' یا پھر دورِ حاضر کے نقادوں کی ساحر کے متعلق رائے کہ ساحر کی شاعری ایک مخصوص عمر میں پڑھنے کی چیز ہے، لیکن اس کے برعکس خمار کی شاعری، دوامی شاعری ہے۔ کہ جب تک عشق کا نام باقی رہے گا، خمار کی شاعری زندہ رہے گی۔

■

Waseem Farhat Karanjvi(Alig), Editor, Quarterly Urdu, 'Adabistan', Near Wahid Khan Urdu, D.Ed College, Walgaon Road, Amravati-444601 (MS)

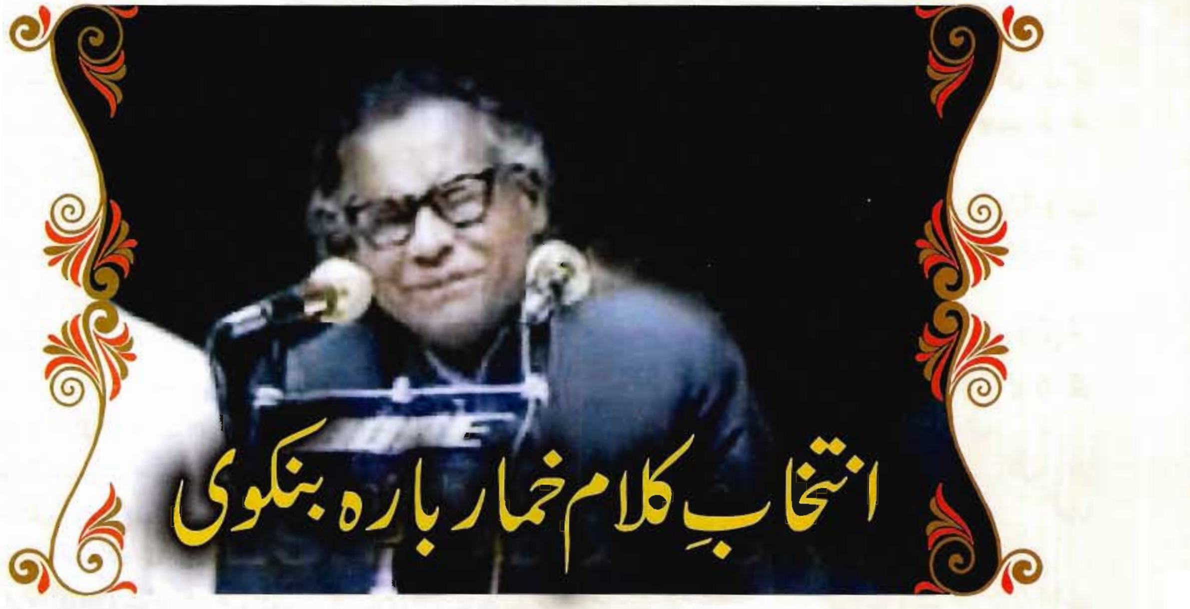

انتخابِ کلام خمار بارہ بنکوی

هم انھیں وہ ہمیں بھلا بیٹھے
وہ گنہگار زہر کھا بیٹھے
حال غم کہہ کے غم بڑھا بیٹھے
تیر مارے تھے تیر کھا بیٹھے
آندھیو! جاؤ اب کرو آرام!
ہم خود اپنا دیا بجھا بیٹھے
جی تو ہلکا ہوا، مگر یارو
رو کے ہم لطف غم بھلا بیٹھے
بے سہاروں کا حوصلہ ہی کیا
گھر میں گھبرائے در پہ آ بیٹھے
جب سے بچھڑے وہ مسکرائے نہ ہم
سب نے چھیڑا تو لب ہلا بیٹھے
ہم رہے مبتلائے دیر و حرم
وہ دبے پاؤں دل میں آ بیٹھے
اٹھ کے اک بے وفا نے دے دی جان
رہ گئے سارے باوفا بیٹھے
حشر کا دن ابھی ہے دور خمار
آپ کیوں زاہدوں میں جا بیٹھے

الٰہی ترکِ محبت نہ راس آئے مجھے
غریب دل سے بغاوت نہ راس آئے مجھے
کہیں انھیں بھی تڑپنا پڑے نہ میرے لیے
خدا کرے کہ محبت نہ راس آئے مجھے
گری جو برق مسرت تو غم کی قدر ہوئی
میں کہہ اٹھا کہ مسرت نہ راس آئے مجھے
تڑپ تڑپ کے بہ مشکل انھیں بھلایا ہے
مزا تو جب ہے یہ زحمت نہ راس آئے مجھے
تری نگاہِ عنایت کے میں نثار مگر
تری نگاہِ عنایت نہ راس آئے مجھے
سہے نہ جائیں گے ان کی ندامتوں کے ستم
الٰہی جرم شکایت نہ راس آئے مجھے
جو دوسروں کے غموں سے بنا دے بیگانہ
خمار ایسی مسرت نہ راس آئے مجھے

جب کبھی مجھ کو غم دہر نے ناشاد کیا
اے غم دوست تجھے میں نے بہت یاد کیا
اشک بہہ بہہ کے مرے خاک پر جب گرنے لگے
میں نے تجھ کو ترے دامن کو بہت یاد کیا
قید رکھا مجھے صیاد نے کہہ کہہ کے یہی
ابھی آزاد کیا، بس ابھی آزاد کیا
ہائے وہ دل مجھے اس دل پہ ترس آتا ہے
تو نے برباد کیا جس کو نہ آباد کیا
تجھ کو برباد تو ہونا تھا بہرحال خمار
ناز کے ناز کہ اُس نے تجھے برباد کیا

اکیلے ہیں وہ اور جھنجھلا رہے ہیں
میری یاد سے جنگ فرما رہے ہیں
الٰہی میرے دوست ہوں خیریت سے
یہ کیوں گھر میں پتھر نہیں آرہے ہیں
بہت خوش ہے گستاخیوں پر ہماری
بہ ظاہر جو برہم نظر آرہے ہیں
یہ کیسی ہوائے ترقی چلی ہے
دیے تو دیے دل بجھے جارہے ہیں
بہشتِ تصور کے جلوے ہیں میں ہوں
جدائی سلامت مزے آرہے ہیں
بہاروں میں بھی مے سے پرہیز توبہ
خمار آپ کافر ہوئے جارہے ہیں

حسن جب مہرباں ہو تو کیا کیجیے
عشق کی مغفرت کی دعا کیجیے
اس سلیقے سے ان سے گلہ کیجیے
جب گلہ کیجیے ہنس دیا کیجیے
دوسروں پر اگر تبصرہ کیجیے
سامنے آئینہ رکھ لیا کیجیے
آپ سکھ سے ہیں ترکِ تعلق کے بعد
اتنی جلدی نہ یہ فیصلہ کیجیے
زندگی کٹ رہی ہے بڑے چین سے
اور غم ہوں تو وہ بھی عطا کیجیے
کوئی دھوکا نہ کھا جائے میری طرح
ایسے کھل کے نہ سب سے ملا کیجیے
عقل و دل اپنی اپنی کہیں جب خمار
عقل کی سنیے، دل کا کہا کیجیے

زندگی ساقی بہت محفوظ میخانے میں ہے
کچھ تری آنکھوں میں ہے، کچھ میرے پیمانے میں ہے
پی بھی لے اے پیر صد سالہ ذرا سی پی بھی لے
مے نہیں زاہد، جوانی میرے پیمانے میں ہے
کون سی جنت کا واعظ کررہا ہے ذکر تو؟
ایسی اک جنت تو ہم رندوں کے میخانے میں ہے
اُس سے پوچھو جس کی امیدوں پہ پانی پھر گیا
کیا مزا منہ دیکھ کر خاموش رہ جانے میں ہے
مے کشوں کی دوزخ و جنت ہیں اے واعظ یہیں
ایک میخانے کے باہر، ایک میخانے میں ہے
آرزو شاید کوئی دم توڑتی ہے اے خمار
دھندلی دھندلی کچھ چمک دل کے سیہ خانے میں ہے

جھنجھلائے ہیں، لجائے ہیں پھر مسکرائے ہیں
کس اہتمام سے انھیں ہم یاد آئے ہیں
گزرے ہیں مے کدے سے جو توبہ کے بعد ہم
کچھ دور عادتاً بھی قدم لڑکھڑائے ہیں
انسان جیتے جی کریں توبہ خطاؤں سے
مجبوریوں نے کتنے فرشتے بنائے ہیں
سمجھاتے قبلِ عشق تو ممکن تھا بنتی بات
ناصح غریب اب ہمیں سمجھانے آئے ہیں
کعبے میں خیریت تو ہے سب حضرتِ خمار
یہ دیر ہے جناب یہاں کیسے آئے ہیں

کبھی جو میں نے مسرت کا اہتمام کیا
بڑے تپاک سے غم نے مجھے سلام کیا
ہزار ترکِ تعلق کا اہتمام کیا
مگر جہاں وہ ملے دل نے اپنا کام کیا
زمانے والوں کے ڈر سے اٹھا نہ ہاتھ مگر
نظر سے اس نے بصد معذرت سلام کیا
کبھی ہنسے کبھی آہیں بھریں، کبھی روئے
بقدرِ مرتبہ ہر غم کا احترام کیا
طلوع مہر سے بھی گھر کی تیرگی نہ گھٹی
ایک اور شب کٹی یا میں نے دن تمام کیا
دعا یہ ہے نہ ہوں گمراہ ہم سفر میرے
خمار میں نے تو اپنا سفر تمام کیا

مجھ کو شکستِ دل کا مزہ یاد آگیا
تم کیوں اُداس ہوگئے، کیا یاد آگیا
کہنے کو زندگی تھی بہت مختصر مگر
کچھ یوں بسر ہوئی کہ خدا یاد آگیا
برسے بغیر ہی جو گھٹا گھر کے کھُل گئی
اک بے وفا کا عہد وفا یاد آگیا
واعظ سلام لے کہ چلا میکدے کو میں
فردوسِ گمشدہ کا پتہ یاد آگیا
مانگیں گے اب دعا کہ اُسے بھول جائیں ہم
لیکن جو وہ بوقت دعا یاد آگیا
حیرت ہے تم کو دیکھ کے مسجد میں اے خمار
کیا بات ہوگئی جو خدا یاد آگیا

وہ خفا ہے تو کوئی بات نہیں
عشق محتاجِ التفات نہیں
دل بجھا ہو اگر تو دن بھی ہے رات
دن ہو روشن تو رات رات نہیں
دلِ ساقی میں توڑوں اے واعظ
جو مجھے خواہشِ نجات نہیں
ایسی بھولی ہے کائنات مجھے
جیسے میں جذبہ کائنات نہیں
پیر کی بستی جارہی ہے مگر
سب کو یہ وہم ہے کہ رات نہیں
میرے لائق نہیں حیات خمار
اور میں لائقِ حیات نہیں

یہ مصرع نہیں ہے وظیفہ مرا ہے
خدا ہے محبت، محبت خدا ہے
کہوں کس طرح میں کہ وہ بے وفا ہے
مجھے اس کی مجبوریوں کا پتا ہے
ہوا کو بہت سرکشی کا نشہ ہے
مگر یہ نہ بھولے دیا بھی دیا ہے
میں اُس سے جدا وہ مجھ سے جدا ہے
محبت کے ماروں پہ فضلِ خدا ہے
نظر میں ہے جلتے مکانوں کا منظر
چمکتے ہیں جگنو تو دل کانپتا ہے

انھیں بھولنا یا انھیں یاد کرنا
وہ بچھڑے ہیں جب سے یہی مشغلہ ہے
کبھی لمحے گننا کبھی سانسیں گننا
وہ بچھڑے ہیں جب سے یہی مشغلہ ہے
گزرتا ہے ہر شخص چہرہ چھپائے
کوئی راہ میں آئینہ رکھ گیا ہے
بڑی جان لیوا ہیں ماضی کی یادیں
بھلانے کو جی بھی نہیں چاہتا ہے
کہاں تو خمار اور کہاں فکرِ توبہ
تجھے پارساؤں نے بہکا دیا ہے

نہ ہارا ہے عشق اور نہ دنیا تھکی ہے
دیا جل رہا ہے ہوا چل رہی ہے
سکوں ہی سکوں ہے، خوشی ہی خوشی ہے
ترا غم سلامت، مجھے کیا کمی ہے
وہ موجود ہیں اور ان کی کمی ہے
محبت بھی تنہائی یہ دائمی
کھٹک گدگدی کا مزا دے رہی ہے
جسے عشق کہتے ہیں شاید یہی ہے
چراغوں کے بدلے مکاں جل رہے ہیں
نیا ہے زمانہ نئی روشنی ہے
جفاؤں پہ گھٹ گھٹ کے چپ رہنے والو
خموشی جفاؤں کی تائید بھی ہے
مرے راہبر! مجھ کو گمراہ کردے
سنا ہے کہ منزل قریب آگئی ہے
خمار بلا نوش تو! اور توبہ
تجھے زاہدوں کی نظر لگ گئی ہے

وہی پھر مجھے یاد آنے لگے ہیں
جنھیں بھولنے میں زمانے لگے ہیں
سنا ہے ہمیں وہ بھلانے لگے ہیں
تو کیا ہم انھیں یاد آنے لگے ہیں
ہٹائے تھے جو راہ سے دوستوں کی
وہ پتھر مرے گھر میں آنے لگے ہیں
یہ کہنا تھا ان سے محبت ہے مجھ کو
یہ کہنے میں مجھ کو زمانے لگے ہیں
قیامت یقیناً قریب آگئی ہے
خمار اب تو مسجد بھی جانے لگے ہیں

وہ کون ہیں جو غم کا مزہ جانتے نہیں
بس دوسروں کے درد کو پہچانتے نہیں
اس جبر مصلحت سے تو رسوائیاں بھلی
جیسے کہ ہم انھیں، وہ ہمیں جانتے نہیں
کم بخت آنکھ اٹھی نہ کبھی ان کے روبرو
ہم ان کو جانتے تو ہیں، پہچانتے نہیں
واعظ خلوص ہے تیرے انداز فکر میں
ہم تیری گفتگو کا برا مانتے نہیں
حد سے بڑھے تو علم بھی ہے جہل دوستو
سب کچھ جو جانتے ہیں وہ کچھ جانتے نہیں
رہتے ہیں عافیت سے وہی لوگ اے خمار
جو زندگی میں دل کا کہا مانتے نہیں

حالِ دل ان کو سناتے جایئے
شرط یہ ہے مسکراتے جایئے
آپ کو جاتے نہ دیکھا جائے گا
شمع کو پہلے بجھاتے جایئے
شکریہ لطف مسلسل کا مگر
گاہے گاہے دل دُکھاتے جایئے
دشمنوں سے پیار ہوتا جائے گا
دوستوں کو آزماتے جایئے
روشنی محدود ہو جن کی خمار
اُن چراغوں کو بجھاتے جایئے

اک پل میں اک صدی کا مزہ ہم سے پوچھیے
دو دن کی زندگی کا مزہ ہم سے پوچھیے
بھولے ہیں رفتہ رفتہ انھیں مدتوں میں ہم
قسطوں میں خودکشی کا مزہ ہم سے پوچھیے
آغاز عاشقی کا مزہ آپ جانیے
انجام عاشقی کا مزہ ہم سے پوچھیے
وہ جان ہی گئے کہ ہمیں ان سے پیار ہے
آنکھوں کی مخبری کا مزہ ہم سے پوچھیے
جلتے دلوں میں جلتے گھروں جیسی ضو کہاں
سرکار روشنی کا مزہ ہم سے پوچھیے
ہنسنے کا شوق ہم کو بھی تھا آپ کی طرح
ہنسیے مگر ہنسی کا مزہ ہم سے پوچھیے

امراؤ جان ادا کی غزل اور خمار بارہ بنکوی

خمار بارہ بنکوی عجیب قلندرانہ شخصیت کے مالک تھے۔ فلموں میں بھی انھیں کامیابی ملی اور مشاعروں میں بھی۔ کوئی اور ہوتا تو فلمی دنیا کو ترجیح دیتا مگر خمار نے پہلی ہی فلم میں زبردست کامیابی کے باوجود مشاعروں کی دنیا کو ترجیح دی۔ ان کے سپرہٹ گانے کے ایل سہگل، محمد رفیع، طلعت محمود، لتا منگیشکر اور گیتا دت جیسے عظیم گلوکاروں نے گائے اور موسیقار اعظم نوشاد کے علاوہ انھوں نے ناشاد کے لیے بھی گیت لکھے جو بعد میں پاکستان چلے گئے۔ تصویر بناتا ہوں تصویر نہیں بنتی، ناشاد نے ہی کمپوز کیا تھا۔

فلم مہندی، جس کے موسیقار روی تھے، مشہور ناول امراؤ جان ادا پر بنائی گئی تھی۔ امراؤ جان ادا کے ایک خاص مجرے کے لیے خمار صاحب نے اپنی ایک تازہ غزل روی کو دے دی اور تخلص میں جہاں خمار تھا وہاں امراؤ جان ادا کا تخلص ڈال دیا گیا۔ غزل لتا منگیشکر نے گائی تھی۔ غزل ہٹ ہوئی اور کئی لوگوں نے جو امراؤ جان کے افسانوی کردار کو کسی حقیقی کردار کا عکس مانتے تھے، یہ سمجھ لیا کہ یہ امراؤ جان ادا کی اپنی غزل تھی۔ خیر، فلم کا پریمیئر دیکھنے والوں میں مشہور فلم ساز گرودت بھی شامل تھے۔ انھیں یہ غزل اور اس کی دھن اس قدر پسند آئی کہ طے کرلیا جب بھی کوئی مسلم سوشل بیک گراؤنڈ والی فلم بناؤں گا تو اس کی موسیقی روی مرتب کریں گے۔ نتیجہ یہ کہ روی کو اس غزل کی بدولت چودہویں کا چاند جیسی فلم مل گئی جسے روی اپنی زندگی کا سنگ میل مانتے تھے۔ روی اور گرودت کی خواہش تھی کہ گانے خمار صاحب سے ہی لکھوائے جائیں۔ لیکن خمار ہاتھ نہیں آئے چنانچہ روی نے پہلی بار اپنی کسی فلم کے لیے شکیل بدایونی سے نغمے لکھوائے جنھوں نے مقبولیت کے کئی ریکارڈ توڑ دیے۔ یہ واقعہ مرحوم روی صاحب نے خود راقم کو ایک مرتبہ بتایا تھا اور کہا تھا کہ خمار صاحب فلمی زندگی میں کبھی کھپ نہیں پائے۔ ایک جگہ ٹک کر رہنا ان کی سرشت میں نہیں تھا اس لیے وہ مشاعروں ہی کی دنیا میں گھومتے رہے۔ یہاں فلم مہندی کی وہ غزل پیش ہے جسے آج بھی امراؤ جان کی تخلیق مانا جاتا ہے مگر ہے وہ خمار صاحب کی۔ ذرا دیکھیے۔ ایک ایک مصرعے سے خمار جھانکتے نظر آتے ہیں:

اپنے کیے پہ کوئی پشیمان ہو گیا — لو اور میری موت کا سامان ہو گیا
آخر کو رنگ لائیں مری بے گناہیاں — مجھ کو ستا کے وہ بھی پریشان ہو گیا
کیا راز ہے جو آنکھ ملا لی حضور نے — کیوں آج مجھ غریب پے احسان ہو گیا
یہ بہکی بہکی باتیں بھری بزم میں ادا — یہ آج کیا تجھے ارے نادان ہو گیا

نصرت ظہیر

ہم توبہ کرکے مر گئے قبل اجل خمار
توہین مے کشی کا مزہ ہم سے پوچھیے

جاتے تو ہیں صنم کدے سے حضرت خمار
لیکن خدا کرے کہ بن آئے نہیں بنے

بیتے دنوں کی یاد بھلائے نہیں بنے
یہ آخری چراغ بجھائے نہیں بنے
دنیا نے جب مرا نہیں بننے دیا انھیں
پتھر تو بن گئے وہ پرائے نہیں بنے
توبہ کیے زمانہ ہوا، لیکن آج تک
جب شام ہو تو کچھ بھی بنائے نہیں بنے
پردے ہزار خندۂ پیہم کے ڈالیے
غم وہ گناہ ہے کہ چھپائے نہیں بنے
یہ نصف شب یہ میکدے کا در یہ محتسب
ٹوکے کوئی تو بات بنائے نہیں بنے

ترے در سے اٹھ کر جدھر جاؤں میں
چلوں دو قدم اور ٹھہر جاؤں میں
اگر تو خفا ہے تو پروا نہیں
ترا غم خفا ہو تو مر جاؤں میں
تبسم نے اتنا ڈسا ہے مجھے
کلی مسکرائے تو ڈر جاؤں میں
سنبھالے تو ہوں خود کو تجھ بن مگر
جو چھو لے کوئی تو بکھر جاؤں میں
مبارک خمار آپ کو ترک مے
پڑے مجھ پر ایسی تو مرجاؤں میں

ملے ہیں احتیاطاً ان سے ہم بے گانہ وار اکثر
ادا کرنا پڑا ہے یہ بھی فرض ناگوار اکثر
خطائیں کرتے کرتے توبہ کرلی ہے خمار اکثر
تڑپ کر رہ گئی ہے رحمتِ پروردگار اکثر
وہ یوں آئے ہیں میرے سامنے بے اختیار اکثر
مجھے کرنا پڑا ہے آپ اپنا انتظار اکثر
بڑی مشکل سے دل مایوس ہوتا ہے محبت میں
کیا ہے میں نے اک پیماں شکن کا اعتبار اکثر
جو کانٹے بن کے کھٹکے ہیں دلوں میں اہلِ گلشن کے
بڑھایا ہے انھیں کانٹوں نے گلشن کا وقار اکثر
زمانہ ہوگیا ترکِ محبت کو مگر اب تک
محبت کام اپنا کرہی جاتی ہے خمار اکثر

کبھی شعر و نغمہ بن کے، کبھی آنسوؤں میں ڈھل کے
وہ مجھے ملے تو لیکن، ملے صورتیں بدل کے
یہ وفا کی سخت راہیں، یہ تمھارے پائے نازک
نہ لو انتقام مجھ سے، مرے ساتھ ساتھ چل کے
وہی آنکھ بے بہا ہے جو غمِ جہاں میں روئے
وہی جام جام ہے جو بغیر فرق چھلکے
یہ چراغِ انجمن تو ہیں بس ایک شب کے مہماں
تو جلا وہ شمع اے دل! جو بجھے کبھی نہ جل کے
نہ تو ہوش سے تعارف، نہ جنوں سے آشنائی
یہ کہاں پہنچ گئے ہم تری بزم سے نکل کے
کوئی اے خمار ان کو مرے شعر نذر کر دے
جو مخالفینِ مخلص نہیں معترف غزل کے

بجھ گیا دل حیات باقی ہے
چھپ گیا چاند رات باقی ہے
حالِ دل ان سے کہہ چکے سو بار
اب بھی کہنے کی بات باقی ہے
اے خوشا ختم اجتناب مگر
محشر التفات باقی ہے
عشق میں ہم سمجھ چکے سب سے
ایک ظالم حیات باقی ہے
ناصحانِ کرام کے دم سے
شورشِ کائنات باقی ہے
رات باقی تھی جب وہ بچھڑے تھے
کٹ گئی عمر رات باقی ہے
رحمت بے پناہ کے صدقے
اعتماد نجات باقی ہے
نہ وہ دل ہے نہ وہ شباب خمار
کس لیے اب حیات باقی ہے

اے موت انھیں بھلائے زمانے گزر گئے
آجا کہ زہر کھائے زمانے گزر گئے
او جانے والے آ کہ ترے انتظار میں
رستے کو گھر بنائے زمانے گزر گئے
غم ہے نہ اب خوشی ہے نہ امید ہے نہ یاس
سب سے نجات پائے زمانے گزر گئے
کیا لائق ستم بھی نہیں اب میں دوستو
پتھر بھی گھر میں آئے زمانے گزر گئے
جانے بہار بھول نہیں آدمی ہوں میں
آجا کہ مسکرائے زمانے گزر گئے
کیا کیا توقعات تھیں آہوں سے اے خمار
یہ تیر بھی چلائے زمانے گزر گئے

ہجر کی شب ہے اور اجالا ہے
کیا تصور بھی لٹنے والا ہے
غم تو ہے عینِ زندگی لیکن
غمگساروں نے مار ڈالا ہے
عشق مجبور و نامراد سہی
پھر بھی ظالم کا بول بالا ہے
دیکھ کر برق کی پریشانی
آشیاں خود ہی پھونک ڈالا ہے
کتنے اشکوں کو کتنی آہوں کو
اک تبسم میں اس نے ڈھالا ہے
تیری باتوں کو میں نے اے واعظ
احتراماً ہنسی میں ٹالا ہے
موت آئے تو دن پھریں شاید
زندگی نے تو مار ڈالا ہے
شعر، نغمہ، شگفتگی، مستی
غم کا جو روپ ہے نرالا ہے
لغزشیں مسکرائی ہیں کیا کیا
ہوش نے جب مجھے سنبھالا ہے
دم اندھیرے میں گھٹ رہا ہے خمار
اور چاروں طرف اجالا ہے

غمِ نہاں کو بھلایا مگر بھلا نہ سکے
لبوں کو چھیڑ لیا، دل سے مسکرا نہ سکے
کچھ ایسی نیند ترے غم کی چھاؤں میں آئی
کہ حادثاتِ زمانہ ہمیں جگا نہ سکے
مجھے تو اُن کی عبادت پہ رحم آتا ہے
جبیں کے ساتھ جو سجدے میں دل جھکا نہ سکے
گزر گیا کبھی ایسا بھی وقت مجبوری
کہ ہم بھی رو نہ سکے وہ بھی مسکرا نہ سکے
ہزار بار ہوئے خوش بھلا کے ہم اُن کو
مزا تو یہ ہے کہ اک بار بھی بھلا نہ سکے
اگر ہزار نشیمن جلیں تو فکر نہ کر
یہ فکر کر کہ گلستاں پہ آنچ آ نہ سکے
خمار اجل بھی نہ راس آئی ان غریبوں کو
جو زندگی کو حریفِ اجل بنا نہ سکے

ایسا نہیں کہ ان سے محبت نہیں رہی
جذبات میں وہ پہلی سی شدت نہیں رہی
ضعفِ قویٰ نے آمدِ پیری کی دی نوید
وہ دل نہیں رہا، وہ طبیعت نہیں رہی
سر میں وہ انتظار کا سودا نہیں رہا
دل پر وہ دھڑکنوں کی حکومت نہیں رہی
کمزوریِ نگاہ نے سنجیدہ کردیا
جلوؤں سے چھیڑ چھاڑ کی عادت نہیں رہی
ہاتھوں سے انتقام لیا ارتعاش نے
دامانِ یار سے کوئی نسبت نہیں رہی
پیہم طوافِ کوچۂ جاناں کے دن گئے
پیروں میں چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رہی
چہرے کو جھریوں نے بھیانک بنا دیا
آئینہ دیکھنے کی بھی ہمت نہیں رہی
اللہ جانے موت کہاں مرگئی خمار
اب مجھ کو زندگی کی ضرورت نہیں رہی

■

ماخذ: وکی پیڈیا اور دیگر ذرائع

مصنف: پروفیسر بپن چندر، مردلا مکھرجی، آدتیہ مکھرجی، کے۔ این۔ پانکر، سوچیتا مہاجن
مترجم: سعید احمد انصاری

حصولِ آزادی کے لیے پہلی بڑی جدوجہد

11/مئی 1857 کی صبح تھی۔ دہلی واسی ابھی نیند سے بیدار بھی نہیں ہوئے تھے کہ میرٹھ سے فرار سپاہیوں کا ایک دستہ جمنا ندی پار کر کے شہر میں داخل ہوا۔ ایک دن پہلے اس دستہ کے فوجیوں نے بھڑک کر اپنے انگریز افسر کو قتل کر دیا تھا۔ انھوں نے جنگی دفتر میں آگ لگا دی اور وہ لال قلعہ کی طرف روانہ ہوئے۔ لال قلعہ میں وہ راج گھاٹ گیٹ سے داخل ہوئے، ان کے پیچھے لوگوں کی ایک مشتعل بھیڑ تھی۔ سپاہیوں کا یہ دستہ مغل بادشاہ بہادر شاہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے پنشن یافتہ قیدی تھے، سے یہ اپیل کرنے آیا تھا کہ وہ اس کی قیادت کریں اور اس کے حق بجانب ہونے کی تصدیق کر دیں۔ چونکہ وہ سپاہیوں کی منشا سے بے خبر تھے اس لیے اس وقت ان کو گھبراہٹ سی ہوئی، انھوں نے یہ بھی سوچا کہ اس لڑائی میں ان کی ایسی بساط نہیں کہ کوئی اہم کردار ادا کرسکیں۔ بہر حال سپاہیوں نے ان کو جبر سے نہیں بلکہ خوشامد سے راضی کر لیا اور اعلان کر دیا کہ وہ شہنشاہ ہندوستان ہیں۔ اس کے بعد سپاہیوں نے شاہی دہلی پر قبضہ کرنے کی مہم شروع کر دی۔ کئی دوسرے انگریز افسروں کے علاوہ سائمن فریسر (Simon Fraser) جو کمپنی کا سیاسی ایجنٹ تھا، کو قتل کر دیا۔ سرکاری دفتروں پر یا تو سپاہیوں نے قبضہ کر لیا یا وہ سب برباد کر دیے گئے۔ 1857 کی یہ بغاوت اگر چہ ناکام رہی پھر بھی بدیسی حکومت کو ختم کرنے کی بہادرانہ کوشش کی شروعات اس سے ہو گئی تھی۔ دہلی پر قبضہ کرنے اور بہادر شاہ کو شہنشاہ کی حیثیت سے اعلان کرنے سے سیاسی بغاوت پر مثبت سیاسی اثرات مرتب ہوئے۔ اس سے لوگوں کے دلوں پر دہلی کے گزرے وقتوں کی شاہانہ عظمت کی یاد تازہ ہو گئی اور ان کی اجتماعی قوت میں خاصہ اضافہ ہوا۔

میرٹھ کی بغاوت اور دہلی پر قبضہ تو بس شروعات تھی۔ اس کے بعد پورا شمالی مغربی اور وسط ہندوستان سپاہیوں اور عوام کی بغاوت کے زد میں آ گیا۔ جنوبی ہندوستان بالکل خاموش رہا۔ پنجاب اور بنگال پر اس کا معمولی اثر پڑا۔

کمپنی نے دو لاکھ بتیس ہزار دو سو چوبیس (232224) سپاہیوں میں سے قریب نصف تعداد نے اپنی اپنی رجیمنٹوں کو چھوڑ دیا اور فوج کی حکم برداری کے اس اصول کو بالائے طاق رکھ دیا جس کو سخت ٹریننگ اور ڈسپلن کے ذریعہ ان کو سالوں سکھایا گیا تھا۔

یوں تو میرٹھ بغاوت کے پہلے بھی کئی چھاونیوں میں ناراضگی کی آواز اٹھ رہی تھی۔ بہرام پور کی انیسویں پیادہ فوج (Infantry) نے نئی قسم کی انفیلڈ رائفلوں (Enfield rifles) کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی وجہ سے مارچ 1857 میں اس کو برخاست کر دیا گیا۔ چونتیسویں نیٹیو انفینٹری (34th Native Infantry) کے جوان منگل پانڈے نے تو ایک قدم اور آگے بڑھ کر اپنے سرجنٹ میجر (Sergent Major) کو گولی مار دی۔ ان کو پکڑ لیا گیا اور پھانسی دے دی گئی۔ اس فوجی ٹکڑی کو بھی برخاست کر دیا گیا۔ ساتویں اودھ رجیمنٹ کے جوانوں نے بھی افسروں کا حکم نہیں مانا۔ دوسری رجیمنٹوں کی طرح اس کا بھی وہی حشر ہوا۔

دہلی پر قبضہ کرنے کے ایک ماہ کے اندر بغاوت کی آگ ملک کے مختلف مقامات۔ کانپور، لکھنؤ، بنارس، الہ آباد، بریلی، جگدیش پور، اور جھانسی تک پھیل گئی۔ انگریزوں سے لوگ بے حد نفرت کرتے تھے۔ باغیوں نے ہر جگہ انگریزوں کے پیر اکھاڑ دیے اور عام انتظام درہم برہم کر دیا۔ چونکہ باغیوں کے درمیان ان کا کوئی لیڈر نہیں تھا، اس لیے انھوں نے مقامی تعلقداروں،

نوابوں اور راجاؤں کو اپنے ساتھ کرلیا اور ان کو قیادت کی ذمہ داری سونپ دی۔ یہ لوگ برٹش حکومت کے ذریعہ کافی ستائے جا چکے تھے، اس لیے وہ باغیوں کے ساتھی بن گئے۔

کانپور میں باغیوں نے آخری پیشوا باجی راؤ ثانی کے گود لیے بیٹے نانا صاحب کو بغاوت کی کمان سونپی۔ انگریزوں نے نانا صاحب کی دراثت تسلیم نہیں کی تھی اور ان کو پونا سے جلاوطن کر دیا تھا۔ اس وقت وہ کانپور کے پاس رہ رہے تھے، لکھنؤ میں بیگم حضرت محل نے قیادت سنبھالی، لکھنؤ میں معزول نواب کے لیے عوام میں بڑی ہمدردی تھی۔ ان کے بیٹے برجس قدر کی نوابی کا اعلان کیا گیا اور حکومت چلانے کے لیے باقاعدہ بندوبست بھی ہوا۔ اہم عہدوں پر ہندو اور مسلمان برابر تعداد میں تعینات کیے گئے۔

بریلی میں روہیلکھنڈ کے سابق حکمراں کے وارث خان بہادر نے انگریزوں کے خلاف کمان سنبھال لی۔ وہ برٹش حکومت کے پنشن یافتہ تھے۔ اس لیے شروع میں انہوں نے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انگریز کمشنر کو حکومت کے سر پر منڈلانے والے خطرہ سے بھی آگاہ کیا، مگر بغاوت پھیلتے ہی انھوں نے خود انتظام سنبھال لیا اور چالیس ہزار جوانوں کو منظم کر کے ایک مضبوط فوج بنالی اور انگریزوں کے خلاف سختی سے ڈٹ گئے۔

بہار میں جگدیش پور کے زمیندار کنور سنگھ نے بغاوت کی قیادت کی۔ ستر سال کے زمیندار کنور سنگھ کو انگریزوں نے دیوالیہ کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ ان کی ساری جائیداد چھین لی گئی تھی۔ بار بار خوشامد کرنے کے باوجود انگریزوں نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اس لیے اندر ہی اندر وہ انگریزوں کے جانی دشمن ہو گئے تھے۔ اگرچہ انھوں نے بغاوت کرنے کا کوئی پروگرام نہیں بنایا تھا مگر جیوں ہی باغی سپاہیوں کا دستہ دینار پور سے آرا پہنچا، کنور سنگھ اس کے ساتھ ہو گئے۔

بغاوت کی سب سے نمایاں اور عظیم قائد رانی لکشمی بائی تھیں۔ انھوں نے جھانسی میں سپاہیوں کی کمان سنبھالی۔ انگریز گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی (Lord Dalhousie) نے ان کے شوہر کے مرنے کے بعد ان کے گود لیے (منہ بولے) بیٹے کو ان کی ریاست کا وارث بنانے سے انکار کر دیا تھا، اور ریاست ہڑپ پالیسی (Doctrine of Lapse) کے تحت جھانسی ریاست کو انگریزی سلطنت میں ملا لیا تھا۔ رانی نے اس فیصلہ کو بدلوانے کے لیے ہر چند کوشش کی۔ انھوں نے یہ بھی پیش کش کی کہ اگر وہ ان کی بات تسلیم کر لیں تو جھانسی کی طرف سے انگریزوں کو کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ مگر ان کی اپیل نہیں مانی گئی۔ مجبوراً انھوں نے سپاہیوں سے ہاتھ ملایا اور انگریزوں کی سب سے بھیانک دشمن ثابت ہوئیں۔

بغاوت کی یہ لہر صرف بڑے بڑے مرکزوں تک ہی محدود نہیں رہی۔ بنگال کی قریب قریب سبھی چھاؤنیوں اور ممبئی کی کچھ چھاؤنیوں کو اس نے اپنی زد میں لے لیا۔ صرف مدراس اس سے اچھوتا رہا۔ وہاں فوج وفادار بنی رہی۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ انگریز بہادر کے سپاہیوں نے بغاوت کیوں کی جب کہ فوجی نوکری سے ان کی مالی حالت مضبوط ہوتی تھی اور سماج میں ان کا وقار بڑھتا تھا۔

غیر یقینی مستقبل کے لیے انھوں نے اپنے فائدوں کو داؤں پر کیوں لگایا؟ اس کا جواب ہم کو دہلی میں سپاہیوں کے اس اعلان میں ملتا ہے ''ہم سب کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ انگریزوں نے ان دنوں کون کون سے طریقے اپنا رکھے ہیں۔ ایک تو وہ ساری ہندوستانی فوج کو بے دھرم کر رہے ہیں، دوسرا یہ کہ وہ لوگوں کو جبراً عیسائی بنا رہے ہیں اس لیے ہم سب اپنے تحفظ کے لیے متحد ہوئے ہیں اور ہم نے کسی کافر (Infidel) کو زندہ نہیں چھوڑا ہے اور ہم نے دہلی خاندان کی حکومت کو انھی بنیادوں پر دوبارہ قائم کیا ہے۔''

یہ بات بھی سچ ہے کہ کمپنی کی فوجی چھاونیوں میں نوکری کی کئی ایسی شرطیں تھیں جو خاص طور سے اتر پچھم صوبوں اور اودھ کے اونچی ذات کے ہندوؤں کے مذہبی جذبات اور عقیدوں سے ٹکراتی تھیں۔ شروع میں انگریز حاکموں نے سپاہیوں کے ان اعتراضات سے مصالحت کر کے ان کو اپنے مذہب اور ذات برادری کے تقاضوں کے مطابق رہنے کی سہولتیں دی تھیں۔ مگر جیوں جیوں فوج کی ذمہ داری بڑھتی گئی، ملک کے دوسرے حصوں کے علاوہ بدیسوں میں بھی ہندوستانی سپاہیوں کو بھیجا جانے لگا، پھر تو سہولتیں دینا ناممکن ہو گیا۔ اس کے علاوہ ذات پات کی تفریق اور علاحدگی سپاہیوں کے اتحاد میں مخل تھی۔ اس لیے حکومت نے اس سے نمٹنے کے لیے آسان طریقہ یہ نکالا کہ فوج میں برہمنوں کی بھرتی میں کمی کی جائے مگر اس کی یہ کوشش بھی بے کار ثابت ہوئی۔ انیسویں صدی کے وسط تک بنگال فوج میں برہمنوں ہی کا غلبہ بنا رہا۔

فوج کی ناراضگی سب سے پہلے اگست 1824 میں ظاہر ہوئی جب بیر کپور کی 47ویں ریجیمنٹ کو برما جانے کا حکم ملا۔ اس وقت مذہبی ہندوؤں کا سمندر پار جانا برادری سے اخراج تھا۔ اس لیے سپاہیوں نے برما جانے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ ریجمنٹ برخاست کر دی گئی اور اس کے لیڈروں کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ افغان جنگ کے دوران سپاہیوں کے مذہبی جذبات اور بھی زیادہ مجروح ہوئے۔ ان کو سب کچھ کھانے کے لیے مجبور کیا جاتا تھا۔ اس لیے جب وہ وطن واپس ہوتے، برادری ان کو قبول نہیں کرتی تھی۔ گاؤں اور گھر کے لوگوں کے دلوں میں یہ بات سما گئی تھی کہ انھوں نے برادری کی قدروں اور اصولوں کو بری طرح پامال کیا ہے۔ سیتا رام نام کا سپاہی جب افغانستان سے وطن لوٹا تب اس نے خود کو نہ صرف گاؤں بلکہ اپنی بیرک میں برادری سے خارج پایا۔ اس طرح کمپنی بہادر کی فوج میں نوکر ہونے کی ناموری اس کو سماج میں جگہ نہ دلا سکی اور مذہب و ذات برادری کہیں زیادہ طاقتور ثابت ہوئے۔

اور یہ افواہ بھی پھیلی کہ حکومت بڑی خاموشی سے مذہب تبدیلی کو بڑھاوا دے رہی ہے۔ اس سے سپاہی اور بھڑک اٹھے۔ سرکار اور عیسائی مشنری کے گہرے رشتوں سے افواہ کی تصدیق بھی ہوتی تھی۔ کچھ فوجی چھاؤنیوں میں ان مشنریوں کو عیسائی دھرم کے پرچار اور دوسرے دھرموں کی تنقید کی پوری آزادی تھی۔ سپاہیوں کی ناراضگی کا یہ بھی ایک سبب تھا۔ اس کے علاوہ آٹے میں ہڈی کا چورا ملائے جانے کی خبر اور انفیلڈ رائفلوں کے استعمال

رانی لکشمی بائی

نے سپاہیوں کے شبہ کو مزید بڑھا دیا۔ گریس (Grease) لگی کارتوسوں کو استعمال کرنے کے پہلے دانت سے کاٹنا پڑتا تھا۔ اس گریس کے بارے میں یہ خبر گرم تھی کہ یہ سور اور گائے کی چربی سے بنی ہوئی ہے۔ ان افواہوں کو دور کرنے کے لیے فوجی افسروں نے کوئی محنت نہیں کی۔ سپاہیوں نے یہی محسوس کیا کہ ان کا دھرم واقعی خطرہ میں ہے۔

ان کی ایسی بے اطمینانی صرف مذہب تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ وہ اپنی تنخواہ اور دیگر مشاہرے سے بھی مطمئن اور خوش نہیں تھے۔ پیادہ سپاہی کو سات اور گھوڑسوار کو ستائیس روپے بطور تنخواہ ملتے تھے۔ اسی رقم میں کافی پیسے اس کو اپنی وردی اور خوراک پر خرچ کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح آخر میں اس کے پاس ایک یا دو روپے ہی بچتے تھے۔ اس سے بھی زیادہ ناگوار بات اس کا یہ احساس تھا کہ اس کو اپنے ہی درجہ کے انگریز عملہ کو دی جانے والی رعایتوں سے محروم رکھا جارہا ہے۔ اس کو ہر سطح پر یہی احساس دلایا جاتا تھا کہ وہ محکوم اور ماتحت ہے۔ اسی لیے اس کے ساتھ ترقی اور رعایتوں کے سلسلہ میں امتیاز برتا جارہا ہے۔ ٹی آر ہومز (T.R.Holmes) نے لکھا ہے ''سپاہی جانتے تھے کہ وہ حیدر جیسی چاہے جتنی سپاہانہ بہادری و ذہانت کا ثبوت دیں، اس کو انگریز سپاہی کے برابر تنخواہ نہیں مل سکتی اور اس کی تیس سالہ وفا شعار فوجی خدمت بھی اس کو نئے انگریز افسر کی گستاخ ماتحتی سے نہیں بچا سکتی ہے۔'''

سپاہیوں کی بے اطمینانی فوج ہی تک محدود نہیں تھی عوام میں بھی بڑا غم وغصہ تھا۔ حقیقت میں سپاہی 'فوجی وردی' میں کسان ہی تو تھا۔ وہ گاؤں کی آبادی اور مٹی سے جڑا تھا۔ ایک فوجی افسر نے ڈلہوزی کو اس کی پالیسی کے ردعمل کے امکانی نتائج سے اس طرح خبردار کیا تھا ''آپ کی فوج ملک کے کسان باشندوں سے بنی ہے۔ کسان کے اپنے حقوق ہیں۔ اگر ان میں دست اندازی کی گئی تو آپ بہت دنوں تک فوج کی وفاداری پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ اگر آپ ہندوستان کے دستور ورواج میں مداخلت کرتے ہیں تو فوج ان کی ہمدرد ہو جائے گی کیونکہ فوج تو انھیں میں سے بنی ہے اور اس طرح لوگوں کے حقوق کی پامالی کا مطلب ہے فوجیوں کی خود یا ان کے بیٹوں یا ان کے رشتہ داروں کے حقوق کی پامالی۔''

ان دنوں اودھ کے تقریباً ہر خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد فوج میں بھرتی تھا۔ ایسے فوجیوں کی تعداد پچھتر ہزار (75000) تھی۔ اودھ میں ہونے والا ہر واقعہ ان سپاہیوں کو متاثر کرتا تھا۔ کاشتکاری کے نئے قانون جن کے تحت ضبط شدہ آراضی کو خیراتی اداروں کو دے دیا گیا تھا، اس سے ان کی خوشحالی بہت متاثر ہوتی تھی۔ ایسے سخت قانون کے خلاف فوجیوں کی طرف سے پندرہ ہزار عرضیاں دی گئیں تھیں۔ دہلی میں باغیوں کا اعلان اس بات کا ثبوت ہے کہ سپاہی انگریزی حکومت کی زیادتی کے خلاف کس قدر چوکنا تھے۔ اس لیے یہ عذر اپنے آپ میں انگریزی حکومت کے خلاف سپاہی بغاوت تھی۔ یہ سب اسی لیے ہوا کہ فوجی کسی نہ کسی طرح عوام سے جڑے تھے۔

سپاہیوں کی بغاوت کے ساتھ غیر فوجی بغاوت، خصوصیت سے شمالی مغربی صوبوں اور اودھ میں شروع ہو گئی۔ صرف مظفرنگر اور سہارنپور اس سے مستثنیٰ تھے۔ مغربی صوبے اور اودھ دو ایسے علاقے تھے جہاں سے لوگ بنگال فوج میں بھرتی کیے جاتے تھے۔ اس طرح سپاہیوں کی بغاوت کے ساتھ ہی عوام کی بغاوت چل پڑی۔ سپاہیوں کی بغاوت سے دیہی آبادی سرکاری خوف اور انتظامیہ کے اقتدار سے آزاد ہو گئی۔ اپنی دیرینہ پریشانیوں اور مصیبتوں کے اظہار کے لیے اس کی بھیڑ سڑکوں پر نکل پڑی۔ سرکاری عمارتیں برباد کر دی گئیں۔ خزانہ لوٹ لیا گیا، ہتھیاروں کا گودام تباہ کر دیا گیا، بیرک اور عدالتیں جلادی گئیں اور جیل کے پھاٹک کھول دیے گئے'' انگریزوں کے خلاف بغاوت کا اثر سماج کے ہر ایک طبقہ پر پڑا۔ زمیندار، کسان، دستکار، مذہبی پیشوا اور پجاری، نوکر پیشہ لوگ، دوکاندار اور ملاح سبھی اس بغاوت میں شامل ہو گئے۔ اس طرح سپاہیوں کی یہ بغاوت عوام کی بغاوت بن گئی۔

تانتیا ٹوپے

اس عوامی بغاوت کا سبب برٹش حکومت کے طور طریقوں میں ڈھونڈھا جاسکتا ہے۔ اس کے جبر وظلم سے سماج کے سبھی لوگ بری طرح متاثر تھے۔ لگان کے بوجھ سے کسان پست تھا۔ وہ قرض پر قرض لے کر برابر تنگ حال ہوتا جارہا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا واحد مقصد کم سے کم کوشش سے زیادہ سے زیادہ ٹیکس وصول کرنا تھا۔ کھیت کی پیداوار کا لحاظ کئے بغیر یہ بندوبست کیا گیا کہ ٹیکس جلدی سے جلدی وصول کر لیا جائے، مثلاً 1812 میں بریلی ضلع میں ٹیکس وصول کرنے کا کام صرف دس ماہ میں پورا کرنے پر رکارڈ قائم کیا گیا۔ ٹیکس کی شرح بڑھا دی گئی۔ اس کے نتیجہ میں چودہ لاکھ بہتر ہزار ایک سو اٹھاسی روپے زیادہ وصول ہوئے۔ سرکار نے خوش ہو کر ٹیکس محصلین کو ان کی انتھک محنت اور سرگرمی کے لیے شاباشی دی۔ اس نے اس بات پر مطلق غور نہیں کیا کہ اتنی بڑی رقم اتنے کم دنوں میں کیسے وصول کی گئی، اور کسان پر اس کا کتنا برا اثر پڑا۔ اس سے یہ صاف ہے کہ افسروں نے ٹیکس وصول کرنے کی غرض سے لوگوں پر بے حد ظلم ڈھائے تھے۔ ان لوگوں سے بھی ڈنڈوں کے زور سے ٹیکس وصول کیا گیا جن کے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ روہیلکھنڈ میں 56-1848 کے دوران دولاکھ سینتیس ہزار تین سو اٹھاسی (2,37388) روپیوں کی رقم لوگوں سے جبراً وصول کی گئی۔ ان کی تنگ دستی کا سرکار کو کچھ بھی خیال نہیں تھا۔ اس کو تو صرف ٹیکس سے دلچسپی تھی۔ بے حد خراب حالات میں کہیں کہیں معافی دی گئی۔ ایک کلکٹر نے اپنے علاقہ کی بنجر زمین کے بارے میں بار بار یہ رپورٹ حکومت کو دیا کہ گھاس کے علاوہ کوئی فصل وہاں نہیں اگتی ہے۔

نواب واجد علی شاہ

اس لیے وہ ٹیکس وصول کرنے میں لاچار ہے۔ اس اطلاع پر اس سے کہا گیا کہ گھاس تو اچھی پیداوار ہوتی ہے، اسی کو فروخت کرکے ٹیکس وصول کیا جائے گا۔

صرف کسان ہی نہیں پریشان تھے۔ زمیندار بھی انگریزی حکومت سے عاجز تھے۔ انھوں نے کم نقصان نہیں اٹھایا تھا۔ اودھ جو بغاوت کا خاص مرکز تھا، کے تعلقداروں کی جاگیریں ضبط کرلی گئی تھیں۔ ان کے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں بچا تھا۔ وہ بیچارے کام کر نہیں سکتے تھے اور بھیک مانگ نہیں سکتے تھے، پوری طرح کنگال بنادیے گئے تھے۔ مجبوراً انھوں نے ہندوستانی سپاہیوں کی حمایت کی اور بغاوت میں ان کے ساتھ اس امید پر ہوگئے کہ شاید ان کی کھوئی ہوئی جاگیران کو مل جائے۔

دستکار اور کاریگر بھی انگریزی حکومت کی وجہ سے مصیبت اور پریشانی میں تھے۔ اب وہ بے سہارا ہوگئے تھے ان کے پرانے سرپرست تعلقدار انہیں کی طرح لاچار و مجبور تھے۔ ان کی جاگیریں ضبط کرلی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ انگریزی حکومت کی پالیسی دیسی دستکاروں کی پستی کا سبب بنی ہوئی تھی۔ اس کا مقصد ہی یہاں کی دستکاری کو برباد کرکے انگریزی سامان کو ترقی دینا تھا۔ ملک کے ماہر دستکار اس طرح روزی روٹی سے محروم کر دیے گئے تھے۔ بیچارے دوسرے کام میں روزگار تلاش کرنے لگے، مگر روزگار تھا کہاں۔ جس تیزی سے دستکاری ختم ہوئی تھی، اتنی تیزی سے کارخانوں کا قیام نہیں ہوا تھا۔

افادیت پسندی (Utilitarianism) کے تحت سماج سدھار کے سلسلہ میں حکومت کے ذریعہ کی جارہی سرگرمی نے ہندوستانی عوام کو بری طرح ناراض اور بدظن کر دیا تھا۔ سبھی راسخ العقیدہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں یہ ڈر سما گیا تھا کہ حکومت عمرانی قانون (Social Legislature) بنا کر ایک طرف وہ ان کے مذہب اور کلچر کو برباد کرنے پر تلی ہے اور دوسری طرف وہ عیسائی تبلیغی اداروں (Missionaries) کو عیسائیت پھیلانے کے لیے مدد کر رہی ہے۔ اس طرح سبھی کٹر مذہبی لوگ انگریزی حکومت کے خلاف صف آرا ہوگئے۔ اس بات کا صاف صاف ذکر ہم کو باغیوں کے اعلانات میں بخوبی ملتا ہے۔

اس طرح عوام اور سپاہیوں کی ساجھا بغاوت 1857 میں جذباتی ابال کا بے مثل مظاہرہ تھا۔ اس سلسلہ میں قابل غور بات یہ ہے کہ یہ بغاوت اچانک ہوئی یا منصوبہ بند طریقے سے کی گئی۔ منصوبہ بند اور منظم تو اس لیے نہیں تھی کہ باغیوں نے اس کے بارے میں کوئی پختہ ثبوت نہیں چھوڑا ہے اور ان کے لیڈروں کے کام کرنے کا طریقہ بھی ایسا نہیں لگتا ہے کہ انھوں نے پہلے سے اس کے لیے کوئی منصوبہ یا پروگرام بنایا ہو۔ اگر انھوں نے ایسا سوچا بھی ہو، تو بس وہ ان کے ذہن میں ابتدائی حالت میں ہی رہا ہوگا۔

سپاہی جب میرٹھ سے دہلی پہنچے تو بہادر شاہ ظفر کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس کی خبر انھوں نے فوراً لیفٹننٹ جنرل کو بھیج دی۔ یہی کام رانی لکشمی بائی نے کیا۔ انھوں نے باغیوں کے ساتھ آنے میں تھوڑا وقت لیا۔ فیض آباد کے نانا صاحب اور مولوی احمد شاہ نے مختلف چھاونیوں سے خفیہ تعلقات بنا لیے تھے یا انھوں نے بغاوت کرنے کے لیے سپاہیوں کو اکسایا تھا، ان سب کے بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل پایا ہے۔ اسی طرح چپاتیوں اور کنول کے پھول کے ذریعہ خبر رسانی کی بات بھی ناقابل اعتبار ہے۔ ہاں یہ بات تو سچ ہے کہ میرٹھ واقعہ کے بعد ایک ماہ کے اندر بغاوت کی چنگاری دور دراز تک پھیل گئی۔

بغاوت سے پہلے چاہے کوئی منصوبہ نہ رہا ہو یا کوئی جماعت نہ بنائی گئی ہو، مگر بغاوت کے شروع ہوتے ہی باغیوں نے جتھہ بندی کی کوشش ضرور شروع کر دی تھی۔ دہلی پر قبضہ ہوتے ہی پاس پڑوس کی سبھی ریاستوں اور راجستھان کے حکمرانوں سے خط و کتابت کے ذریعہ بغاوت میں حصہ لینے اور مدد کرنے کی اپیل کی گئی۔ دس ممبروں پر مشتمل دہلی میں ایک عدالت انتظامیہ قائم کی گئی۔ ان کے چھ ممبران فوج سے اور چار سول صیغوں سے لیے گئے تھے۔ ان کے فیصلے کثرت رائے سے ہوتے تھے

بیگم حضرت محل

اور سارے کام کاج شہنشاہ کے نام پر کیے جاتے تھے۔ اس کے بارے میں ایک انگریز افسر نے لکھا تھا ''دہلی سرکار کی شکل آئینی فوج شاہی (Constititional Milorcacy) جیسی تھی۔ بادشاہ تو بادشاہ ہی تھا اور وہ اسی طرح معزز تھا۔ اس کا مرتبہ آئینی شہنشاہ جیسا تھا۔ پارلیمنٹ کے بجائے اس کے پاس فوجیوں کی ایک کونسل تھی جس کو سارے اختیارات حاصل تھے اور بادشاہ کسی بھی طرح فوجی کمانڈر نہیں تھا۔'' اسی طرح دوسری جگہوں پر بھی انتظامیہ کمیٹی بنانے کی کوشش کی گئی۔

بہادر شاہ کو باغیوں کے سبھی لیڈر اپنا شہنشاہ تسلیم کرتے تھے۔ انھیں کے نام کے سکے ڈھالے جاتے اور احکامات جاری کیے جاتے تھے۔ بریلی میں خاں بہادر خاں، مغل شہنشاہ کے نام پر حکومت چلاتے تھے۔ دوسری خاص اور اہم بات یہ تھی کہ باغی چاہے میرٹھ یا کانپور میں ہوں، ان کی پہلی خواہش دہلی جانے کی ہوتی تھی۔ سیاسی ادارہ یا انتظامیہ کی ضرورت سبھی باغی شدت سے محسوس کرتے تھے۔ جس سے کہ وہ ہاتھ آئی ہوئی کامیابی کو محفوظ کرسکیں، مگر انگریزوں کے جوابی حملہ کے سامنے ان کو موقع ہی نہیں ملا کہ وہ سحاب نما اپنے دھندلے خیالات کو عملی جامہ پہنا سکیں۔

باغیوں نے ایک سال سے بھی زیادہ مدت تک، سخت دشواریوں کے باوجود اپنی کوشش مسلسل جاری رکھی۔ ان کے پاس گولہ بارود اور نئے ہتھیار حاصل کرنے کی کوئی سبیل نہیں تھی۔ انھوں نے جو ساز و سامان برٹش ہتھیار خانوں سے حاصل کیا تھا وہ بہت دنوں تک نہیں چل سکا۔ وہ ایسے دشمن سے مقابلہ کر رہے تھے جو جدید

نانا صاحب

ترین اسلحوں سے لیس تھا اور وہ اس سے صرف معمولی بلّم، برچھا اور تلوار سے برسر جنگ تھے۔ ان سب کمیوں کے علاوہ خبر رسانی کا تیز رفتار ذریعہ ان کے پاس نہیں تھا۔ وہ بر وقت اپنے لوگوں سے رابطہ نہیں قائم کر سکتے تھے نیز وہ ان کی طاقت اور کمزوریوں سے بھی ناواقف تھے۔ اسی وجہ سے وہ مصیبت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کے لیے نہیں پہنچ سکے۔ ہر ایک کو اپنی لڑائی اکیلے ہی لڑنی پڑی۔

اگرچہ باغیوں کو لوگوں کی کثیر تعداد کی ہمدردی حاصل تھی، پھر بھی پورا ملک ان کے ساتھ نہیں تھا۔ تجارت پیشہ، تعلیم یافتہ اور دیسی حکمراں نہ صرف خاموش اور الگ تھلگ رہے بلکہ بڑی سرگرمی سے انگریزوں کی مدد کی۔ ان کے ذریعہ کلکتہ اور ممبئی میں میٹنگیں کی جاتیں اور ان کی فتح کی دعائیں ہوتی تھیں۔ ریاست ہڑپ پالیسی (Doctrine of Lapse) کے باوجود حکمراں انگریزوں کے ساتھ تھے۔ ان کے ساتھ وہ اپنا مستقبل محفوظ سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنی فوج اور دیگر ذرائع سے ان کی کھل کر مدد کی تھی۔ اگر یہی مدد سپاہیوں کو ملی ہوتی تو انھوں نے یقیناً زیادہ اچھا مقابلہ کیا ہوتا۔

سپاہیوں کی تقریباً آدھی تعداد نے نہ صرف بغاوت کی بلکہ اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف جنگ بھی کی۔ پانچ فوجی دستے جن میں سترہ سو (1700) انگریز اور تین ہزار دوسو (3200) ہندوستانی جوان تھے، کی مدد سے انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کرلیا۔ کشمیری گیٹ کو بم سے اڑانے کے کام کو چھ انگریز افسروں اور چوبیس ہندوستانیوں نے انجام دیا۔ ہندوستانیوں میں دس پنجابی اور بقیہ آگرہ و اودھ کے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ جھانسی کی رانی یا کنور سنگھ یا احمد اللہ جیسے کچھ معزز لوگوں کو چھوڑ کر سپاہیوں کو کوئی مدد ان کے لیڈروں کے ذریعہ نہیں ملی۔ ان کے زیادہ تر لیڈروں نے بغاوت کی اہمیت کو ہی نہیں سمجھا۔ اس لیے وہ بہت کچھ کرنے سے باز رہے۔ بہادر شاہ اور زینت محل کو اپنی فوج پر ہی بھروسہ نہیں تھا۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے انگریزوں سے گفت وشنید کرتے رہے۔ زیادہ تر تعلقداروں کو اپنی غرض سے مطلب تھا اور مان سنگھ جیسے لوگ تو حالات کے مطابق پالا ہی بدلتے رہے۔

صرف انگریزوں سے نفرت کرنے کی وجہ سے ہی باغیوں میں وقتی اتحاد پیدا ہوا تھا اس کے علاوہ نہ ان کے سامنے کوئی سیاسی نظریہ تھا اور نہ مستقبل کا واضح نقشہ۔ وہ صرف اپنے ماضی کے جاہ وجلال کے تصور میں غرق تھے اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو حاصل کرنے کے لیے برسر جنگ تھے۔ نیا سیاسی نظم قائم کرنے کی اہلیت ان میں مطلق نہیں تھی۔ ان کے بارے میں جان لارینس (John Lawrence) نے بہت سچ کہا تھا ''اگر ان میں (باغیوں میں) ایک بھی باصلاحیت لیڈر نکل آتا، تو ہم ہمیشہ کے لیے ہار جاتے''۔

ایسا مقدر میں ہی نہیں تھا۔ بہرحال باغیوں نے بے مثل ہمت، بہادری، ایثار وقربانی کا مظاہرہ کیا۔ ان میں سے ہزاروں نے اپنے عزیز ترین مقصد کے حصول کے لیے بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے موت کو گلے لگا لیا۔ ان کی اولوالعزمی سے کہیں زیادہ طاقتور برٹش فوج کی جوابی کاروائی تھی۔ سب سے پہلے 20 ستمبر 1857 کو دہلی کا زوال ہوا۔ طویل اور گھمسان لڑائی کے بعد بہادر شاہ نے ہمایوں مقبرہ میں پناہ لی۔ ان کو گرفتار کرکے برما بھیج دیا گیا۔ چونکہ دہلی باغیوں کی مجموعی پناہ گاہ تھی، اس لیے انگریزوں کا اس پر قبضہ ہوتے ہی بغاوت کی کمر ٹوٹ گئی۔ برٹش فوج نے ایک کے بعد ایک مرکز پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ جھانسی کی رانی نے 17 جون 1858 کو لڑتے ہوئے جان قربان کردی۔ جنرل ہیوگ روز (General Hugh Rose) جس نے ان کو ہرایا تھا، نے رانی کی تعریف یوں کی ہے ''مردہ پڑی یہ وہی عورت ہے جو باغیوں میں واحد مرد تھی۔'' نانا صاحب نے ہار نہیں مانی اور وہ شروع 1859 میں یہ امید لے کر نیپال چلے گئے کہ وہ دوبارہ جنگ کریں گے۔ کنور سنگھ نے ضعیفی کے باوجود بڑی چستی پھرتی دکھائی اور آخری سانس یعنی اپنی موت 9 مئی 1858 تک انگریزوں کو پتہ نہیں چلنے دیا کہ وہ کہاں

کنور سنگھ

ہیں۔ اپریل 1859 تک تانتیا ٹوپے نے بڑی کامیابی سے انگریز کے ساتھ گریلا لڑائی جاری رکھی مگر ایک زمیندار کی دغابازی سے وہ انگریزوں کے ذریعہ پکڑ کر شہید کردیے گئے۔

اس طرح ہندوستان میں انگریزی سلطنت کے سب سے بھیانک چیلنج کا خاتمہ ہوا۔ اب صرف قیاس آرائی ہی باقی ہے کہ انگریزوں کے خلاف اگر ہندوستانیوں کی بغاوت کامیاب ہوجاتی تو تاریخ کی سمت کیا ہوتی؟ اگر بغاوت نے تاریخ کے رخ کو مخالف سمت میں موڑ کر پرانے جاگیردارانہ نظام کو پھر سے قائم کردیا ہوتا، تو کیا نتائج نکلتے؟ یہاں ان باتوں پر غور کرنی کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر بھی اتنا تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ تمام تر خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود بدیسی حکومت سے ملک کو آزاد کرانے کی سپاہیوں کی کوشش حب الوطنی کا واضح ثبوت ہے۔ یہ ترقی پسندی کے تحت کیا گیا اہم کام تھا۔ اگر کسی تاریخی واقعہ کی اہمیت کو اس کی فوری کامیابی تک محدود نہ کیا جائے تو 1857 کی بغاوت صرف تاریخی ٹریجدی نہیں ہے بلکہ اپنی تمام ناکامیوں کے باوجود اس نے ایک عظیم مقصد کو پورا کیا۔ اس نے ملک کی تحریک آزادی کو وہ حوصلہ دیا جس کے تحت بعد میں وہ کچھ حاصل کرلیا گیا جو بغاوت میں حاصل نہیں ہوا تھا۔

■

ماخذ: حصولِ آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد 1857-1947، مصنف: پروفیسر بپن چندر، مردلا مکھرجی، آدتیہ مکھرجی، کے این پانکر، سوچیتا مہاجن، مترجم: سعید احمد انصاری، سنہ اشاعت: 2014، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

جاں نثار معین

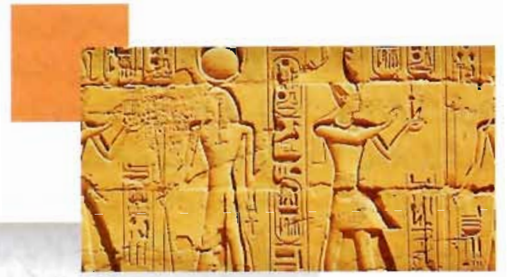

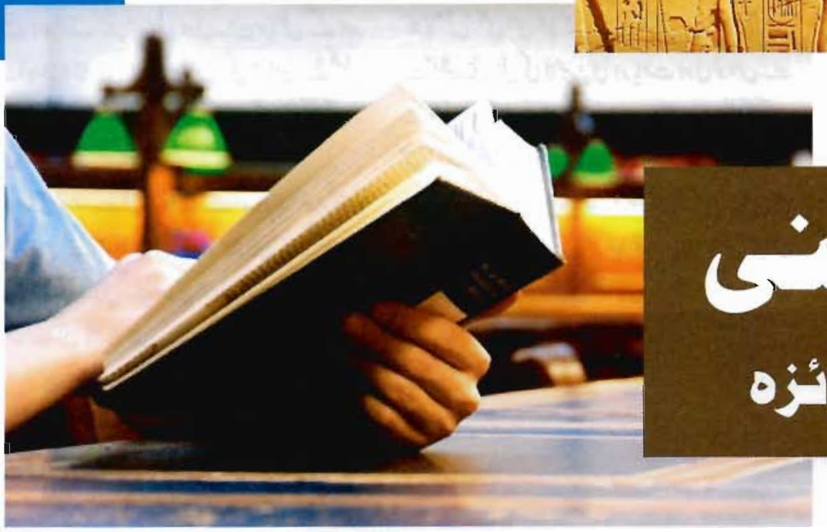

کتب بینی
کا تحقیقی جائزہ

لفظ کتاب' ذہن میں آتے ہی کئی صفحات پر مبنی کتاب کا تصور آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ کتاب کے معنی بقول سید عبدالرشید بن عبدالغفور الحسینی المدنی التتوی 'کتاب (ک مضموم، ت مشدد مفتوح، ا ساکن، ب موقوف) نوشتہ، تحریر، لکھا ہوا خط، نامہ، کتب جمع ہے، حکم اندازہ، فرض کیا ہوا، ضروری قرار دینا، اندازہ کرنا، لکھنا، غلام اور لونڈی کو مال کے عوض آزاد کرنا اس طرح آقا غلام سے کہے اگر اس مدت میں تو نے اتنا روپیہ دے دیا تو آزاد ہے، اگر اس غلام نے مقرر کردہ روپیہ مکمل ادا کردیا تو آزاد ہوگیا، ورنہ غلام ہی رہا، اور اس نے رقم کا جو حصہ آقا کو دیا ہے تو واپس نہیں لے سکتا۔'(1) جامع فیروز اللغات میں 'نوشتہ، نامہ، پوتھی، گرنتھ، جلد نسخہ، رسالہ، بہی۔ رجسٹر۔ بیاض کے ہیں۔ کتاب پڑھنے والے کو کتاب بین کہتے ہیں۔ فرہنگِ اَدبیات(2) میں سلیم شہزاد نے لفظی معنی لکھا ہے 'تحریر، اصطلاح متفرق یا موافق موضوعات پر تحریروں کا قلمی یا طبع شدہ مجموعہ۔' مختصر(3) اردو لغت میں معنی (ع) مونّث؛ لکھے ہوئے ورقوں کا مجموعہ، پستک' قاموس الاصطلات(4) میں لکھا ہے 'ورقی خیشوم۔ کتاب سا گلپھڑا' اللغات(5) کشور میں 'لکھا ہوا، نامہ فرض کیا ہوا، آزاد کرنا، غلام اور لونڈی کا بعوض مال۔' اس(6) طرح منجملہ بہی یا چٹھی میں لکھنا۔ حساب میں نام چڑھانا۔ رجسٹر میں داخل کرنا۔ لکھنا۔ کسی کے نام سے نشست محفوظ کرنا، مقالہ۔ باب۔ حصہ۔ دفتر، تحریر یا دستاویز۔ بہی کھاتا۔ کاغذوں کا سِلا ہُوا پلندا، اس کا فعل ہوگا 'نام لکھنا۔ محفوظ کرنا۔ رجسٹر میں درج کرنا۔ ٹکٹ خریدنا یا کاغذ یا چمڑے سے بنے ہوئے اوراق کا مجموعہ وغیرہ سے مستعمل ہے۔ کتب بینی کی جگہ کو 'دارالکتب' یا لائبریری کہا جاتا ہے۔

'کتب بینی' کا آغاز اسپین میں ہوا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ اسپین کے شمال مشرقی کیٹولینا میں ہر سال 23 مارچ سے 25 مارچ تک لوگ اپنی معزز خواتین کو پھول پیش کرتے اور مقبول فکشن یا ڈرامے سناتے تھے۔ بعد میں یہ روایت دیگر علاقوں میں بھی مشہور ہوگئی۔ آہستہ آہستہ اس رواج نے کتابوں کے عالمی دن کی شکل اختیار کرلی اور 1616 سے اس کی شروعات ہوئی۔ اس طرح یہ کتابوں کا عالمی دن بین الاقوامی سطح پر ایک سو سے زیادہ ممالک میں 23 اپریل کو منایا جاتا ہے۔ لیکن امریکہ اور برطانیہ میں یہ 4 مارچ کو منایا جاتا ہے۔ 1995 میں اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کی جنرل کونسل کا اجلاس فرانس میں منعقد ہوا اس کے تحت 23 اپریل کو ورلڈ بک ڈے اینڈ کاپی رائٹس ڈے قرار دیا گیا۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ کتاب کے عالمی دن کو منانے کا بنیادی مقصد عوام میں کتب بینی کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے۔

علم اور کتاب ایک سکے کے دو پہلو ہیں۔ جہاں علم کا ذکر ہوگا وہاں کتاب کا تذکرہ ضرور ہوگا۔ علم مشاہدات و تجربات سے حاصل ہوتا ہے۔ کتاب تمام مراحل سے گزرنے کا نام ہے۔ علوم وفنون کے سب دفتر کتاب ہی سے روشن ہیں۔ کتب اور علم سے دوستی معاشی خوشحالی کے علاوہ معاشرتی امن کی ضمانت ہوتی ہیں۔ گزشتہ قوموں نے جب کتابوں کا دامن چھوڑا تو وہ پست ہوگئیں۔ مسلمانوں کا زوال اس کی واضح مثال ہے۔ ہر فرد کی ترقی کتابوں میں چھپی ہوئی ہے۔ ایمان اور انسانیت کا تعلق بھی کتاب سے ہے۔ انبیا سے لے کر عام انسان تک سب کی ضرورت کتاب ہی رہی ہے۔ چاہے آسمانی ہو یا زمینی رنگ روپ بدل کر کتابیں ہمیشہ زمانے کی ضرورت بنی رہیں۔ مذہب اسلام میں بھی علم کا حاصل کرنا فرض ہے۔ جس کے لیے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ سب سے پہلے کاغذ اور کتاب کی ایجاد بھی چین میں ہی ہوئی (سوائے آسمانی کتب)۔

حضرت ادریس علیہ السلام نے سب سے پہلے قلم کا استعمال کیا تھا۔ ماہرین کے مطابق اولین تحریریں تصویری نوعیت کی تھیں۔ بعد میں زبانی الفاظ کو پتھروں پر نقش کیا جانے لگا۔ پھر مٹی کی بنی ہوئی تختیوں کا استعمال ہونے لگا۔ یہ سلسلہ ساتویں صدی قبل مسیح تک جاری رہا۔ چلی اور افریقہ میں مٹی کی تختیاں انیسویں صدی کے آخر تک لکھنے کے لیے استعمال کی جاتی رہیں۔ ابتدائی زبان اشاروں کی تھی۔ بعد میں نقوش اتار کر' یا تصاویر کے ذریعے ترسیل کی جاتی تھی۔ جیسے رنگوں کے لیے مخصوص چیزوں کا سہارا لیا جاتا تھا۔ رخ کا تصور تصویر سے کیا جاتا تھا۔ گنتی کے

لیے نشان بنائے جاتے تھے۔ مثلاً پانچ کے لیے ہاتھ کی تصویر بنائی جاتی تھیں۔ اس عمل سے کافی دشواریاں ہوتی تھیں۔ ایک فرد کی تحریر دوسرے شخص کو سمجھنے میں دشواری ہوتی تھی۔ یونانیوں اور مصری باشندوں کے علاوہ دوسری قوموں نے ابجد کی ابتدا تصویروں اور شکلوں سے کی۔ اس کے بعد حرف میں تبدیلی ہوئی۔ ان مراحل کے بعد آہستہ آہستہ اشاروں اور تصویروں کی زبان نے مکمل حروف کی شکل اختیار کرلی۔ لیکن اب بھی مشکل تھی۔ حروف تو بن گئے تھے لیکن اعداد نہیں بنے تھے۔

سامی قوم سے قبل حروف سے اعداد کا اظہار نہیں تھا۔ اسی قوم نے حروف کی تعداد سیکڑوں سے گھٹا کر درجنوں میں کی۔ اسی لیے سامی حروف سے ہی دنیا کے تمام حروف تہجی ماخوذ ہیں۔ جیسے عبرانی، عربی، یونانی، رومن، روسی اور ہندوستانی رسم الخط کا بھی بنیادی ماخذ سامی حروف ہی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عراق رضا زیدی نے لکھا ہے ’’کچھ محققین کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں کے حروف سامی حروف سے ماخوذ ہیں... آدم ثانی حضرت نوحؑ کے بیٹے کی ایجاد ہیں جن کا نام سام تھا۔‘‘ (7) حالاں کہ حروف کی ایجاد پہلے ہوئی یا ہندسوں کی ایجاد اس میں اختلاف ہے۔ حروف کی ایجاد کے بعد ہندسوں کی جگہ حروف کا استعمال مختلف اقوام میں ہوتا تھا۔ ہر رسم الخط کے لیے الگ الگ علامتیں مقرر تھیں۔

سنسکرت میں مخصوص چیزوں کے لیے گنتیوں کی نشاندہی حروف سے ہوتی تھی مثلاً ہاتھ کے لیے 2 لکھا جاتا تھا کیوں کہ انسان کے دو ہی ہاتھ ہوتے ہیں۔ ہر شکل کے حروف کی مناسبت سے نشان بنائے جاتے تھے۔ جس سے سمجھنے میں کچھ آسانی تو ہوتی تھی لیکن یاد رکھنا مشکل تھا۔ بالخصوص لمبے عرصے کے بعد یادداشتیں دھندلی ہو جاتی تھیں۔ مورخین نے ہندسوں کی بجائے حرفوں اور لفظوں کا سہارا لیا۔ جن حرفوں کے اعداد متعین کیے جا چکے تھے۔ ان سے تاریخ گوئی کا آغاز ہوا۔

اسی طرح کاغذ کی ایجاد سے پہلے قبل مسیح میں دریائے نیل کے کنارے انجیر کے درخت کی چھال سے کاغذ بنانے کے آثار ملتے ہیں۔ چین میں 105 عیسوی میں تسائی لن نے کاغذ ایجاد کیا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ سب سے پہلا چھاپہ خانہ بھی چین میں ہی قائم ہوا اور 868 میں وہاں سب سے پہلی کتاب چھپی۔

ابتدائی کتابوں میں حضرت موسیٰ کی ’تورات‘ ہے۔ اسی طرح دنیا کا قدیم ترین مسیحی رسم الخط ہزاروں سال قبل سیریا (قدیم شام)، فارس (قدیم ایران) اور میسوپوٹیمیا (قدیم عراق) میں رائج تھا۔ حضرت نوحؑ کے طوفان کے تذکرہ پر مبنی دنیا کی پہلی سب سے بڑی رزمیہ داستان ’گلگامش‘ بھی اسی خط میں ہے۔ عراق کے آثار قدیمہ سے ’اشور بنی پال کی لائبریری‘ دریافت ہوئی تو اس سے ملنے والی لغات اور گرامر کی تختیوں سے اس رسم الخط کو سمجھنے میں آسانی ہوئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ قدیم کتابوں کی مدد سے نئی کتابیں اور چھاپہ خانہ وجود میں آگیا۔ پہلا روسی چھاپہ خانہ کریملن نے قائم کیا تھا۔ پہلا ناشر ’ایوان فیدورووُ‘ تھا۔ اس وقت کی کتابیں قلمی تھیں لیکن قیمت

بہت زیادہ تھی۔ بعض کتابوں کے بدلے قیمت میں پانچ گاؤں کی زیر کاشت زمین طلب کی جاتی تھیں۔ پھر دھیرے دھیرے رسم الخط، زبان اور کتب بینی کا مزاج بنتا گیا۔ صدیوں بعد ہر زبان کے الگ رسم الخط تیار ہو گئے اور ساتھ میں کتابیں بھی اشاعت کی جانے لگیں۔ ابتدائی کتب کے نمونے آج بھی میوزیم میں موجود ہیں۔

ہمارے آباواجداد کی کتابیں ہماری وراثت ہے۔ ان کی حفاظت ہم پر فرض ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ تیرہویں صدی میں سقوطِ بغداد کے بعد عظیم کتب خانے کے وقیع ذخیرے کو دریائے فرات میں بہا دیا گیا تو پانی روشنائی سے سیاہ ہوگیا۔ نیز پندرہویں صدی کے آخر میں اندلس کی اسلامی حکومت ختم ہوئی تو ’غرناطہ‘ کے کتب خانے کو بھی آگ کی نذر کیا گیا۔ آج بھی لندن کی ’انڈیا آفس لائبریری‘ میں 6 لاکھ عربی، فارسی، ترکی اور اردو کی قلمی کتابیں موجود ہیں۔ پیرس لائبریری میں بھی بڑی تعداد میں کتابیں ہیں۔ 1857 میں انگریزوں نے سب سے اہم دہلی کے لال قلعے کی شاہی لائبریری سے ہزاروں کتابیں لوٹ کر لندن کے کتب خانے میں سجا دی۔ اس ضمن میں اقبال نے کتابوں کی اہمیت سے متعلق لکھا ہے:

وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں، تو دل ہوتا ہے سیپارہ

کتاب انسان کی بہترین دوست ہوتی ہے۔ علم و ہنر اور ذہنی استعداد میں بھی بے پناہ اضافہ کرتی ہے۔ قاری کو تاریخ، سیاسیات، معاشیات، فلسفہ، نفسیات، طبیعات، انجینئرنگ یا تکنالوجی کسی بھی قسم کی معلومات پہنچانے کا سبب بنتی ہے۔

مطالعے کی روایت اخلاقی، تہذیبی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی، نفسیاتی، سائنسی اور دیگر تمام علوم وفنونِ لطیفہ کو سنوارنے کی خدمات انجام دیتی ہیں۔ کتب سے ذہن کی آبیاری ہوتی ہے۔ تمام اقوام وتہذیبیں کسی کتاب کے تابع رہی ہیں۔ کسی بھی قوم، ملک وملت کی تہذیب کا نقطہ نظر متعین کرنے میں اہم خدمات انجام دیتی ہیں۔ ہر معتبر کتاب مقصدیت سے لبریز ہوتی ہے۔ کتابیں ہی اقوام کا اساسی ورثہ ہوتی ہیں۔ علم و ہنر کا اہم ذریعہ ہیں۔ نئے خیالات سے روشناس کراتی ہیں، دوسروں کے فہم و ادراک کو سمجھنے میں مددگار ہوتی ہیں۔ کتابوں سے ہی طاقتور معاشرہ بنتا ہے۔ کتابیں بہتر معاشرے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ملک وقوم کی تقدیر بدل سکتی ہیں۔

انٹرنیٹ کو ای لائبریری کہا جاتا ہے۔ جہاں ہر قسم کی معلومات ہر وقت موجود رہتی ہیں، بڑی تعداد میں آن لائن کتب کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ذی علم ہونا اور تکنالوجی سے واقفیت ہو تب ہی یہ ممکن ہے۔ ان وسائل سے بہت کم افراد فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ای لائبریری سے مستفید ہونے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ابھی بیشتر افراد کی جدید تکنالوجی سے واقفیت نہیں ہے۔ اسی لیے

اسی بکس کے برعکس روایتی انداز میں پڑھنا آسان ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کی چکا چوند کے باوجود آج بھی کتاب کی اہمیت مسلم ہے۔ انٹرنیٹ چیٹ کی وجہ سے کتب بینی کا شوق قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ انٹرنیٹ دنیا بھر کی ضرورت اور زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔ تقریباً تین ارب سے زائد لوگ انٹرنیٹ سے جڑے ہوئے ہیں۔ کتب بینی کی کمی جدید تکنالوجی ٹی وی، انٹرنیٹ، Media Social، فیس بک، کمپیوٹر وغیرہ کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ جب کہ ان ذرائع سے مطالعہ مزید مفید ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ باریک سے باریک نکات کی وضاحت بھی موجود ہے۔ برقی آموزش یا ای لرننگ بھی انٹرنیٹ سے عام ہوئی ہے۔

انٹرنیٹ سے براہِ راست کتب بینی کے رجحان میں ہر دن کمی ہو رہی ہے۔ لوگ اب کتب خانوں میں پڑھنے کے بجائے انٹرنیٹ پر پڑھنے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ کیوں کہ نئی اور پرانی کتابیں انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔ کم وقت اور خرچ سے زیادہ استفادہ ہوتا ہے۔ بد قسمتی سے معیاری کتابوں کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے۔ جس وجہ سے غریب طلبہ معیاری کتابوں سے محروم ہو رہے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی سے جہاں فائدہ پہنچ رہا ہے وہیں کتابوں سے دوری بھی پیدا ہو رہی ہے۔ کتب بینی کو عام کرنے میں عالمی اردو ٹرسٹ نے انقلابی قدم اٹھاتے ہوئے پاکٹ بکس کی اشاعت کی ہے جب کہ اردو کے تمام حلقوں نے ستائش کی ہے۔ پاکٹ بکس کی فروخت 2014 کے عالمی کتاب میلے میں کافی بہتر رہی ہے۔ تعلیمی درس گاہوں میں ریڈرز کلب قائم کیے جائیں تا کہ طلبا و طالبات میں کتابوں سے رغبت پیدا ہو سکے۔

معاشی سطح پر اہم تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ قصبوں اور شہروں میں زندگی تیزی سے بدل رہی ہے۔ کتابیں اس تبدیلی کا جائزہ مرتب کرنے میں ہماری مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر فورٹ ولیم کالج سے انگریز ہندوستان میں ایک زبان رائج کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ یہاں کی زبان اور علم کو سمجھ سکیں۔ تو انھوں نے کتابیں لکھوائیں جن کی مدد سے برصغیر کے باشندوں کے کلچر کو کمتر اور اپنی تہذیب اور خیالات کو برتر ٹھہرایا۔ اسی لیے کتب بینی ضروری ہے۔ تاکہ ہمارے مذہب اور ہمارے بزرگوں کی لکھی ہوئے کتابوں میں کسی قسم کا خلل نہ ہو۔ قاری ہی اپنی وسعتِ مطالعہ سے سچ اور جھوٹ میں فرق کو ملحوظ خاطر رکھ سکتے ہیں۔ کسی بھی کتاب کے پیچھے مقاصد کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے۔ اگر کتاب صحیح نہ ہو تو برائی کی ترغیب بھی دے سکتی ہے۔ اچھی اور معیاری کتابوں سے قومی اور ملی زندگی میں صحت مند رجحانات کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ نیز انسان اسناد سے مستند نہیں ہوتا بلکہ کتب بینی سے عالم کہلاتا ہے۔ انسان کی قدر و منزلت صرف علم پر مبنی ہے۔

کتب بینی سے قوم کا مستقبل تابناک ہو سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلے سرکاری ہو یا خانگی سطح پر عوام میں کتابی شعور جگا کر 'کتب بینی کلچر' کو فروغ دیا جائے۔ اسی لیے ہر چھوٹے بڑے شہروں اور گاؤں میں عوام الناس میں مطالعے کی عادت ڈالنے سے متعلق راقم نے چند اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔

کتب خانوں کی خدمات درست کی جائیں۔ قومی زبانوں میں معیاری کتب فراہم کی جائیں۔ تربیت یافتہ لائبریرین کی بحالی ہو۔ کشادہ ماحول اور بہتر فرنیچر کا انتظام کیا جائے۔ ہر شہر میں ڈائریکٹریٹ آف آرکائیوز اور لائبریریز قائم کی جائیں۔ شہروں اور دیہی علاقوں میں موبائل لائبریری سروس شروع کی جائے۔ جیسے قومی کونسل برائے فروغ اردو کی موبائل وین کتابوں کی فروخت ملک کے شہروں اور دیہی علاقوں میں جا کر کتاب کلچر کو فروغ دے رہی ہے۔ عوامی کتب خانوں سے کتابوں کے باہمی تبادلے کا نظام بھی قائم کیا جائے۔

کتب بینی کے تعلق سے عوام میں بیداری لائی جائے۔ کتب بینی' پر سمینار منعقد کیے جائیں، کتابوں کی قیمتوں میں کمی کی جائے، تمام اہم جگہوں پر پبلک لائبریریاں قائم کی جائیں، طلبہ کو سرکاری فنڈس سے ماحولیاتی، ادبی، لسانیاتی، مذہبی، اخلاقی، تہذیبی، سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، امورِ خانہ داری، تعلیم نسواں یا کم سے کم تمام نصابی کتب مفت تقسیم کی جائیں۔ جس طرح قومی کونسل برائے فروغ، اردو زبان، نئی دہلی اور دیگر سرکاری و خانگی اداروں نے کتابیں انٹرنیٹ پر مطالعہ یا ڈاؤن لوڈ مفت آن لائن نشر کی ہیں۔ اسی طرح کم از کم ہر سرکاری ادارے اپنی اپنی کتابوں کو مفت فراہم کریں۔ تاکہ ہر فرد کو معیاری کتب کا حصول آسانی سے ہو۔ ان نکات پر توجہ دے کر کتب بینی کے کلچر کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔

ماخذ:

(1) عبدالرشید بن عبدالغفور الحسینی المدنی التتوی، سید، منتخب اللغات، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2011، ص 591

(2) فیروز الدین، مولوی الحاج، جامع فیروز اللغات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ندارد، ص 990-989

(3) سلیم شہزاد، فرہنگِ ادبیات، منظرنما پبلشرز، مالیگاؤں، 1998، ص 572

(4) مختصر اردو لغت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2009، ص 732 (تیسری طباعت)

(5) شیخ منہاج الدین، پروفیسر، قاموس الاصطلاحات، مغربی پاکستان اردو اکادمی، لاہور، جون 1982، ص 91 (بار دوم)

(6) اللغات کشوری، پاکستان، ص 582

(7) عراق رضا زیدی، ڈاکٹر، فارسی میں تاریخ گوئی کی روایت، ملک بک ڈپو، دہلی 2006، ص 19

■

Jan Nisar Moin, Supervisor, Prof. Rehana Sultana Maulana Azad National Urdu University, Gachi Bowli, Hyderabad- 500032 (AP)

ہندوستانی ٹی وی سیریلز اور خواتین

عبدالقادر صدیقی

گلوبلائزیشن اور جدیدیت کے اس دور میں ملک کے دانشور اور مفکرین تمام شعبہ حیات میں خواتین کی بہتر نمائندگی چاہتے ہیں۔ ملک و ریاست کے قانون ساز ادارے آئے دن خواتین کو با اختیار بنانے کے لیے نئے نئے ایکٹ لا رہے ہیں اور نت نئی سفارشات دے رہے ہیں۔ لیکن ہمارا قومی میڈیا خواتین کے تعلق سے افراط وتفریط کا شکار ہے۔ آزادی کے نام پر یا تو اسے بازاری شے بنا دیتا ہے یا پھر رسم و رواج کی پاسداری کے نام پر اسے اسٹریوٹائپ شناخت دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس افراط وتفریط کا سب سے زیادہ شکار ہندستانی ٹی وی سیریلس ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہندوستان میں ٹی وی سیریلس اپنی ابتدا سے ہی خواتین میں مقبول عام ٹی وی Gener کی حیثیت رکھتا ہے۔ آیئے ایک تنقیدی نگاہ ہندوستانی ٹی وی سریلس کی تاریخ اور اس کی پیش کش پر ڈالتے ہیں۔

سوپ اوپیرا انگریزی کے دو لفظ soap یعنی صابن اور opera (ڈراما) کا مرکب ہے۔ چوں کہ ان فیملی ڈراموں کو امریکہ میں صابن بنانے والی کمپنی نے پروڈیوس کیا تھا، اس لیے اس کا نام کپڑے دھونے والے صابن (Soap) کے نام پر سوپ اوپیرا پڑا۔ سوپ اوپیرا یا سریل کی شروعات 1930 کی دہائی میں امریکی ریڈیو سے ہوئی، اس وقت امریکہ میں خواتین کی بہت کم تعداد برسرروزگار تھی بیشتر خواتین گھریلو بیوی کی حیثیت سے زندگی گزارتی تھیں۔ ان میں معاشی آزادی کا خیال اتنا گہرا نہیں ہوا تھا جتنا کہ آج ہے، وہ مردوں کی معاشی کفالت میں زندگی گزارتی تھیں دن کے اوقات مرد حضرات آفس چلے جاتے تھے خواتین اپنے گھروں پر رہا کرتی تھیں۔ پرائم ٹائم میں نیوز اور حالات حاضرہ کے پروگرام نشر کیے جاتے تھے جسے زیادہ تر مرد حضرات ہی سنتے تھے، امریکی ریڈیو کے ارباب اختیار نے سوچا کہ دن میں خواتین کے لیے گھریلو موضوعات پر سیریل ڈرامہ پیش کیا جائے، جس سے کمرشیل اشتہار حاصل ہوسکے۔ اس معاشی مفاد کے پیش نظر امریکہ میں سب سے پہلے ریڈیو سیریل کا آغاز ہوا۔ ہندستان میں ٹی وی کی شروعات 1959 سے ہوئی لیکن پہلا ٹی وی سیریل 'ہم لوگ' ریاستی اور نجی اسپانسروں کے تعاون سے 1984-1985 میں شروع ہوا۔ یہ سیریل ہفتے میں دو دن 20 منٹ کے دورانیہ کے ساتھ 156 قسطوں میں دور درشن پر دکھایا گیا۔ اس سوپ اوپیرا کا مرکزی خیال آبادی پر کنٹرول اور خاندانی منصوبہ بندی تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ خواتین کو بااختیار اور خاندانی ہم آہنگی کو بھی پیش کیا گیا تھا۔ دوسرا ٹی وی سیریل 'بنیاد' اس کے بعد شروع ہوا جس کی فکری اساس تقسیم وطن کا المیہ اور اس سے ملنے والا زخم تھا، اس سیریل کی کہانی کا مرکز ایک پنجابی فیملی تھی، جس نے 1947 ہندو پاکستان تقسیم کا المیہ برداشت کیا تھا۔ بعد میں اس کی کہانی گھریلو موضوعات پر مرکوز ہوگئی تھی۔ یہ سیریل 104 قسطوں میں ایک سال سے زائد عرصے تک دور درشن پر کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا تھا جو ناظرین کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ دور درشن پر ابتدا میں جو سوپ اوپیرا پیش کیے گئے ان میں سے کئی کی یادیں آج بھی لوگوں کے ذہن و دماغ میں محفوظ ہیں جیسے 'رجنی' (1985)، 'یہ جو زندگی ہے' (1984-86) اور 'نکڑ' (1986) اس کے علاوہ دوردرشن پر پیش کیے جانے والے دو اور ایسے سیریل تھے جو ہندوستانی ٹی وی سیریل کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ دونوں سیریلس ہندو مذہبی دیومالائی کہانی پر مبنی تھے۔ اس میں سب سے پہلے رامائن (1987-88) اور پھر 'مہابھارت' (1989-90) پیش کیا گیا۔ ان میں ہندو دیوی دیوتا بالخصوص رام اور کرشن دیوتا کے 'آدرش، زندگی کے تصورات کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ ان دونوں سیریلوں کے تئیں ہندو شردیالووں کے اندر ایک جنون تھا، جسے دیکھنے کے لیے لوگ کام کاج چھوڑ دیا کرتے تھے۔ بہت سے ناظرین اشنان اور پوجا پاٹ کر کے ٹی وی کے سامنے عقیدت سے بیٹھ جاتے تھے۔ اس کی مقبولیت اور اثر کو دیکھتے ہوئے بہت سے میڈیا ناقد اور ماہرین نے یہ محسوس کیا کہ دور درشن ایک مخصوص قوم اور مذہب کی تبلیغ کر رہا ہے، جو ہندوستان کے جمہوری اقدار کے منافی ہے۔ ان کو خدشہ تھا کہ اس طرح سے ایک قوم کی مذہبی روایات اور ثقافت کو قومی چینل سے پیش کرنے سے ملک کی حاشیہ نشیں اقلیتی قوموں کے تہذب و تمدن اور شناخت کے مٹنے کا خدشہ ہے، جو ہندوستان کی سیکولر شبیہ کے منافی ہے۔ لیکن بعد میں مسلم شخصیتوں مثلاً ٹیپو سلطان، بہادر شاہ ظفر اور اکبر اعظم پر بھی سیریل پیش کیے گئے جنھیں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

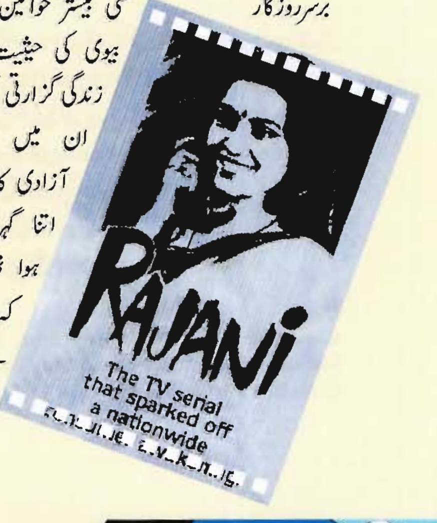

مذکورہ تمام سیریلس دوردرشن پر پیش کیے گئے تھے کیوں کہ 1990 تک ملک میں سیٹلائٹ چینل کی آمد نہیں تھی۔ سیٹلائٹ ٹی وی کی آمد کے ساتھ ہی ٹی وی میں نجی کرن کوفروغ ملا اور پرائیوٹ ٹی وی چینلس کا قیام ہونے لگا' اس سے جہاں ٹی وی پروگرام میں تبدیلیاں آئیں وہیں ٹی وی سیریلس کی کہانی 'فکر اور نشری اوقات میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ ابتدا میں نجی سیٹلائٹ چینلوں کے سیریل میں دوردرشن کا طرز نظر آیا لیکن جلد ہی وہ اس روایت سے

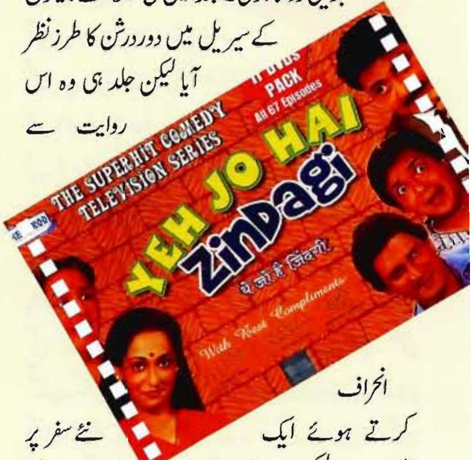

انحراف کرتے ہوئے ایک نئے سفر پر چل پڑے۔ لیکن یہ نیا سفر مغربی افکارو خیال سے متاثر تھا۔ ہندوستانی خواتین کی جوشبیہ ہندوستان میں تھی اسے بدلنے کی کوشش تو ہوئی لیکن اس میں دیانت داری کم اور منافع کا جذبہ زیادہ نظر آیا۔ محقق پریا راگھون (2008) کے مطابق نئے سریلس شانتی (1994) اور سوابھیمان (1995) کے ساتھ ہی ٹی وی سیریلس کی دنیا میں اہم تبدیلی دیکھنے کو ملی ایک طرف جہاں ٹی وی سریلس روزانہ دن میں دو بار نشر ہونے لگے۔ وہیں دوسری طرف اس کی کہانیاں ایلیٹ کلاس خواتین کی ذاتی اور مباشرتی زندگی پر مرکوز تھیں۔ اس کے بعد تو سیٹلائٹ ٹی وی چینلوں پر سوپ اوپیرا مشروم کے پودے کی طرح ہر طرف نظر آنے لگے۔ ساتھ ہی مشرق اور مغرب کی سوچ اورتہذیب میں جوحجاب تھا وہ ختم ہونے لگا۔ خواتین کی جو نئی شبیہ 1997-1996 کے مقبول سریلس میں نظر آئی وہ پہلے سے زیادہ گھناونی اوران کے سماجی رتبہ کوکم کرنے والی تھی۔ ان سیریلوں میں جو بہت مقبول ہوئے ان کی چند ایک مثال ملاحظہ ہو۔

حسرتیں: یہ ایک نوجوان لڑکی کی کہانی تھی جس کے اندر اپنی سگی ماں کے تئیں نفرت اٹڈتی رہتی ہے کیونکہ اس کی ماں کا اس کے والد کے علاوہ ایک دوسرے شخص سے ناجائز جسمانی تعلق رہتا ہے۔ جب یہ لڑکی جوان ہوتی ہے تو پھر یہ خود اپنے شوہر کے علاوہ کسی دوسرے شخص سے ناجائز تعلقات قائم کرتی ہے، اور بالآخر وہ اپنے شوہر اور ایک معصوم بچی کو چھوڑ اس شخص کے ساتھ چلی جاتی ہے۔

تارا : اس سیریل کا مرکزی کردار ایک خاتون تارا تھی جس کا ایک شادی شدہ مرد سے چکر چلتا ہے اور اس سے ایک بچی پیدا ہوتی ہے جسے وہ اپنی ممتا سے محروم رکھتی ہے اور اسے وہ اپنی ایک دوست کے حوالے کر دیتی ہے۔ جسے وہ اپنی بچی کی طرح قبول کرلیتا ہے۔ اسی درمیان تارا اپنے معشوق سے شادی کر لیتی ہے۔

اس طرح کی پیشکش اکیسویں صدی کے ابتدا تک چلتی رہی اس کے بعد جب کچھ مخالفتیں ہوئیں اور ہندوستانی تہذیب کی دہائی دی جانے لگی تو اس میں پھر ایک نئ تبدیلی دیکھنے کو ملی اور یہ نئ تبدیلی ایکتا کپور اور بالا جی ٹیلی فلم سے آئی' اس کے تحت جو ٹی وی سیریلس کا آغاز ہوا وہ ہندوستانی ہندو ایلیٹ کلاس اور ہندو مذہبی رسوم و رواج کو فروغ دینے والا تھا۔ ایکتا کپور کی ہدایت میں بنے ٹیلی ویزن سریلس پر میڈیا ناقدین اور خواتین کے حقوق میں کام کرنے والے ماہرین کا تبصرہ ہے کہ اس سے خواتین کی streotype شبیہ کو تقویت حاصل ہوئی اور اس کے بعد جتنے ٹی وی سیریلس بن رہے ہیں بیشتر اسی روش پر گامزن ہیں۔ جس میں ہندو پدرسری نظام کے تحت زندگی گزارنے والی خواتین کو بطور رول ماڈل یا ایک مثالی بہو کے پیش کیا جاتا ہے۔ بیشتر سیریلوں میں ایلٹ کلاس یا اپر مڈل کلاس فیملی کو پیش کیا جاتا ہے۔ جبکہ ہندوستان کی نصف سے زیادہ آبادی Lower middle کلاس سے تعلق رکھتی ہے۔ ایسے میں ان سیریلوں میں ان کے مسائل کلی طور پر نظر انداز ہوجاتے ہیں، ساتھ ہی انھیں اپنی زندگی کے مسائل کے لیے رول ماڈل بھی نہیں ملتے ہیں۔ جو فیملی دکھائی جاتی ہیں ان سے ان کی زندگی قطعی مختلف ہوتی ہے۔ فیمنسٹ مصنفہ کرن پرساد (2005) کے مطابق اس میں خواتین کی اسٹریوٹائپ شبیہ ہوتی ہے۔ جیسے کہ گھر کے تمام مرد جوائنٹ بزنس سے منسلک ہوتے ہیں، اور خواتین کے پاس سوائے چولھا چکی، غیبت اور ایک دوسرے کے خلاف سازش رچنے کے کچھ نہیں بچتا ہے۔ شوہر جب آفس سے گھر آتا ہے تو منہ پھلائے بیٹھے رہنا، پوچھنے پر ساس یا نند کی غیبت کرنا، گھر کو توڑنے کی باتیں کرنا وغیرہ۔ اس طرح کے سیریل کی کہانی میں خواتین کا کردار، مرد کی دلجوئی، چغل خوری، لوگوں کے کان بھرنا اور گھر توڑنے کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آتا ہے۔ خاندانی رشتوں میں آنے والی کھٹاس، مصیبتوں اور پریشانیوں کی ذمے داری خواتین پر ڈال دی جاتی ہیں۔ کرن پرساد کا ماننا ہے کہ اس طرح کی پیش کش سے پدرسری نظام کی جڑیں اور بھی مضبوط ہوتی ہیں۔ وہ خواتین Protagonists جو اپنے خیالات کا

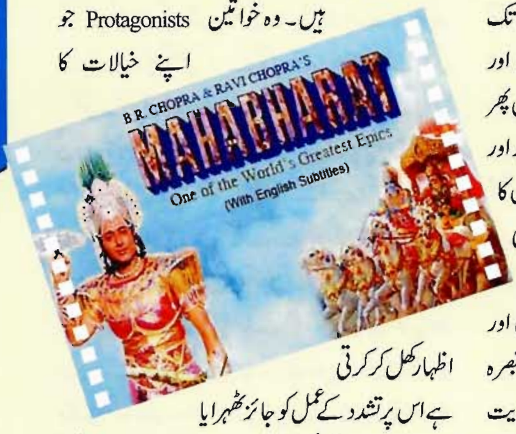

اظہار کھل کر کرتی ہے اس پرتشدد کے عمل کو جائز ٹھہرایا جاتا ہے۔ جب کوئی خاتون پدرسری سماجی اصولوں کی مخالفت کرتی ہے تو اس کی زندگی آزمائش میں ڈال دی جاتی ہے۔ درحقیقت ہندوستانی سریلس کے ذریعے خواتین کو یہی پیغام دیا جاتا ہے کہ خاموشی میں ہی عافیت ہے۔ فیمنسٹ محقق اور پروفیسر منشی (Munshi 2010) کے مطابق مذکورہ سریلس میں خواتین Protagonists کے کردار کو ہندو مذہبی دیو مالائی کہانی اور شخصیات کے معیار پر پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جس میں ایک مثالی بہو کو رمائن کے سیتا کے جیسا ہونا چاہیے۔ کیونکہ ساس بھی کبھی بہو تھی'' اور 'کہانی گھر گھر کی' کے مرکزی کرادار پر تنقید کرتے ہوئے پریا راگھون (2008) نے کہا ہے کہ: ''اس میں مثالی بہو کا جو کردار پیش کیا گیا ہے وہ قدیم ہندو پدرسری نظام کا مظہر ہے۔ دونوں سیریلس میں اس بات کا مقابلہ تھا کہ کون بہو کے کردار کو کتنے بہتر طور پر پدرسری نظام کے تحت پیش کرسکتا ہے۔ (Raghvan,2008) مشہور فلم کالمنسٹ نکہت کاظمی نے ان سیریلوں کی Protagonists کے متعلق 7 ستمبر 2007 کو روز نامہ Times of India کے سنڈے Sunday فلمی کالم میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا: ''ان سوپ اوپیرا میں مثالی بہو کی جو شبیہ پیش کی جارہی ہے اس میں وہ جذبات و احساسات اور انسانی خواہشات سے عاری ہوتی ہیں اور اپنے بیشتر اوقات شکایت کرنے، گپیں ہانکنے اور نکمّے پن کی ہوتی ہے'' وہیں ایک

فیمنسٹ کالمنسٹ Neera Cha dhoke اپنے کالم میں لکھتی ہیں اس طرح کے سیریلس میں خواتین کی پیش کش روایتی پدرسری نظام کے مطابق ہوتی ہے، جہاں وہ اپنے بنیادی حقوق سے بھی محروم نظر آتی ہیں۔"

حکومت نے 90 کی دہائی کے ابتدا میں ہی ملک میں حاشیہ نشیں خواتین کی زندگی اور سماجی رتبے میں مثبت تبدیلی کے پیش نظر جوشی کمیٹی کی تشکیل کی تھی جس کا مقصد خواتین کی زندگی میں بہتری لانے اور اسے با اختیار بنانے کے لیے تحقیق کرنے کو کہا تھا۔ 1984 میں جوشی کمیٹی نے اپنی رپورٹ سونپتے ہوئے یہ سفارشات کی کہ ٹی وی چینلوں پر دکھائے جانے والے تمام پروگرام میں خواتین کے پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے مرکزی کردار میں پیش کیا جائے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس سفارش کے بعد خواتین کو مرکزی کردار یا Protagonists کی حیثیت سے پیش کیا جانے لگا، لیکن جس نظریہ اور روایت کے تحت پیش کیا جاتا ہے وہ پدرسری سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔ حالیہ دنوں میں دکھائے جانے والے بیشتر سریلس میں خواتین کا جو کردار ہے وہ نئی بوتل میں پرانی شراب انڈیلنے کے مصداق ہے۔ ایکتا کپور کی پیش کردہ روایت ٹوٹتی نظر نہیں آرہی ہے کیوں کہ اس کے بعد کے جتنے بھی سیریلس آرہے ہیں چند ایک کو چھوڑ دیں تو سب اسی روش پر گامزن نظر آتے ہیں۔ "نہ آنا اس دیس لاڈو" (2009-2012) کا موضوع بہت ہی حساس تھا لیکن اس کا پلاٹ خواتین کے کردار کو مجروح کر رہا تھا۔ خواتین کے حق میں کام کرنے والے ادارے اور میڈیا ناقدین کا ماننا تھا کہ یہ سوپ اوپیرا (نہ آنا اس دیس لاڈو) خواتین کے بنیادی

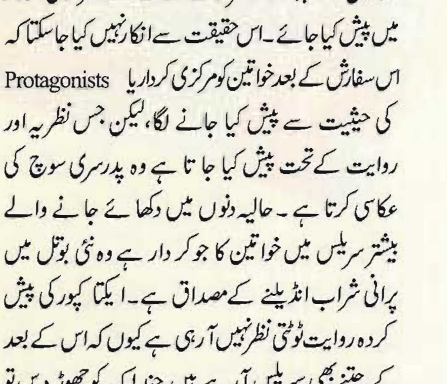

حقوق اور آزادی کو سلب کرنے والا ہے۔ ان کو حیرت تھی کہ کس طرح سے ایک خاتون دوسری خواتین کی خواہش اور آرزو سلب کر رہی ہیں۔ میڈیا ناقدین کا ماننا تھا کہ اس طرح کی پیشکش سے ہندوستانی سماج میں خواتین پر منفی اثر پڑے گا۔ ویمنس کمیشن آف انڈیا کی چیئرمین گرجا ویاس نے IANS کو بیان دیتے ہوئے کہا تھا: "اس طرح کی پیش کش خواتین کی شبیہ کو بگاڑنے والی اور ان کی تذلیل کرنے والی ہے، جس کے ذریعے خواتین کے عزت نفس اور وقار کو مجروح کیا جارہا ہے۔ اسی طرح 'اترن' (2008-13) ' بالیکا ودھو (2008-14) اور اس پیار کو کیا نام دوں (2011-12) اگر چہ بہت مقبول ہوئے ہیں ان کے مرکزی کردار خواتین ہی ہیں لیکن پدرسری (Patriarchal) روایت توڑنے اور اسٹریو ٹائپ شبیہ سے ابھرنے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ جیسا کہ "اس پیار کو کیا نام دوں" میں ارنو (Arnav) کی مغربی ذہنیت والی گرل فرینڈ لونیا (Lavanya) ایک طرف جنسی شے (Sex object) نظر آتی ہے تو دوسری طرف خوشی کماری گپتا ہر وقت بھاری میک اپ میں دقیانوسی شبیہ کی ترجمان نظر آتی ہے۔ بالیکا ودھو' اترن اور اس پیار کو کیا نام دوں جیسے سیریلس کے اہم کردار کی بات کی جائے تو اس میں پیش کردہ تینوں ہی Protagonists کا تعلق کمزور معاشی بیک گراؤنڈ سے ہے۔ ایسے میں اگر ان کردار کو مثالی کردار بنا کر پیش کیا جاتا تو خواتین ناظرین کے لیے مشعل راہ بنتا۔ لیکن افسوس کہ اس پر توجہ نہیں دی گئی۔ آنندی کے کردار کی بات کی جائے تو کچھ حد تک قابل قبول ہوسکتا ہے۔ لیکن اچھا (Ichcha) اور 'خوشی' کی پیش کش بہت ہی مایوس کن رہی ہے۔ Ichcha اور 'خوشی' دونوں ہی کردار کی ابتدا معاشی مسائل سے پریشان فیملی کے ساتھ ہوتی ہے، دونوں کے اندر حوصلہ اور جذبہ موجود ہے۔ ہمیں امید تھی کہ ان کے اس حوصلے اور جذبے کو کسی منزل تک پہنچا کر اسے خواتین کے لیے ایک مثال بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ جیسا کہ وٹی وی سیریلس نے اپنی اچھی اور بری پیش کش کی تاریخ میں ایک سیریل 'اڑان' (1989-91) پیش کیا تھا جو ایک حقیقی کہانی پر مبنی تھا۔ اڑان ایک ایسا ٹی وی سیریل تھا جس میں ایک Lower مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی کے IPS آئی پی ایس آفیسر بننے کی محنت و لگن اور اس کی جدو جہد کو دکھایا گیا تھا۔ شاید خواتین کو با اختیار بنانے والا یہ پہلا ہندوستانی سیریل تھا، جس کی کہانی اس کے ڈائرکٹر کویتا چودھری کی بڑی بہن کی حقیقی زندگی پر مبنی تھی۔ جو اپنی جدو جہد اور خود اعتمادی کے سہارے مشکل حالات کا سامنا کرتے ہوئے ملک کی پہلی خاتون ڈائرکٹر جنرل آف پولیس بننے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ اس سیریل نے خواتین ناظرین کو زندگی میں کچھ پانے، کچھ کر دکھانے اور اپنی صلاحیت کا لوہا منوانے کے لیے حوصلہ بخشنے والا تھا۔ اس سیریل نے حقیقی

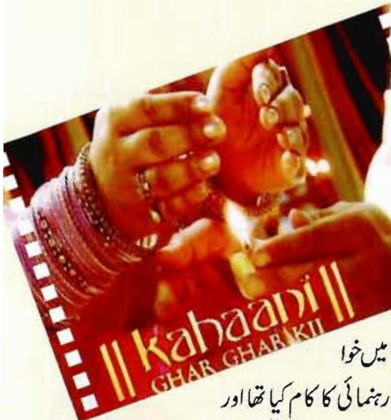

معنوں میں خواتین کی رہنمائی کا کام کیا تھا اور انھیں پدرسری نظام کے طلسم کو توڑنے کا حوصلہ دیا تھا۔ اسی طرح سونی ٹی وی پر (2003-2007) میں کولمبیائی ریڈیو اور ٹی وی ڈراما Yo soy Betty, la fea کا ہندوستانی روپ "جسی جیسی کوئی نہیں (Jassi Jaissi Koi Nahin" پیش کیا جانے والا سریل خواتین کو بااختیار بنانے والا تھا۔ ایسے ہی مذکور سریلس کی Protagonists بھی ایسی کوئی چھاپ چھوڑ سکتی تھیں۔ لیکن افسوس انھیں دقیانوسی روایت کی جانب موڑ دیا گیا۔ اس طرح کی پیشکش کے ساتھ ٹی وی میڈیا خواتین کی حاشیہ نشیں حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہوئے، اور ان کے جدید مسائل اور ضرورتوں سے انحراف کی راہ اختیار کررہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ رول ماڈل protagonist کے لیے ہمارے ملک میں بااختیار اور کامیاب خواتین کی مثالیں موجود نہیں ہیں۔ سروجنی نائیڈو، اندرا گاندھی، سونیا گاندھی، مایاوتی اور ممتا بنرجی جیسی کتنی ہی خواتین کی کامیاب زندگی پر مبنی سیریلس بنائے جاسکتے ہیں۔

ماخذ

Ang, Ien. Dallas Soap Opera and the Melodramatic Imagination. London.Methuen.1985

Doordarshan. Doordarshan. New Delhi. Prasar Bharati Corporation of India. 1998

Gerbner. G and Gross. Larry. Journal of Communication. 197

Geraghty. C. Women and Soap Opera. Cambridge. PolityPress. 199

Women and Soap-Operas: Popularity, Portrayal and Perception: Dr. Aaliya Ahmed ,Media Education Research Centre, Kashmir University, India

Raghavan Priya, Family, Politics and Popular Television:An Ethnographic Study of Viewing an Indian Serial MelodramaSchool of Communication, 2008

■

Abdul Quadir Siddiquee, Ph.D, Research Scholar, Room 107, Old Boys Hostel, Ghchibowli, Hyderabad - 500032

تبصرہ و تعارف

نصوح کا خواب

مصنف: حفیظ عباسی

صفحات: 124، قیمت: 14 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر: شاہد اقبال، شعبۂ اردو، دیال سنگھ کالج، نئی دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مرکزی حکومت کا سب سے بڑا ادارہ ہے جو اردو کے فروغ کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد اردو کی ترقی یا منصوبے بنانا اور ان کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کلاسکی ادب کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب پر بھی خاصی توجہ دیتی ہے۔ اس سلسلے کی کتاب 'نصوح کا خواب' ہے جو بچوں کے ادب سے تعلق رکھتی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'نصوح کا خواب' کو حفیظ عباسی نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب مولوی نذیر احمد کے ناول 'توبۃ النصوح' سے ماخوذ ہے۔ مولوی نذیر احمد کا نام اردو ادب میں محتاج تعارف نہیں۔ یہ وہی مولوی نذیر احمد ہیں جن سے اردو ناول کا آغاز ہوا۔ مولوی نذیر احمد کو اردو زبان و ادب پر قدرت اور عبور حاصل تھا۔ نذیر احمد نے اردو ادب کو یکے بعد دیگرے کئی ناول دیے ہیں۔ ان میں توبۃ النصوح کی حیثیت مسلم ہے۔

حفیظ عباسی نے نصوح کا خواب، کو 12 حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ توبۃ النصوح ایک ایسی کتاب ہے جو بچوں کی ذہنی نشو و نما کے ساتھ ساتھ والدین کو بھی نصیحت کرتی ہے۔ اس میں کرداروں کی کمی نہیں ہے۔ مرکزی کردار نصوح ہے۔ دوسرے کرداروں میں نصوح، فہمیدہ، کلیم اور نعیمہ ہیں۔ اس کتاب میں اخلاقی، مذہبی، دینی اور اسلام سے متعلق باتیں کی گئی ہیں۔ ناول میں مکالمہ سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ زبان کی سلاست اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

کلیم جو خدا کی نافرمانی کرتا ہے والدین کی قدر نہیں کرتا ساتھ میں نعیمہ جو خدا کی عبادت کو صرف تفریح سمجھتی ہے یہ دونوں خسارے میں پڑ جاتے ہیں۔ اس واقعہ سے بچوں کو نصیحت کے ساتھ ساتھ ہدایت بھی ملتی ہے۔

اس کتاب میں ماں، باپ کی اپنے بچوں کے اوپر کیا ذمے داریاں ہیں اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس ناول کے ذریعے غلط کاموں سے پرہیز کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اچھے کردار، اچھے اخلاق اور دین داری کا نمونہ بننے کا درس دیا گیا ہے۔ گھر میں دین کا ماحول نہ ہونے کی وجہ سے بچوں پر کیا برے اثرات مرتب ہوتے ہیں اس پر زیر تبصرہ کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

'نصوح کا خواب' کے مطالعے سے ہمارے ذہن میں کئی طرح کے سوالات ابھرتے ہیں۔ مثلاً بچوں پر والدین کی کیا ذمے داریاں ہیں؟ کیسے ان کی پرورش کرنی چاہیے؟ وغیرہ۔

زیر تبصرہ کتاب بچوں کے علمی، اخلاقی اور ذہنی تربیت میں مددگار ثابت ہوگی۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن قومی کونسل نے 1999 میں شائع کیا تھا اور دوسرا 2003 میں اب اس کی تیسری اشاعت بھی ہمارے پیش نظر ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب بچوں کی ذہنی نشو و نما میں اہم کردار ادا کرے گی۔

تعلیمی نفسیات

مصنفہ: طلعت عزیز

صفحات: 242، قیمت: 96، سنہ اشاعت 2013

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

مبصر: ذاکر فیضی، کمرہ نمبر E-146، برہمپترا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

تعلیم کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب نے تعلیم کی اہمیت کو تسلیم کیا اور انسان کے لیے نہایت ضروری قرار دیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'تعلیمی نفسیات' کی مصنفہ پروفیسر طلعت عزیز خود پیشے سے معلّمہ رہی ہیں۔ اس لیے وہ اس پیشے کی مشکلوں اور نزاکتوں کو سمجھتی ہیں۔ طالب علموں کے نفسیاتی مسائل پر وہ غور و فکر کرتی رہی ہیں۔ بقول مصنفہ ''اس کتاب کے ذریعے میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اساتذہ انسانی زندگی کی وقعت سمجھیں اور اپنے طالب علموں کو اپنے عمل سے بہترین انسان بننے میں ان کی مدد کریں۔''

پروفیسر طلعت عزیز نے اپنے علمی سفر میں بچوں کے ادبی ٹرسٹ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کی کئی کتابوں کے تراجم کیے ہیں۔ ان میں ایک اہم کتاب 'کاربن۔ قدرت کا انمول تحفہ' ہے۔

کتاب 'تعلیمی نفسیات' چار ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل 'تعلیمی نفسیات' کے عنوان سے ہے جس میں کئی ذیلی عنوانات قائم کر کے تعلیمی نفسیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان میں سے ایک عنوان 'تعلیم: معنی اور ارکان' میں انھوں نے ہمیں یہی بتانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا میں جب بچّہ آتا ہے تو فطری طور پر دوسروں کا محتاج ہوتا ہے، اسے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دوسروں کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے جیسے بچّہ بڑا ہوتا ہے وہ اپنے آس پاس کے ماحول کو اور انسانی و غیر انسانی چیزوں کو دیکھتا ہے اور مانوس ہونے لگتا ہے۔ پروفیسر طلعت عزیز لکھتی ہیں کہ 'تعلیم ایک لگاتار چلنے والا عمل ہے۔ اس ذیلی عنوان کے تحت مصنفہ نے مختلف ماہرینِ تعلیم اور مفکرّین کے اقوال کے ذریعے اپنی بات کو آگے بڑھایا ہے۔ انھوں نے ماہرینِ تعلیم کے لیے تعلیمی نفسیات کی اہمیت، اسکول انتظامیہ کے لیے تعلیمی نفسیات کی اہمیت اور اساتذہ کے لیے تعلیمی نفسیات کی اہمیت پر اپنے خیالات و افکار کا اظہار کیا ہے۔

بابِ دوم نمو اور نشو و نما (groth and develpment) پر لکھا گیا ہے۔ اس باب میں مصنفہ نے انسان کی نشو و نما کو مختلف درجات میں تقسیم کیا ہے، جو درج ذیل ہیں:

(1) جسمانی نشو و نما، (2) ذاتی نشو و نما، (3) معاشرتی نشو و نما، (4) وقوفی نشو و نما، (5) سماجی اور جذباتی نشو و نما

ان تمام نقطوں پر انھوں نے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

''بچّوں کی معاشرتی اور جذباتی نشو و نما پر ان کی تربیت کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ جیسے جیسے بچّہ بڑا ہوتا ہے والدین چاہتے ہیں کہ وہ ایک فرمانبردار بچّہ بنے، ماں باپ کا کہنا مانے، جیسا وہ چاہتے ہیں بچّہ ویسا کریں، معاشرے کے آداب سیکھیں اور والدین کی خواہشات کا احترام کریں، اس درمیان وہ اکثر بچّوں کی خواہشات اور ضروریات کو

نظر انداز کردیتے ہیں۔ (ص 98)

اس کے آگے صفحات میں وہ ہمیں بتاتی ہیں کہ بہت سے والدین سخت مزاج اور اصولوں کے پابند ہوتے ہیں اور بچّوں کے حکم نہیں ماننے پر ان کو سزا دیتے ہیں، یہ سزا جسمانی اور ذہنی دونوں قسم کی ہوتی ہے، ایسے والدین کے بچّے ہمیشہ خوفزدہ رہتے ہیں اور آگے چل کر وہ جھوٹ اور بے ایمانی کا سہارہ لیتے ہیں اور اپنی غلطی کو محسوس بھی نہیں کرتے۔

اس باب کے آگے کے صفحات میں فرد کی نشو و نما سے متعلق ماہرین تعلیم کے نظریات کو پیش کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ماہرین تعلیم کا تعارف بھی دیا گیا ہے۔ وہ ماہرین تعلیم ہیں: سگمنڈ فرائڈ (1856-1929)، ابراہم ہیرالڈ میسلو (1908-1970)، ایرک ہمبر گر ایرکسن (1902-1994)، جین ولیم فرِٹز پیاجے، جیروم سیمور برونر (1915) وغیرہ۔

باب سوم کا موضوع، ذہن اور ذہانت ہے اس موضوع پر مصنفہ نے بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ مذکورہ باب میں بھی مختلف ذیلی عنوانات جیسے دماغ اور ذہن، تربیتِ معلومات اور یاداشت، ذہانت وغیرہ قائم کیے گئے ہیں اور اس پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس باب میں بتایا گیا ہے کہ قدرت کی تخلیق کردہ چیزوں میں سب سے پیچیدہ شئے انسان کا دماغ ہے۔ اس کی صلاحتیں لامحدود ہیں۔ انسان کا ذہن کمپیوٹر کی طرح کام کرتا ہے۔ کمپیوٹر کی ہی طرح وہ معلومات اکٹھا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی مفید معلومات ہمیں اس باب سے ملتی ہیں، جو ہمارے علم میں اضافہ کرتی ہیں۔

کتاب کا آخری اور چوتھا باب 'آموزش' ہے۔ کسی فرد کے علم یا برتاؤ میں تجربات کی بنیاد پر ہونے والی دائمی تبدیلی آموزش یا اکتساب کہلاتی ہے۔ یہ تبدیلی بامقصد یا بے مقصد طریقے سے ہوسکتی ہے۔ پروفیسر طلعت عزیز کا ماننا ہے کہ ماہرین نے اپنے تجربات کی بنیاد پر آموزش کے مختلف طریقوں کو بیان کیا ہے۔

آموزش کی تعریف، آموزش کی ماہیت اور خصوصیات اور آموزش کو متاثر کرنے والا عمل۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ پروفیسر طلعت عزیز کی یہ کاوش ایک بہترین اور کامیاب کوشش ہے۔ یقیناً علمی و تعلیمی حلقوں میں اس کتاب کی پذیرائی ہوگی اور اساتذہ اور طالب علم اس 'تعلیمی نفسیات' میں اپنی نفسیات کا علاج تلاش کریں گے۔

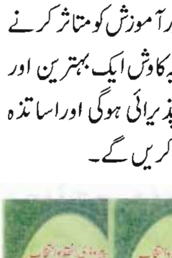

پیروڈی: نقد و انتخاب (جلد اوّل و دوم)

مرتبہ: امتیاز وحید

صفحات: جلد اوّل: 354، و دوم: 368

قیمت: جلد اوّل: 118، و دوم: 133، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر: عمیر منظر، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی لکھنؤ کیمپس

زیر تبصرہ کتاب 'پیروڈی: نقد و انتخاب' دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلد اول میں پیروڈی کے فکر و فن اور اس کے نظری مباحث پر تنقیدی مقالات شامل ہیں، جبکہ دوسرے حصے میں نثری پیروڈیوں کا جامع انتخاب ہے۔ اس انتخاب کو اس لحاظ سے اہمیت بلکہ اولیت کا درجہ حاصل ہے کہ اردو میں نثری پیروڈیوں کا یہ پہلا انتخاب ہے۔

تحقیق کے دوران ان کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا انھی ساعتوں میں امتیاز وحید نے یہ طے کرلیا کہ اب اس راستے کو ایسا ہموار اور مسطح کردینا ہے کہ آئندہ کسی کو اس فن میں مواد کی تنگ دامانی کا شکوہ نہ کرنا پڑے اور نہ کوئی یہ کہہ سکے کہ اردو میں اس صنف سخن میں نقد و تنقیح کا قافیہ تنگ ہے۔

جلد اول چار مباحث 'نقد و نظر'، 'منظوم پیروڈیاں'، 'نثری پیروڈیاں' اور 'پیروڈی نگار' پر مشتمل ہے۔ نقد و نظر کے تحت پیروڈی کے فن، روایت اور معاصر تصورات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس حصے میں چودہ (14) مقالے شامل ہیں۔ ان کے مطالعے سے پیروڈی کے صنفی مباحث پوری طرح واضح ہوجاتے ہیں۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ ''پیروڈی کا اطلاق صحیح طور پر اس ادبی تقلید پر ہوگا جس میں مصنف نے کسی طرز نگارش یا طرز فکر کی خامیوں کو یا ان پہلوؤں کو جن کو وہ کمزوریاں سمجھتا ہے، نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ اس لحاظ سے پیروڈی تنقید کی ایک لطیف قسم ہے مگر بعض اعتبارات سے عام تنقید سے زیادہ موثر اور کارگر (ص: 30) اس حصے میں پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر قاضی افضال حسین، پروفیسر شہپر رسول، ڈاکٹر مظہر احمد اور غلام احمد فرقت کاکوروی کے مضامین شامل ہیں۔ اپنی کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مضامین اور پس ساختیاتی تناظر میں، پروفیسر قاضی افضال حسین کا مضمون موجود متن کے بطن سے پیروڈی کی شکل میں ایک نئے متن کی بازیافت پر بحث و تمحیص کی دعوت دیتا ہے۔ صنفِ پیروڈی کی بازآوری میں بلاشبہ یہ مضمون اساسی کردار کا حامل ہے۔

'نثری پیروڈیوں' کے ضمن میں قطب الدین اشرف کا مقالہ 'اردو نثر میں پیروڈی کا فنی ارتقا' کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں اس موضوع پر نہایت خوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ قطب الدین اشرف نے تنقیدی مباحث کے ساتھ ساتھ نثری پیروڈیوں کی مثالیں بھی کثرت سے دی ہیں، جن سے صنفِ پیروڈی میں فن پاروں کی نقالی کی اصل حقیقت سے آشنائی ہوتی ہے۔ پیروڈی نگار کے طور پر پطرس بخاری، شیخ نذیر، کنھیا لال کپور، شہباز امروہوی، راجہ مہدی علی خاں، ڈاکٹر شفیق الرحمٰن، احمد جمال پاشا اور ظفر کمالی کے فکر و فن کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔ اس زمرے میں مرتب نے شہباز امروہوی اور ظفر کمالی کی پیروڈیوں کا نہایت سلیقے سے تجزیہ کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ پیروڈی سے متعلق کوئی گوشہ تشنہ نہ رہ جائے۔

کتاب کی صرف یہی خوبی نہیں کہ اس میں قدیم ادبی رسائل سے صنف پیروڈی پر مقالے جمع کیے گئے ہیں بلکہ ان کی ایک عمدہ ترتیب بھی قائم کی ہے، جس کی وجہ سے پیروڈی کے فن اور اس کے متعلقات بیک نظر سامنے آجاتے ہیں اور کسی قدر انھیں سمجھنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔

دوسری جلد میں 25 پیروڈی نگاروں کی نثری پیروڈیوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ باون صفحات پر مشتمل طویل مقدمہ بھی ہے جس میں پیروڈی کی ادبی تاریخ، صنفی حیثیت، انگریزی اور اردو میں اس کی روایت اور انتخاب میں شامل پیروڈیوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ مقدمے میں فکر تونسوی، مشفق خواجہ اور ظفر کمالی کی پیروڈیوں کے تجزیے سے امتیاز وحید کے ادبی ذوق اور فن پیروڈی پر ان کی دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔ بلاشبہ امتیاز وحید نے ان جائزوں میں خود کو فکر کی آنچ پر کندن کیا ہے۔ فکر تونسوی کی پیروڈی کی تہہ میں تقسیم ہند کے المناک واقعے کی نشاندہی، مشفق خواجہ کو پیروڈی نگار کی حیثیت سے دیکھنا اور ظفر کمالی کی پیروڈیوں کی تفہیم فاضل مرتب کی شرح کو پڑھے بغیر ممکن نہیں اسی طرح جدیدیت پر اے رحمان کی پیروڈی کو ڈھونڈ نکالنا بھی محقق کا کارنامہ ہے۔

اس جلد میں فاضل مرتب کی وہ تحریر جو 'قصہ پیروڈی کے انتخاب کا' کے نام سے شامل کتاب ہے، پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اتنی پیروڈیوں کو جمع کرنے اور کئی برسوں تک اس فن پر غور کرنے کے نتیجے میں اس طرح کی تحریر خوش آئند بات ہے۔ یقیناً ڈاکٹر امتیاز وحید کو اپنی اس تحریر کے بعد قلبی سکون ملا ہوگا اور یہی تخلیق کا امتیاز بھی ہے کہ جس سے آج کی تحقیق و تنقید کا دامن خالی ہے۔

ملک کے بیشتر اردو کے شعبوں میں طنز و مزاح کا ایک پرچہ ہے جس میں پیروڈی بھی

شامل ہے۔ اب تک طلبہ نے وزیر آغا، ڈاکٹر مظہر احمد اور بعض دوسری ضمنی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ اس کتاب کے آجانے کے بعد طلبہ براہ راست اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ بہتر ہوگا کہ دوسرے ایڈیشن میں کتاب کی دوسری جلد میں مختصراً ہی سہی پیروڈی نگاروں کا تعارف دے دیا جائے نیز جامعات کے نصابات کو سامنے رکھ کر اس انتخاب کو مزید بہتر کیا جائے۔

جلد اول میں ''ص: 129 پر میر کا مصرع غلط کمپوز ہوگیا ہے۔ (ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی) صفحہ 304 پر حفیظ میرٹھی سے منسوب شعر دراصل حفیظ جونپوری کا ہے۔ صفحہ 305 پر جواب شکوہ کا جو بند نقل کیا گیا ہے اس کے چوتھے مصرعے میں 'گل' کی جگہ 'مگر' درست ہے۔

خیالِ یارِ مہرباں

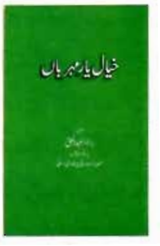

مرتب: پروفیسر عبدالحق
صفحات: 243، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: پروفیسر عبدالحق، 2315، ہڈسن لائن، کنگز وے کیمپ، دہلی
مبصر: محمد نظام الدین، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

زیر نظر کتاب 'خیالِ یارِ مہرباں' پروفیسر عبدالحق کی تخلیق، تنقید اور تحقیق پر مشتمل کوئی کتاب نہیں ہے بلکہ ان کی مختلف کتابوں پر لکھے گئے تبصرے اور تنقیدی آرا کا مجموعہ ہے۔ کتاب کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر چند تبریکی اور تقریظی کلمات اور تحریریں ضرور ہیں جو موصوف کی وسیع القلبی اور کشادہ ذہنی کے عندیے ہیں۔ میری اس بات کی تائید موصوف کے ان جملوں سے ہوتی ہے:

''راقم نے بزرگوں اور دوستوں پر لکھے گئے اپنے تاثرات 2012 میں شائع کیے گئے۔ 'ذکر یارِ مہرباں' کو پڑھنے والوں نے پسند کیا۔ لازم آیا کہ میری تالیفات پر لکھی گئی احباب کی تحریروں کو بھی مرتب کر دیا جائے تاکہ وہ یکجا محفوظ ہو جائیں اور تبصروں کی اشاعتی روایت میں معاون ہوں۔ ان حضرات کا شکر گزار ہوں جنھوں نے از راہ کرم میری ہفوات پر اپنے خیالات قلمبند کیے اور حسن قلم سے جمال ہم نشیں کی لذت سے آشنا کیا۔'' (خیال مہرباں، ص 7)

جہاں تک اس کتاب کی ترتیب، تہذیب اور خانہ بندی کا تعلق ہے تو اصل ترتیب سے قبل انتساب اور پروفیسر محمد حسن کے چند وقیع، بامعنی اور بصیرت افروز جملے جو پروفیسر عبدالحق سے متعلق ہیں، موجود ہے۔ اس کے بعد حرف سپاس کے علاوہ اصل تبصرے کی تعداد 26 ہے، جو اس طرح ہے: دیوان زادہ سے متعلق 8 تبصرے، دیوان حاتم سے متعلق 4 تبصرے، ذکر یارِ مہرباں سے متعلق 3 تبصرے، اقبال شاعر رنگیں نوا سے متعلق 4 تبصرے، اقبال اور اقبالیات سے متعلق 2 تبصرے، تبریک اور تبصرے سے متعلق 2 تبصرے، رشید احمد صدیقی کا ثقافتی منظر نامہ سے متعلق 1 تبصرہ، ترسیل و ترجمہ، اردو اور ادارے سے متعلق 1 تبصرہ اور خواجہ طارق محمود سے متعلق 1 تبصرہ کے علاوہ ضمیمہ کے تحت 5 تبریک اور آفریں تاثرات شامل ہیں۔

دیوان زادہ سے متعلق لکھے گئے تبصرے اور تنقیدی نظریات کافی واضح اور مربوط ہیں۔ تبصرہ نگاروں نے نہایت ہی دلجمعی اور ایمانداری سے پہلے دیوان زادہ اور پروفیسر عبدالحق کے مقدمہ کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے۔ پھر اس کے بعد دوٹوک اور واضح انداز میں اپنے خیالات اور آرا کو صفحہ قرطاس کے حوالہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ خاص طور پر ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی کے رشحات قلم پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ ڈاکٹر موصوف نے بہت ہی انہماک اور استغراق سے پروفیسر عبدالحق کی تمام تالیفات، تصنیفات اور تحقیقات کا از اوّل تا آخر مطالعہ کیا ہے۔ اور دیانت دارانہ و غیر جانبدارانہ طور پر اپنے افکار و نظریات کو سپرد دفتر کیا ہے۔

'اقبال شاعر رنگیں نوا' سے متعلق اس کتاب میں شامل تبصروں میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تبصرہ ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی کا ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے پروفیسر عبدالحق کی تقریباً تمام کتابوں پر تبصرہ کیا ہے اور پروفیسر عبدالحق کے تبحر علمی سے مرعوب ہوئے بغیر کہیں کہیں غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اور صحیح سمت کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ ان کے تبصرے کے مطالعے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ ڈاکٹر موصوف کو اردو ادب اور کلام اقبال سے زیادہ شغف اور لگاؤ ہے۔ اس لیے مجھے یہ کہنے میں ذرہ برابر عار نہیں کہ ایک دیانت دار قاری نے ایک دیانت دار محقق کی ہمہ تحقیقات اور تالیفات پر دانشورانہ اور دیانت دارانہ طور پر اپنے خیالات کا بے باکانہ اظہار کیا ہے۔ 'اقبال شاعر رنگیں نوا' سے متعلق پروفیسر علی احمد فاطمی کا تبصرہ بھی کافی طویل اور معلوماتی ہے بلکہ یوں کہیے کہ یہ ایک تحقیقی اور تنقیدی مقالے کی شکل لیے ہوئے ہے۔

اس کتاب کو ترتیب دینے میں پروفیسر عبدالحق صاحب نے اپنے تحقیقی اور تخلیقی ذہن کا استعمال کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ بعض ایسے تبصرے کو ہو بہو شامل کر کے اپنی فراخدلی اور کشادہ ذہنی کا بھرپور ثبوت دیا ہے۔ حالانکہ کہیں کہیں تبصرہ نگاروں نے موصوف کے پیش کردہ دلائل و براہین سے بحث کی ہے اور عدم اتفاق کا اظہار کیا ہے لیکن اس کے باوجود مرتب نے تحفظات اور تعصبات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بعینہٖ ان کے تبصرے کو اس کتاب میں جگہ دی ہے۔

بررسی ادبیات امروز ایران

تصنیف: پروفیسر محمد استعلامی، ترجمہ: ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی
صفحات: 352، قیمت: 250 روپے
ناشر: رئیس احمد نعمانی، گوشہ مطالعات فارسی، پوسٹ بکس نمبر 114 علی گڑھ
مبصر: محمد شمیم اختر، 09E مہاندی ہاسٹل، جے این یو نئی دہلی 67

زیر تبصرہ کتاب 'بررسی ادبیات امروز ایران' پروفیسر محمد استعلامی کی بے حد مقبول اور معتبر کتابوں میں سے ہے، جس کا ترجمہ ''جدید فارسی ادب کا مطالعہ'' کے نام سے ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی نے کیا ہے۔ ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مطالعات فارسی سے بھی کافی دلچسپی رکھتے ہیں۔ فارسی کلام کا ضخیم مجموعہ سرمد اعتبار بھی منظر عام پر آچکا ہے۔

جیسا کہ کتاب کے عنوان سے ہی ظاہر ہے اس میں معاصر ایرانی ادب کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جس میں فارسی ادب کی کلاسکی روایات، تیرہویں صدی ہجری میں جدید فکری موضوعات، فارسی ادب میں سادہ نویسی کا رجحان، زمانہ انقلاب کی فارسی نثر، فارسی زبان میں داستان نویسی، معاصر ایرانی شاعری اور اس کی قدر شناسی، ڈرامے کا فن اور ایران میں ڈرامہ نگاری، ادبیات اور نظری علوم میں تحقیق جیسے اہم عنوانات شامل کیے گئے ہیں۔ کتاب کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں فارسی زبان و ادب کی مختصر تاریخ اور معاصر فارسی ادب پر خاصی گفتگو کی گئی ہے۔

اس کتاب کا ترجمہ درسی نصاب کی غرض سے کیا گیا ہے۔ تاکہ ہندوستانی طلبہ اور اساتذہ کی رہنمائی کی جاسکے۔ یہ کتاب کئی علمی اداروں اور بالخصوص فارسی عربی بورڈ اتر پردیش سرکار کے نصاب میں باقاعدہ شامل ہوچکی ہے۔ ترجمہ چاہے جس مقصد سے کیا جائے اور کسی بھی طریقہ کار کے مطابق کیا جائے یہ ایک انہدامی عمل ہے جس کے ملنے سے ہم ایک دوسری عمارت پہلی عمارت کی جگہ پر ہی کھڑی کرتے ہیں۔ ترجمہ ہم کیوں

کرتے ہیں اس کے بہت سے عوامل ہیں۔لیکن ادبی شہ پارے کا ترجمہ ہم اس کی اہمیت اورضرورت سے دوسروں کو آگاہ کرنے کی غرض سے کرتے ہیں۔ترجمے کےعمل میں کچھ مسائل بھی ہمارے درپیش ہوتے ہیں۔اس میں سب سے اہم مسئلہ ہے کسی لفظ کا دوسری زبان میں متبادل نہ ہونا۔اس کتاب کے مترجم نے ان باتوں پرخصوصی توجہ دی ہے اور اپنے ترجمے کوآسان تر بنانے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔اپنے موضوع کے لحاظ سے مدرسوں ، کالجوں اور یونیورسٹی کے طلبا کے ساتھ ساتھ فارسی ادب کے اساتذہ اور فارسی سے دلچسپی رکھنے والے دیگر قارئین کے لیے بے حد اہم ،معتبر اور معلوماتی کتاب ہے۔مترجم نے اس بات کا ایمانداری سے اعتراف کیا ہے کہ اس کتاب میں میں نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کے بارے میں طلبا کے سوالات زیادہ ہیں اور جن کی تمام نگارشات کو میں نے نہیں پڑھا ہے ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے تاکہ جو بات میں کہہ رہا ہوں وہ ایسی ہو جو کہنے اور لکھنے کے لائق ہو۔یہ ایک درسی کتاب ہے اور یہ ہرگز معاصر ادب کے بارے میں آپ کے سارے سوالوں کا جواب نہیں دے سکتی کیونکہ معاصر ایرانی ادب ایک غیر معروف سمندر ہے۔ پہلے باب میں مصنف نے ایران کے علوم جدیدہ سے متعلق تاریخ قلم بند کی ہے۔صحافت خصوصاً اخبارات کے حوالے سے کافی تفصیلات شامل ہیں۔ دوسرے باب میں سادہ نویسی کے رجحان کا ذکر ہے، تیسرے باب میں زمانہ انقلاب کی فارسی نثر کا تذکرہ ملتا ہے۔ ایران میں ڈراموں کے ارتقا پر علمی گفتگو کی گئی ہے۔ بعد کے ابواب میں ابواب اور نظری علوم اور بچوں اور نوجوانوں کے ادب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ضمیمہ کے بطور مترجم نے پروفیسر استعلامی کی کتاب ''ادبیات دورہ بیداری ومعاصر'' کے مقدمے کا ترجمہ پیش کیا ہے جسے ''بررسی ادبیات امروز'' کا خلاصہ بھی سمجھا جاسکتا ہے، جو اپنی جگہ دریا کو کوزہ میں بھرنے کے مصداق اور اہمیت کا حامل ہے۔ کتاب کے آخر میں مصنفین اور ان کی تفصیلات بھی دی گئی ہیں جن کے نام کتاب میں شامل ہیں۔ کتاب کی طباعت اور سرورق خوبصورت ہے ہاں پروف کی غلطیاں کھٹکتی ہیں۔پھر بھی مترجم کی یہ ایک عمدہ کاوش ہے۔

نارنگ ساقی

صفحات: 595 قیمت: 400 روپے
مرتب: نذیر فتح پوری
ناشر: ایم، آر پبلی کیشنز، 10- میٹروپول مارکیٹ، نئی دہلی
مبصر: ذکیہ رخشندہ 'دلکشا'، این- 49 ، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

کتاب کا پورا نام 'میخانۂ اردو کا پیر مغاں نارنگ ساقی' ہے۔اتنی ضخیم کتاب مرتب کر کے شائع کرنا نذیر فتحپوری کی بلند حوصلگی اور نارنگ سے ان کے بے پایاں تعلقِ خاطر کی علامت ہے۔ اس میں نارنگ ساقی کی حیات اور کارناموں کے خدو خال نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی دو کتابوں یعنی 'ادیبوں کے لطیفے' اور 'خوش کلامیاں قلم کاروں کی (لطیفے)' کو بطور خاص مرکزِ تحریر بنایا گیا ہے۔

یوں تو جملہ اربابِ قلم اپنی جگہ اہم ہیں تاہم درج ذیل سربرآوردہ ادیبوں اور دانشوروں کے رشحاتِ قلم نے کتاب کو اعتبارِ نظر بخشا ہے:

(1) شمس الرحمٰن فاروقی- آؤ ساقی کہ بزم عشرت ہے (2) ڈاکٹر اسلم جمشید پوری- نارنگ ساقی۔ ادیب بھی ادب نواز بھی۔ (3) افتخار امام- فنکار اب بھی مستور ہے (4) بلراج کومل- خندۂ گل کا نمک (5) ڈاکٹر کیول دھیر- کرشن نارنگ ساقی (6) مجتبیٰ حسین- اچھا ساقی سچا نارنگ (7) محمد ایوب واقف- نارنگ ساقی شخصیت اور ادبی خدمات (8) مخمور سعیدی- ادیبوں کے لطیفے (9) ڈاکٹر مشتاق اعظمی- شخصی خاکوں میں نارنگ ساقی کی رنگ آرائی (10) ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی- نارنگ ساقی کی خوش فکر شخصیت شناسی (11) کنور مہندر سنگھ بیدی سحر- کرشن لال نارنگ ساقی (12) نثار احمد فاروقی- ادیبوں کے لطیفے (13) ڈاکٹر نذیر فتحپوری- جناب کے۔ایل نارنگ ساقی (14) نصرت ظہیر- تبصرہ (15) نند کشور وکرم- ادب دوست اور ادب نواز نارنگ ساقی (16) یوسف ناظم 'خوش کلامیاں قلم کاروں کی'- ایک مطالعہ

پیش گفتار گوپی چند نارنگ کے قلم کا مرہونِ منت ہے، جس میں انھوں نے اس ہمہ جہت شخصیت کی مقناطیسی کشش کے ساتھ ساتھ ان کے علم وفن پر انتہائی جامع اور معلومات آفریں روشنی ڈالی ہے، جسے پڑھنے کے بعد ایک ایسا پیکر چشمِ تصور میں آتا ہے۔

ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کے بغیر نارنگ ساقی نہ صرف پرورشِ لوح وقلم پورے خلوص اور تندہی سے کر رہے ہیں بلکہ اعلیٰ انسانی قدروں کے بھی وہ علمبردار نظر آتے ہیں۔لطف کی بات یہ ہے کہ ترقی پسندوں اور جدیدیت کے متوالوں کے درمیان رہتے ہوئے انھوں نے کبھی اپنی روایتی قدروں سے سمجھوتہ نہیں کیا۔موصوف کو مہمان نوازی کا ہنر قدرت نے بڑی فیاضی سے سکھایا ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے اربابِ قلم، شعرا و ادبا کی ضیافت کا شرف انھیں برابر حاصل رہا۔ کتاب میں بعض اربابِ قلم کے دو تا تین مضامین شامل ہیں، موضوع کی تکرار بھی کثرت سے ہے، تاہم ہر تحریر کا رنگ منفرد اور ہر موضوع یکسانیت کے باوجود باعتبار مواد متنوع ہے۔ بعض مقالات نارنگ کی کتابوں کے دیباچے سے ماخوذ ہیں اور چند رسائل و جرائد سے ڈائجسٹ کیے گئے ہیں، جبکہ بیشتر لکھوائے گئے ہیں۔ بہرحال یہ بہت بڑا معرکہ تھا جسے ڈاکٹر نذیر فتحپوری نے بڑی خوبی سے سر کیا ہے، اسے ان کی ذاتی دلچسپی اور نارنگ ساقی سے والہانہ محبت اور غیر معمولی عقیدت کا ثمرہ قرار دینا نامناسب نہ ہوگا۔

نارنگ ساقی کی زندگی اور فن کی تعمیر وتشہیر میں جن اربابِ علم ودانش نے اہم ترین کردار ادا کیا اس کی ایک طویل فہرست ہے۔ جسے 'دیکھو ہم نے ایسے بسر کی...' میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔اس سے اس حقیقت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ زمین سے ان کا رشتہ بہت گہرا ہے۔

صوری اعتبار سے بھی زیرِ نظر کتاب کم اہم نہیں۔ چنانچہ ص 31 کے بعد 16 صفحات پر ان کی زندگی کی کہانی تصویروں کی زبانی دہرائی گئی ہے۔

یوں تو مقالہ نگاروں کی تصاویر کا اہتمام عناوین کے ساتھ ساتھ کیا گیا ہے، تاہم چند اہم شخصیات کی رنگین تصاویر، جن کی تعداد 16 ہے، سے سرورق کو بڑی خوبی سے مزین کیا گیا ہے جس کے درمیان میرِ محفل یعنی نارنگ ساقی کو جگہ دی گئی ہے۔اسی طرح خود مصنف کی تصویر مع آٹوگراف کتاب کی جلد کے آخری صفحے کی زینت ہے۔

ان جملہ محاسن کے باوصف کتابت کی غلطیاں بری طرح کھٹکتی ہیں، مثلاً: • ص 16، س 16: غریب بجائے غروب • ص 24، س 5: منسبت بجائے 'مناسبت' کمپوز ہوگیا ہے • ص 312، س 15: دھنگ رنگ۔ خط کشیدہ لفظ دھنک ہونا چاہیے • ص 370، س 7: از بسیکہ کے بجائے 'از بسکہ'، ہونا چاہیے • ص 550 پر دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ 'دکھوں کی تیرگی ساقی کے درس سے دور رہتی ہے'۔اس میں خط کشیدہ حرف زائد ہے۔

ایک دفعہ فراق نے کہا تھا:

اس دور میں زندگی بشر کی ۔۔۔ بیمار کی رات ہو گئی ہے

اور آج کے مشینی دور میں تو غمِ دوراں اور کشمکشِ حیات نے انسان کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیا ہے کہ وہ ہنسنا بھی بھول گیا ہے۔ایسے پرآشوب دور میں نذیر فتحپوری نے 'میخانۂ اردو کا پیرمغاں نارنگ ساقی' پیش کر کے اربابِ ذوق کی بڑی خدمت کی ہے۔ امید کہ ہارڈ بائنڈنگ اور معنیٰ خیز ڈسٹ کور کے ساتھ منصۂ شہود پر آنے والی یہ کتاب حلقۂ علم وادب میں بہ نظرِ استحسان دیکھی جائے گی اور نارنگ شناسی میں اہم رول ادا کرے گی۔

اردو شاعری میں جانور

مصنف: مختار بدری

صفحات: 260، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: فکر و ذکر بکس، کرشنگری

مبصر: شمع اختر کاظمی، 12/14، سائی نگر، بھیونڈی 421302

'اردو شاعری میں جانور' کے عنوان سے مختار بدری کی کتاب کئی معنوں میں اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں قاری کے لیے دلچسپی کی بہت ساری جانکاریاں یکجا کی گئی ہیں۔

'اردو شاعری میں جانور' کتاب بے حد دلچسپ اور معلومات کا ذخیرہ ہے۔ ہر ہر جانور، چرند و پرند سے متعلق تفصیلی معلومات، قصے، کہانیاں، واقعات، کہاوت، حکایات، جانوروں سے متعلق غلط فہمیوں کے ازالے، مثل، تلمیح، نبیوں کے معجزات، احادیث نبویؐ اور اشعاروں کا ایک ایک جانوروں کے حوالے سے اکٹھا کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ مولف نے اردو دنیا کے لیے بڑی وقیع خدمت انجام دی ہے گویا کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔

کتاب میں جانوروں سے متعلق بہت ساری ایسی معلومات ہیں جس کا علم کم ہی لوگوں کو ہوتا ہے جیسے بچھوا اگر ایک بار کسی کو ڈنک مار دے تو پھر تیس دنوں تک دوسرے کو ڈنک نہیں مارتا۔ زہر کی پوری مقدار جمع ہونے کے بعد ہی کسی کو ڈنک مارتا ہے۔ بھیڑیا اپنی ایک آنکھ سے سوتا ہے اور دوسری آنکھ سے جاگتا ہے۔ اس کا پاؤں جنگلی پیاز کے پتے پر پڑ جائے تو یہ فوراً ہلاک ہو جاتا ہے۔ چیتا بیمار ہو جائے تو چوہا کھا کر شفایاب ہو جاتا ہے۔ چیونٹیاں انسانوں کی طرح جمائی لیتی ہیں اور جب جاگتی ہیں تو انگڑائی لیتی ہیں۔ گدھا جب شیر کی بو سونگھتا ہے تو عالمِ وحشت میں خوف زدہ ہو کر بھاگنے لگتا ہے۔ نیولا جب بیمار ہوتا ہے تو مرغی کے انڈے کھا کر شفایاب ہوتا ہے۔ ابابیل اجوائن کے پودے کی لکڑیاں لا کر اپنے گھونسلے میں رکھتی ہے۔ ان لکڑیوں کی خوشبو سے چمگادڑ جوان کی دشمن ہے گھونسلے سے دور رہتی ہے۔ اگر ابابیل کے بچے کو یرقان ہو جائے تو وہ ہندوستان آ کر ایک مخصوص پتھر لے کر جاتی ہے اور اس پتھر کو اپنے بچے کے اوپر رکھ دیتی ہے۔ اس کے بچے اس سرخ سیاہی مائل خطوط والے پتھر سے صحت یاب ہو جاتے ہیں۔ انسانوں کو جب اس پتھر کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ ابابیل کے بچے کو زعفران سے رنگ کر گھونسلے میں بٹھا دیتے ہیں۔ ابابیل انھیں یرقان زدہ سمجھ کر ہندوستان کی جانب پرواز کر کے آتی ہے اور اس پتھر کو لے جاتی ہے۔ بعد میں ضرورت مند انسان اسے ابابیل کے گھونسلے سے اٹھا لیتے ہیں۔ گوریا نیم کی باریک تیلیوں سے اپنا گھونسلہ بناتی ہے۔ نیم کی تاثیر سے اس کے انڈوں اور بچوں کو مختلف جراثیم سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ چمگادڑ انسانوں کی طرح ہنستی ہے۔ یہ عالم پرواز میں اپنے بچوں کو دودھ پلا دیتی ہے۔ مادہ چیل جفتی کے وقت شور مچاتی ہے کہ اے پرندوں تم گواہ رہنا۔ سلیمانؑ نے اسے حکم دیا تھا کہ جب تک دوسرے پرندوں کو گواہ نہ بنالو تب تک نر کو اپنے اوپر قدرت مت دینا۔ یہ بھی عجائب روزگار میں شامل ہے کہ لومڑی اور عقاب کی مادہ جفتی کرتے ہیں، کیونکہ عقاب بالعموم مادہ ہوتا ہے۔ اس کا نر نہیں ہوتا۔ قمری کا جب نر مر جاتا ہے تو مادہ کسی دوسرے نر سے اپنا جوڑا نہیں بناتی بلکہ اپنے نر کے غم میں رو رو کر اپنی جان دے دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کبوتر کو یہ صلاحیت دی کہ جب انڈے سے بچہ نکل آتا ہے تو کبوتر کھاری مٹی چبا کر بچوں کو کھلاتا ہے تاکہ کھانے کا راستہ صاف ہو جائے۔ حضرت سلیمانؑ کے دربار میں ہُد ہُد کا خاص مقام تھا۔ اس کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ لشکر کے آگے اڑ کر جاتا اور پانی کے مقام کی اطلاع دیتا۔ حضرت حسنؓ بن علیؓ فرماتے ہیں کہ گدھ اپنی آواز میں لوگوں سے کہتا ہے۔ اے انسان تو جس طرح بھی چاہے زندگی گزار، تجھ کو یقیناً ایک دن موت آ جائے گی۔ حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں ایک بار بارش نہ ہونے کے سبب قحط کی حالت پیدا ہو گئی تو سلیمانؑ اپنی امت کے ساتھ نماز استسقا کے لیے میدان میں گئے۔ راستے میں دیکھا ایک چیونٹی اپنے اگلے قدم اٹھائے ہوئے دعا کر رہی ہے کہ "یا خدا ہم بھی تیری مخلوق ہیں۔ ہم کو بارش سے محروم رکھ کر ہلاک نہ کر۔" یہ سن کر حضرت سلیمانؑ واپس آ گئے کہ اب ہماری دعا کے بغیر بھی بارش ہوگی۔

اس کتاب نے قدرت کی غیر انسانی مخلوق پر قدرت حاصل کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ اُمید ہے کہ خصوصی دلچسپی اور پسندیدگی کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کیا جائے گا اور پذیرائی بھی ہوگی۔ ہر عمر کے قاری کی معلومات میں اضافے کا سبب بنے گی اور عرصہ تک اس کتاب کو حوالے کی حیثیت حاصل رہے گی۔ طلبہ ہی نہیں اساتذہ بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

طباعت صاف ستھری، ورق جاذب نظر، پوری کتاب غلطیوں سے پاک اور اس دورِ گراں میں قیمت صرف دو سو روپے بہت مناسب ہے۔ اگر میری نظر کہیں چوک نہیں رہی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ اس کتاب میں جہاں تمام چرند و پرند کا تذکرہ موجود ہے وہیں پپیہا، کاکروچ، کھٹمل اور دیمک اپنے تذکرے سے محروم رہ گئے ہیں۔

عروضِ پنگل و خلیل

مصنف: کندن لال کندن

صفحات: 296، قیمت: 139 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: مصنف

مبصر: ڈاکٹر راشد عزیز، شعبہ اردو، سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر، سری نگر

اردو زبان و ادب کی تاریخ میں فکر تونسوی کے نقوش اور سرور تونسوی کے ماہنامہ شانِ ہند کی یاد تازہ کرنے اور صوفیائے باکمال کی روایات کے مسکن تونسہ کو افتخار و اعزاز کا تاج پہنانے والے کندن لال کندن نے اردو میں قواعدِ شعری کے میدان میں اپنا منفرد مقام بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے اور اپنے آبائی وطن تونسہ، جو موجودہ پاکستان میں ہے، کی زرخیز سرزمین کی جانشینی کا حق ادا کیا ہے۔

عروضِ پنگل و خلیل قواعدِ شعری کا وہ ضیا پاش منارہ ہے جس کی روشنی میں شاعری میں دلچسپی رکھنے والے اردو اور ہندی دانوں کو یکساں طور پر راہنمائی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کتاب میں کندن لال کندن نے سلیس زبان اور آسان اسلوب میں خلیل اور پنگل کے اُس منبع علم کی وضاحت کی ہے جسے شاعری کی کسوٹی کہا جاتا ہے۔ اس کتاب میں تقریباً ایک درجن بحور کے ایسے یک صد اوزان پر مع مثالوں کے بحث کی گئی ہے جن کی نشاندہی اردو اور ہندی شاعری میں بآسانی ہو جاتی ہے۔ بحر کے نام اور ارکان کے ساتھ چھندوں کے نام اور ان کے ارکان کی ہندی اصطلاحیں بھی درج کی گئی ہیں جن کی مدد سے اردو جاننے والوں کو ہندی شاعری سے قریب ہونے اور ہندی شاعری کے عنوان میں اپنے ہنر کا کمال دکھانے کا موقع آسان ہو گیا ہے۔ اسی طرح اردو جاننے والے ہندی دانوں کو اردو شاعری کے میدان میں سامنے آنے اور اپنے کس بل کا لوہا منوانے کی راہ ہموار ہو گئی ہے۔ ایسی اہم اور عصری لسانی رشتوں کو استحکام عطا کرنے والی کتاب کا دیوناگری میں ترجمہ کیا جانا ناگزیر ہو گیا ہے جس سے نئی نسلوں کو قریب آنے کا موقع ملے گا اور قومی یکجہتی کو فروغ حاصل ہوگا۔

قومی یکجہتی کی علامت عروضِ پنگل و خلیل کی ابتدا پروفیسر گوپی چند نارنگ کے مضمون سے ہوتی ہے جس میں صاحب کتاب کی زندگی اور علمی سفر کی روداد سے واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ دوسرا مضمون پروفیسر عراق رضا زیدی کا ہے۔ انھوں نے علمِ عروض کی اہمیت اور اس کے نازک نکات پر روشنی ڈالتے ہوئے عروضِ پنگل و خلیل کی افادیت کو بڑی

مہارت سے تلاش کیا ہے جب کہ تیسرے مضمون دیباچے میں صاحبِ کتاب نے اس کتاب کی تکمیل کی وجہ سے اور اس سفر کی تفصیل اور معاونین کی عنایتوں کے عمل کو قلم بند کیا ہے۔

عروضِ پنگل و خلیل کی با قاعدہ شروعات علم عروض پنگل کے بیان سے ہوتی ہے اور یہ سلسلہ صرف و نحو عروضی اصطلاحات، علم عروض پنگل میں اجزائے اولین، بھاشا میں تشکیلِ ارکان یعنی اجزائے پنگل، زحاف و مزاحف تنسیخِ زحاف، اصولِ تقطیع (بنٹ) کا بیان، برت کی قسمیں اور حدود، برتے کا بیان اور اصول اور چھندوں (بحور) کا بیان وغیرہ کے زینے طے کرتے ہوئے اپنے محبّ یعنی قاری کے علم میں لگاتار اضافہ کرتا ہے اور اسے ہنر مند بنا دیتا ہے۔ یہاں آ کر قاری اس منزل میں آجاتا ہے کہ بحور و اوزان کی مشق کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس مشق کی ابتدا کندن لال نے بحر متقارب سے کی ہے اور تیس جداگانہ اوزان کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ اس کے بعد متدارک کے بائیس اوزان پر گفتگو کی گئی ہے۔ تیسرے نمبر پر بحر ہزج کے اٹھارہ اوزان کو تختۂ مشق بنایا گیا ہے۔ اسی طرح بحر رجز کے اٹھارہ، رمل کے انیس، کامل کے سات، مضارع کے دو، مقتضب کے دو، منسرح کے ایک، سریع کے ایک اور بحر وسیط کے تین اوزان کی وضاحت مع مثال اور پنگل شاستر یعنی جھنگیان میں مساوی ارکان و حرکات اور شاعری کی مثالوں کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ اس کے بعد دوہا، اپجا دوہا اور سورٹھا کے تعلق سے اردو اور ہندی کی شاعری میں ان کے رواج اور موجودگی کا جائزہ کمالِ ہنر سے پیش کیا گیا ہے۔ گویا دریا کو کوزے میں سمیٹ دیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب اردو اور ہندی کی شاعری کی گرامر کا بے مثال نسخہ ہے۔ اردو اور ہندی قواعد شعری کے امتزاج و اختلاط نے کتاب کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ علم عروض جیسے خشک مگر دلچسپ موضوع کو آسان اور پرکشش بنانے کی کندن لال کندن کی یہ گراں مایہ کوشش عروض کے میدان اور تاریخ میں انھیں زندۂ جاوید بنانے میں اہم کردار ادا کرے گی۔ سادہ مگر جاذب نظر فور کلر ٹائٹل، کمپیوٹر کمپوزنگ، آفسیٹ کی طباعت اور عمدہ سفید کاغذ کے حجم والی یہ کتاب مجلد مع ڈسٹ کور ہونے کے باوجود معمولی قیمت میں دستیاب ہے۔

قلم کرشمے

تصنیف: ڈاکٹر شباب للت

صفحات: 224، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9 گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر عبدالناصر، C-24، اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی

ڈاکٹر شباب للت کا نام ادب کی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ اردو کے ایک کہنہ مشق اور ممتاز شاعر ہونے کے علاوہ ایک نکتہ سنج محقق اور ناقد کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ اردو کی صحافتی خدمات انجام دیتے ہوئے گزری۔ اب تک ان کی دو درجن سے زیادہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں ہندی تصانیف بھی شامل ہیں۔ لیکن درجن بھر کتابیں صرف اردو شاعری سے متعلق ہیں۔

پیشِ نظر کتاب میں مختلف ادبا و شعرا کی تصانیف پر انھوں نے سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کتاب کی قدر و قیمت کافی بڑھ جاتی ہے۔ یہ ان کی بالغ نظری کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس کتاب میں شامل تین مضامین میں علامہ بشیشور پرشاد منور لکھنوی کی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ ہے۔ پہلے مضمون کا عنوان 'سیکولر ادب کو منور لکھنوی کی بیش بہا دین' ہے جہاں ان کے کٹر سناتن دھرمی ہونے کے باوجود اسلامی نظریۂ حیات کا بھی دل سے معترف ہونے کا ذکر ہے جس کی وجہ سے ان کی ذات میں اخلاقی اور روحانی صفات پیدا ہو گئی تھیں چنانچہ انھوں نے قرآن پاک کی سورتوں اور انجیل مقدس کے ابواب کے منظوم ترجمے بھی کیے۔ اس کے علاوہ، اسلام، سکھ اور جین دھرم کے پیشواؤں اور ان کی تعلیمات پر نظمیں بھی لکھیں۔ اتنا ہی نہیں اس ملک کے قومی رہنماؤں اور شہیدان آزادی کو بھی منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ ان خوبیوں کو دیکھتے ہوئے شباب للت ان کے متعلق لکھتے ہیں:

''منور کی شاعری میں قومی جذبہ بھی ہے آزادی کی امنگ بھی اور سبھی فرقوں کے متحد ہونے کی تلقین بھی۔ سماجی اور اقتصادی استحصال سے ہراساں طبقوں کی ہمدردی و حمایت، نیز حالات گرد و پیش پر بھی بے باکانہ تبصرہ آرائی بھی ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔'' (ص 17)

منور لکھنوی پر لکھے گئے دوسرے تبصرے میں انھوں نے ان کے منظوم تراجم 'درگا سپت شتی' کے متعلق لکھا ہے:

''کالی داس کے مہا کاویہ کمار سمبھو اور درگا سپت شتی دو ایسے گرنتھ ہیں جن کا منظوم ترجمہ اردو میں کرنے کا حوصلہ منور کے سوا کسی اور شاعر کو نہیں ہوا۔'' (ص 196)

دراصل یہ ترجمہ اردو زبان میں واحد منظوم ترجمہ ہے جہاں صحت مفہوم، صداقت بیان اور طہارت موضوع کو شاعر نے اپنے ذہن میں رکھ کر مہارت اور مشاقی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ان کے اگلے مضمون کا عنوان 'ظرافت نگاری صحت معاشرہ کے لیے' ہے جہاں وہ اس کی باضابطہ نشاندہی مرزا غالب کے خطوط اور ان کے غزلیہ اشعار میں کرتے ہیں اور پھر اپنی بے باکانہ رائے دیتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''غالب نے اپنی شاعری اور خطوط میں اپنی بذلہ سنجی اور خوش طبعی سے تبسم اور تفریح کے دلآرا گلزار کھلائے ہیں۔ غالب خود پر بھی تمسخر کے وار کر سکتا ہے، اپنے محبوب دلربا گلفام حسینوں پر بھی۔'' (ص 25)

آگے چل کر انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے علاوہ عصر حاضر کے شعرا اردو کے کلام سے بھی اس کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔

اس مجموعے میں ان کا ایک مضمون 'رتن سنگھ' 'کاٹھ کے گھوڑے کا شہ سوار' کے عنوان سے ہے۔ رتن سنگھ اردو کے مشہور افسانہ نگار ہیں جن کے پانچ افسانوی مجموعوں کے نام اس طرح ہیں پہلی آواز، پنجرے کا آدمی، صبح کی پری، مانک موتی، اور 'کاٹھ کا گھوڑا' آخر الذکر افسانوی مجموعہ 1993 میں منظر عام پر آیا جو ان کی 31 نمائندہ کہانیوں پر مشتمل ہے۔

عمران عظیم جو اردو کے مقبول شاعر و ادیب ہیں ساتھ ہی ان کا علمی و دینی خانوادے سے بھی تعلق ہے ان کا ایک شعری مجموعہ 'عکس وحدت و رسالت' کے نام سے ہے جہاں انھوں نے رب کائنات اور اس کے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صفاتی ناموں کو کمال خوبصورتی سے اردو کے شعری پیکر میں ڈھال کر پیش کیا ہے یہ دوہے کی صنف میں ہے۔ یہ صنف خالص ہندوستانی ہے۔'' جسے مصنف نے کافی سراہا ہے اور آخر میں دعائیہ کلمات سے نوازا بھی ہے۔

ان مضامین کے علاوہ ان کا ایک مضمون خاصا دل چسپ ہونے کے ساتھ تاریخی اہمیت کے حامل بھی ہیں یہ 'جنگ آزادی اور تعمیر نو میں مسلمانوں کا حصہ' کے عنوان سے ہے۔ جہاں جنگ آزادی کے سرفروش مجاہدین کے ذکر کے ساتھ ساتھ، سیاسی رہنماؤں شعرا ادبا، صحافیوں اور آزاد ہند فوج کے جنرل شاہ نواز خان کا ذکر بھی شامل ہے۔ مضمون کے آخر میں مصنف نے صدق دلی سے اس بات کا اقرار بھی کیا ہے:

''ملک کے دفاع کے لیے بریگیڈیر عثمان اور حوالدار عبدالحمید کی قربانیوں کو ہم کیسے بھلا سکتے ہیں۔ وطن عزیز کی تکنیکی ترقی، نیوکلیائی توانائی کی حصولیابی کے نظام اور خلائی تسخیر کے پروگرام تعمیر و ترتیب میں اپنے سابق سائنس داں، سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی انمول دین کے لیے ہندوستانی قوم ہمیشہ ممنون رہے گی۔'' (ص 75)

اس مجموعے میں شامل دیگر مضامین بھی معلومات افزا ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی ہم

پورے یقین کے سات کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر شباب للت کی تحریر میں ایک بے باک ادیب پختہ کار شاعر اور صحافی کی جملہ صفات موجود ہیں۔

آبشار ادب (سفرنامہ)

مصنف: بی ڈی کالیہ ہمدم، سنہ اشاعت: 2013
صفحات: 352، قیمت: ندارد
ناشر: ہریانہ وقف بورڈ، انبالہ چھاؤنی، ہریانہ
مبصّر: ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف علاّمہ اقبال اسٹریٹ سنبھل، یوپی .244302

زیرِ تبصرہ کتاب اردو کے معروف قلم کار و شاعر جناب بی۔ڈی کالیہ ہمدم کا امریکہ و انگلینڈ کا ادبی سفرنامہ ہے۔ یہ کتاب ہریانہ وقف بورڈ کی جانب سے شائع کی گئی ہے۔جس کا انتساب مصنف کے بیٹے 'منیش کالیہ' کے نام کیا گیا ہے۔ابتدا میں ہی ہریانہ وقف بورڈ کے ذمے داران نسیم احمد (ایڈمنسٹریٹر، ہریانہ وقف بورڈ) ڈاکٹر پرویز احمد (چیف ایگزیکیوٹو آفیسر، ہریانہ وقف بورڈ) کے رشحات دیے گئے ہیں جن میں کتاب اور صاحب کتاب کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ان کے بعد ہمدم صاحب کی تحریر دی گئی ہے۔جس کا آغاز انھوں نے اپنے اس خوبصورت شعر کے ساتھ کیا ہے:

ہمدم قلم کی آبرو جاں سے بھی ہے عزیز
اب اور ان سے پوچھیے کیا چاہتے ہیں لوگ

ان سطور میں انھوں نے ہندوستان، پاکستان سے روزگار کے سلسلے میں نقل مکانی کر کے مغرب میں بس جانے والے افراد کی ادبی و تہذیبی حالت کا جائزہ پیش کیا ہے۔اور ہند و پاک کے ادباء و شعراء کے ذریعے یورپ میں انجام دی جانے والی خدمات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد 'ارشادات' کے عنوان سے ہمدم صاحب اور ان کی کاوشوں کے حوالے سے مختلف حضرات کے تاثرات دیے گئے ہیں۔

کتاب کے صفحہ 19 سے اصل متن شروع ہوتا ہے۔جس میں مصنف کے تین ادبی سفرناموں کا ذکر ہے۔ پہلا باب 'امریکہ کا ادبی سفر' کے عنوان سے ہے۔ دوسرے باب میں انگلینڈ اور امریکہ کے دوسرے سفرنامے کو بیان کیا گیا ہے۔ گوکہ یہ ایک سفرنامہ ہے۔ مگر ہمدم صاحب نے اس میں جن حضرات سے ملاقاتیں اور ادبی گفتگو نقل کی ہے ان سے اس کتاب کی ادبی حیثیت مسلم ہوگئی ہے۔

کتاب میں مرقوم تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ مصنف کتاب کا مقصد اس سفرنامے سے جہاں انگلینڈ و امریکہ کے مختلف مقامات کی سیر کرنا تھا۔ وہیں مذکورہ مقامات پر اقامت پذیر اردو شخصیات سے ملاقات اور ان سے ادبی گفتگو بھی شامل تھی۔

اس کتاب میں جہاں سیر و سیاحت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور مصنف کتاب نے وہاں کے قدرتی مناظر، تمدنی ترقیات اور سائنسی سہولیات کا ذکر کیا ہے وہیں مختلف ادبی شخصیات سے بھی متعارف کرایا ہے۔ اور مغرب میں مقیم اردو ادب کے اہم شعراء کا کلام بھی نقل کیا ہے۔ اس سلسلے میں امریکہ کے شہروں ہیوسٹن، ڈیلس، لاس اینجلس، اوکلاہوما، شکاگو، آٹن کے اہم شعراء کے نام اس طرح ہیں۔ حنیف اخگر، یونس اعجاز، خالد خواجہ، طارق ہاشمی، نور امروہوی، شاہ عالم اثر، فرحان سیّد، نادر درّانی، راجیو چکرورتی، حسان ہاشمی، عامر سلیمان، جاوید انصاری، سعود قاضی، مجید جامی، سرور عالم راز، قیصر عباس، عرفان مرتضیٰ، قمر نقوی، عبیدالرحمٰن عارف، سکینہ پنہاں، امن اللہ خاں، ظفر جعفری، سعید قریشی، وغیرہ ہیں۔ ان کے ساتھ ہی اردو کے کچھ اور اہم شعراء کا کلام بھی اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

کتاب کا دوسرا باب انگلینڈ اور امریکہ کے دوسرے سفر پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کی طرح یہاں بھی مصنف کتاب نے انگلینڈ کے شہروں اور مقامات کا ذکر کرنے کے ساتھ ہی وہاں کی ادبی نشستوں اور شعری محفلوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ انگلینڈ کے جن شعرا حضرات سے ملاقات اور ان کے خوبصورت کلام کے نمونے اس کتاب میں سموئے گئے ہیں۔ ان میں سے نمایاں نام یہ ہیں۔ ناظر فاروقی، مشتاق سنگھ، نصیر احمد بٹ ناصر، سیمی برلاس، رخسانہ، شاہین اختر صدیقی، اشتیاق زین، خالد یوسف، مظفر احمد مظفر، اعجاز انجمن اعجاز، رحیم اللہ شاہ، گلزار سنگھ امرت، فیضان عارف فیضان، عظمیٰ صدیقی، زہرہ نسیم، عبدالغفار عزم، نرگس جمال سحر، اندر آنند، راج مدگل، کے ساتھ ہی خود بی ڈی کالیہ ہمدم کا کلام بھی شامل ہے۔

کتاب کے آخر میں تعارف کے عنوان سے ہمدم صاحب کا مکمل تعارف نامہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد آپ کی کتابوں، محراب فن اور پرندوں کا عالمی مشاعرہ پر مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے تعارف، تجزیے اور تبصرے شائع کیے گئے ہیں، جن کے ذریعے ہمدم صاحب کے ادبی جوہر قارئین پر واضح کیے گئے ہیں۔ غرضکہ انگلینڈ و امریکہ کے خوبصورت مقامات کی ادبی سیاحت اور وہاں کے ادبی تناظر میں تحریر شدہ اس کتاب کا زیورِ طباعت سے مزین ہونا، یقیناً اردو ادب کے ادبی سرمائے میں گراں قدر اضافے کا باعث ہوا ہے۔

کتاب میں اگرچہ پروف ریڈنگ کی کافی غلطیاں ہیں یعنی متن کی تصحیح ذمے داری کے ساتھ نہیں کی گئی ہے۔ کتاب کی فہرست بھی ناقص و نامکمل ہے تاہم معیاری کاغذ اور خوبصورت طباعت کے ساتھ ہی اپنے مواد و متن کے معیار کی عمدگی کی بنا پر یہ کتاب ضرور مطالعے کے لائق ہے۔ اردو کے علم دوست حضرات اور ادب پرور شخصیات سے التماس ہے کہ وہ کتاب کو خرید کر اس کا مطالعہ کریں اور بی ڈی کالیہ ہمدم صاحب کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ہی اپنی اردو دوستی اور ادب پروری کا ثبوت دیں۔ یہ کتاب مصنف و ناشر سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

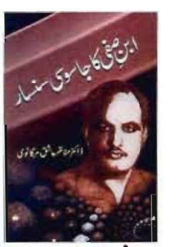

ابن صفی کا جاسوسی سنسار

مصنف: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
صفحات: 168، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: طیب فرقانی، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو میں معیاری جاسوسی ادب کے پہلے اور آخری مصنف ابن صفی نے اپنی شستہ، شگفتہ، شائستہ اور بے ساختہ تحریروں سے کئی نسلوں کو سیراب کیا ہے۔ ان کے چاہنے والوں کی تعداد آج بھی کم نہیں ہوئی۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ اردو ادب کے موجودہ صاحب نقد و نظر بھی ابن صفی کی خدمات کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں اور ہند و پاک میں ابن صفی کی شخصیت اور کارناموں پر مشتمل کئی ایک تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور مستقبل میں اس سے بھی بہتر انداز میں جاری رہنے کی قوی امید ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اسی سلسلے کی ایک چھوٹی سی کڑی ہے۔ 'ابن صفی کا جاسوسی سنسار' ان مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں مختلف قلم کاروں کے ذریعے ہند و پاک کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔

کتاب کے مرتب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی خود ایک کہنہ مشق قلم کار ہیں اور سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے ابن صفی پر اب تک تین کتابیں پیش کی ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مرتب موصوف کو کس قدر والہانہ لگاؤ ہے۔ انھوں نے مضامین کے انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ کچھ اہم اور تاریخی حیثیت کے مضامین بھی شامل ہوجائیں۔ مجموعے میں قدیم مضامین بھی ہیں اور جدید مضامین بھی۔ مثال کے طور پر پروفیسر مجنوں گورکھپوری کا مضمون 'ابن صفی اور اردو میں جاسوسی افسانہ' اس مضمون کو اردو جاسوسی ادب کی تنقید میں تاریخی حیثیت سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔

اسی طرح پروفیسر ابوالخیر کشفی کا مضمون 'ابن صفی کے ناول کے بارے میں' عارف اقبال کا مضمون 'ابن صفی کے ناولوں کا سماجی و تہذیبی مطالعہ' راشد اشرف کا مضمون 'ابن صفی: جاسوسی ناول نگار' اہم ہیں۔ یہ لوگ ابن صفی کے بڑے مداح اور محقق ہیں۔ پروفیسر ابوالخیر کشفی ابن صفی کے ہم عصر اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا کھلے عام اعتراف کرنے والوں میں سے ہیں۔ عارف اقبال اور راشد اشرف ابن صفی کے محقق ہیں۔ اول الذکر کی مرتب کردہ ضخیم کتاب 'ابن صفی مشن اور کارنامہ' حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے جب کہ راشد اشرف کی دو کتابیں 'ابن صفی - کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا' اور 'ابن صفی شخصیت اور فن' منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کے علاوہ انتخاب میں کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ کا مضمون 'ابن صفی کے جاسوسی ناول' جس کا ترجمہ نصرت ظہیر نے کیا ہے، بھی شامل ہے۔

168 صفحات کی اس کتاب میں ابتدائی تین چار مضامین میں ابن صفی کا نظریہ، ان کی سوانح اور یادوں کے تاثرات ہیں۔ بقیہ سبھی مضامین میں ان کے جاسوسی سنسار پر روشنی پڑتی ہے۔ پہلا مضمون 'ابن صفی: بقلم خود' خود ابن صفی کا ہے۔ جب کہ دوسرا مضمون 'ابن صفی: چند حقائق' ابن صفی کے صاحبزادے احمد صفی کا ہے۔ ان دونوں مضامین کی اہمیت واضح ہے۔ لیکن پہلے مضمون میں پروف ریڈنگ کی ایسی بھیانک غلطی راہ پا گئی ہے کہ سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ ایسی غلطی کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ خاص طور سے اس لیے کہ یہ مضمون کتاب کا پہلا ہی مضمون ہے اور اس لیے بھی کہ خود ابن صفی کے قلم سے ہے جس کو تاریخی اور دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔ صفحہ نمبر 12 پر ساتویں سطر اس طرح ہے ''الہ آباد میں صرف ساٹھ ناول لکھے تھے اس کے بعد اگست 51 میں کراچی آگیا۔'' اس سے اوپر کا پیراگراف اس طرح ہے ''جنوری 51 میں میرے ہی مشورے پر ادارہ نکہت نے ماہانہ جاسوسی ناولوں کا سلسلہ شروع کیا۔ سلسلے کا نام 'جاسوسی دنیا' تجویز ہوا۔'' جنوری سے اگست تک کے دس مہینوں میں 'ساٹھ' ناول لکھ پانا ناممکنات میں سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابن صفی ہر مہینے ایک ناول لکھا کرتے تھے اور انھوں نے پہلا ناول مارچ 1952 میں لکھا تھا۔ چنانچہ درست یہ ہے ''جنوری 52 میں میرے ہی......'' اور الہ آباد میں صرف سات ناول لکھے تھے اس کے بعد اگست 52 میں کراچی آگیا تھا۔

کل 24 مضامین کے ساتھ آخر کتاب میں ابن صفی کے ایک مداح مجسٹریٹ شاہد جمیل سے مرتب کتاب کا مصاحبہ بھی شامل ہے جو دلچسپ ہونے کے ساتھ معلوماتی اور انکشافی ہے۔ مشمولہ مضامین ابن صفی کی شخصیت کے علاوہ فن کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس طرح کتاب کی اہمیت اور مقبولیت کی امید ہے۔

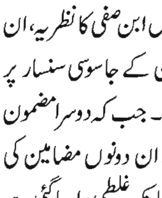

سیرت سرور دو جہاں (جلد اوّل)

مصنف: سید اولاد رسول قدسی، مرتب: رحمت اللہ صدیقی

صفحات: 444، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: کتب خانہ دہلی امجد، مٹیا محل، دہلی 6

مبصر: خالد حسن، غفار منزل، جامعہ نگر، نئی دہلی

زیر نظر کتاب (سیرت سرور دو جہاں) سید اولاد رسول قدسی کی تحریر کردہ ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو منظوم شکل میں تحریر کیا ہے۔ اول تو سیرت کو بیان کرنا ہی ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ پھر اس کو شاعری کی ہیئت میں تحریر کرنا خاصا دشوار امر ہے۔ شاعری ایک الگ چیز ہے اور سیرت نگاری دوسری چیز ہے۔ جس کے ملاپ کی کوئی صورت ظاہری طور پر نظر نہیں آتی۔

شاعری میں تخیلات اور ذہنی تخلیق بھی کارفرما ہوتی ہے۔ مگر سیرت نگاری ہر قسم کے تعصب سے پاک ہو اور اس کے بیان میں اخلاق، اعمال، حالات و کردار پوری دیانت داری برتی جانی چاہیے۔ لیکن اعجاز اس ذات گرامی کا ہے جس کے ذکر کو اللہ نے بلند کیا ہے کہ خلوص و دیانت کے ساتھ نظم یا نثر میں ان کی جب بھی سیرت لکھی گئی ہے اس کے واقعی ہونے پر حرف نہیں آیا۔ بددیانتی گر کسی نے کبھی کی بھی تو وہ خود اپنے ہی تضاد کی زد میں آ گیا۔

سید اولاد رسول نے (سیرتِ سرور دو جہاں) کے عنوان سے منظوم سیرت لکھی ہے۔ سید اولاد رسول قدسی شاعری میں ہر صنف سخن پر قدرت رکھتے ہیں لیکن ان کا اصل میدان نعت گوئی ہے۔

نعت گوئی آپؐ کی اوصاف حمیدہ کے بیان کو مدح و توصیف اور عقیدت کو جذبے کے ساتھ اظہار کرنا ہے جب کہ سیرت نگاری کا تعلق حالات و واقعات اور کمالات و احسانات سے ہے۔

مصنف نے اس منظوم سیرت کو آزاد نظم کی شکل میں لکھا ہے جو ردیف اور قافیے کی پابندی سے آزاد ہوتی ہے۔ پھر بھی شاعری کی ہی ہیئت ہے۔ اگرچہ شاعرانہ زبان کا استعمال ہوا ہے پھر بھی واقعات و حالات کو شعری انداز میں بیان کرنا اور وہ بھی 'سیرت پاک' کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آپؐ کے اخلاق و کردار اور جائے پیدائش اور ان سے عقیدت کو شاعری میں لکھنے کا اچھا انداز استعمال کیا ہے جیسا کہ سید اولاد رسول قدسی کی نسبت سے علم ہوا ہے ان کو مذہبی کام میں گہری دلچسپی ہے۔ انھوں نے اپنی علمی بصیرت سے اس کتاب کو تحریر کرنے میں جہاں واقعات کو شعری ڈھنگ دیا ہے وہیں تراکیب و تشبیہات کے ذریعے شاعری اور سیرت نگاری دونوں کا حق ادا کیا ہے۔

اور جہاں ضرورت پیش آئی قرآنی آیات کا بھی صحیح استعمال کیا ہے۔ زبان پہ اچھی دسترس ہے یعنی اپنی بات کہنے میں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ آپؐ کے اکثر حالات کو خوبصورت شاعری میں بیان کیا ہے جس سے ان کی شاعری اور سیرت نگاری ظاہر ہوتی ہے۔

سیرت سرور دو جہاں سے پہلے بھی ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں اور زیادہ تعداد نعتیہ مجموعوں کی ہے۔

امید ہے کہ مصنف سید اولاد رسول قدسی کی ہر منظوم سیرت کی کاوش سیرت نگاری کی روایت کو کافی مستحکم کرے گی۔ اس کتاب کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

مصطفیٰ جان رحمت کی جس جا ولادت ہوئی
نام جس کا تاریخ میں مولد مصطفیٰ
بہتا ہے جس جگہ
فضل و رحمت کا دھارا
سب کے سب انتہائی
مہذب، خلیق اور ذی ہوش تھے
ان میں رب سے مقرب
تھے صدیق اکبر

جنگ بدر پر کچھ اس طرح تحریر کیا:

آپ کے جاں نثاروں نے میدان بدر کے
اک عریش آپ کے واسطے
کی تھی تعمیر یہ سوچ کر
کوئی کافر نہ تکلیف پہنچا سکے آپ کو

امید ہے کہ یہ منظوم سیرت نہ صرف اپنی روایت کو مستحکم کرے گی بلکہ مصنف کا قد بھی اونچا کرے گی اور مقبول ہوگی۔

ہندوستان کی جانباز خواتین

مصنف: ڈاکٹر بانو سرتاج
صفحات: 176، قیمت: 250.00 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
مبصر: زین البشر انصاری، معرفت: ڈاکٹر شاہ محمد فائز 19K،
احاطہ سنگی بیگ، شاہ گنج، لکھنؤ 226003

زیرِ نظر کتاب 'ہندوستان کی جانباز خواتین' میں ان جانباز خواتین کے بارے میں ایک نئے انداز سے گفتگو کی ہے۔ جس کی طرف بالعموم اب تک توجہ نہیں دی گئی تھی۔

ہندوستان کی 'جانباز خواتین' میں بانو سرتاج نے 61 جانباز خواتین کا ذکر کیا ہے ان سب کا تعلق کھیل کے میدان سے ہے۔ ان خواتین نے کھیل کے توسط سے قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہندستان کا نام روشن کیا۔ ان خواتین میں کچھ ایسی بھی ہیں جنھیں لوگوں نے بھلا دیا مگر وہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ ان خواتین میں شانتی ولسن (ابراہیم) کا نام کافی اہم ہے جو 1981 میں 800 میٹر کی دوڑ میں پہلی خواتین چیمپین بنی تھیں۔ انھوں نے 75 سے زائد قومی اور بین الاقوامی کھیلوں میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ رائفل شوٹر انجلی بھاگوت بھی کسی تعریف کی محتاج نہیں ہیں۔ انھوں نے سال 2002 میں ورلڈ شوٹر نمبر اول کا خطاب حاصل کیا۔ 2005 میں ملبورن میں ایر رائفل میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے 2003 میں راجیو گاندھی کھیل ایوارڈ اور ارجن ایوارڈ سے نوازا گیا۔ الکا تومر ایک ایسی خاتون ہیں جنھوں نے خواتین پہلوانی چیمپین میں خواتین کی نمائندگی کر کے یہ دکھا دیا اور دو مرتبہ 2007 اور 2010 میں دولت مشترکہ گولڈ میڈل اپنے نام کیا۔ مغربی بنگال کی رہنے والی جیوتی مئی سکدر رنے ایتھلیٹ ایم۔ پی کے خواتین رنر کے شعبے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ 1998 کے بنکاک ایشیاڈ میں 1800 اور 1500 کی دوڑ میں گولڈ میڈل حاصل کیا اور ریلے ریس میں سلور میڈل پر بھی قبضہ کیا۔ ان خواتین کے ساتھ ہی ساتھ اور بھی خواتین ہیں جنھوں نے کھیل کے مختلف میدانوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

کرکٹ کی کپل دیو کہلانے والی جھولن گوسوامی نے خواتین کرکٹ کو ایک نئی بلندی عطا کی اور ہندوستان میں خواتین کرکٹ کو عام کرنے میں ان کا کافی اہم کردار رہا ہے۔ تیراکی میں بلا چھودھی نے جو ریکارڈ قائم کیا ہے وہ بے مثال ہے۔ کرنم ملیشوری نے سڈنی اولمپکس میں کانسے کا میڈل جیت کر ہندستان کا نام روشن کیا۔ میری کام مکے بازی میں اپنے کھیل کا ہنر دکھاتے ہوئے پانچ مرتبہ عالمی خطاب حاصل کر کے تاریخ میں اپنا نام رقم کروا چکی ہیں۔ اس طرح کی بہت سی معلومات اس کتاب سے حاصل ہوتی ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وطن عزیز کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ خلائی سفر پر جانے والی ہند نژاد شہرۂ آفاق خاتون کلپنا چاولا سے متعلق نہایت کارآمد معلومات کتاب میں دی گئی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں ان مسلم خواتین کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جنھوں نے کھیل کے میدان میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کھیل کے میدان میں بھی مسلم خواتین پیچھے نہیں ہیں۔ ان خواتین میں عالمی شہرت یافتہ ثانیہ مرزا کا نام کسی بھی تعریف کا محتاج نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے کھیل سے ٹینس کو ایک بلند مرتبہ عطا کیا ہے۔ اس طرح انیسہ سید نے بھی خواتین پسٹل شوٹر میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ 2006 میں انیسہ نے ساؤتھ افریقہ فیڈریشن میں گولڈ میڈل جیت کر ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے اور اس میں نمایاں کامیابی بھی حاصل کی ہے۔ بلقیس میر کسی بھی تعریف کی محتاج نہیں ہیں۔ ان کا تعلق کشمیر سے ہے۔ بلقیس Spring Racing World Cup 2009 میں حصہ لینے والی ہندوستان کی اول خاتون ہیں۔ یہ ہندوستان کی پہلی خاتون ہیں جن کا International Refree Panel میں انتخاب ہوا تھا۔ شبالی بانو جو بہت کم عمر میں ہی ٹیبل ٹینس میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ فریحہ زماں نے بیک اسٹروکر کے کھیل میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے اور اس کھیل کو انھوں نے اپنی محنت اور لگن سے ایک الگ مقام تک پہنچایا۔ 2010 کے راشٹر منڈل کھیلوں میں گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی شہرت بین الاقوامی سطح پر ہو گئی۔ فاطمہ بانو نے بھی اپنی کوششوں سے کشتی کے کھیل میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ مدھیہ پردیش کی خاتون اول ہیں جنھوں اپنے پردیش کو گولڈ میڈل دلوایا تھا۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آج کے موجودہ دور میں جہاں خواتین مردوں کے شانہ بہ شانہ چلنے کی کوشش کر رہی ہیں اس میں کافی کامیاب ہیں۔ ہندوستان کی جانباز خواتین میں کھیل کے شعبے سے تعلق رکھنے والی ہندوستان کی جانباز خواتین کا ذکر کیا ہے۔ جنھوں نے اپنے کھیل سے اپنے ملک کا نام بین الاقوامی سطح پر روشن کیا ہے۔

بانو سرتاج مبارک باد کی مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک نہایت کارآمد اور معلوماتی کتاب تحریر فرمائی۔ اس سے نہ صرف ہماری معلومات میں اضافہ ہوگا بلکہ اس سے یہ بھی عیاں ہوگا کہ عالمی سطح پر ہندستانی خواتین کا کردار رہا ہے اور کھیل کو ان لوگوں نے کن بلندیوں تک پہنچایا۔ ڈاکٹر بانو سرتاج کے اسلوب نگارش نے کتاب کو مزید باوقار بنا دیا ہے۔ اب تک ان کی دو درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

داغ داغ زندگی

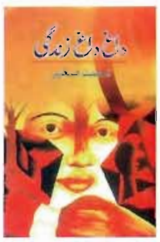

مصنف: احمد صغیر
صفحات: 160، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6
مبصر: محمد جسیم الدین، پتہ: سی، 633، گلی نمبر 9، ذاکر نگر، نئی دہلی 25

معاشرتی زندگی کی عکاسی کے حوالے سے موجودہ دور کا ایک افسانہ نگار احمد صغیر ہے۔ ان کا تازہ افسانوی مجموعہ 'داغ داغ زندگی' میرے سامنے ہے۔ 'داغ داغ زندگی' احمد صغیر کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے، اس سے قبل ان کے تین افسانوی مجموعے 'منڈیر پر بیٹھا پرندہ'، 'انا کو آنے دو' اور 'درمیاں کوئی تو ہے' شائع ہو کر اہل علم و ادب اور دانشوران فکر و نظر سے داد و تحسین کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ اس لیے افسانہ نگاری کے میدان میں احمد صغیر کا نام نیا نہیں ہے۔ احمد صغیر کی کہانیوں میں زندگی کے حقائق موجود ہیں۔ کہیں یہ زندگی اور رومان کے حسین نظاروں سے عبارت ہے اور کہیں معاشرتی ناانصافیوں اور ظلم و ستم سے زندگی کے سماجی، معاشرتی و رومانی کئی پہلو ان کے افسانوں میں موجود ہیں۔ ان کے افسانوں میں رومان، حقیقت اور یہاں کے خاص تہذیبی ماحول کی عکاسی ملتی ہے۔ احمد صغیر نے اپنے افسانوں میں حقیقت نگاری اور سماجی شعور کو اپنانے کی کوشش کی ہے اور تخیلات اور غیر فطری زندگی میں الجھنے کی بجائے اُسی زمین، مٹی اور معاشرہ سے مواد حاصل کیا ہے، جس سے قاری کو اپنے معاشرے کی جھلک دکھائی دیتی ہے، انھوں نے اپنے افسانوں میں معاشرتی حقائق اور ان کے ساتھ ساتھ یہاں کی تہذیبی زندگی کے نقوش کو ابھارا ہے۔

جدید نسل سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگار احمد صغیر نے نہ صرف حقیقت نگاری کو آگے بڑھایا، بلکہ اس میں نکھار اور تنوع بھی پیدا کیا۔ دراصل جس زندگی سے افسانہ نگار کی واقفیت درست اور براہ راست ہوا سے اپنے تخیل میں خام مواد کے طور پر استعمال کرنا سونے پر سہاگہ کے مترادف ہوتا ہے۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا اس بدلے ہوئے تناظر کو اردو کے افسانہ نگاروں نے اسی طرح محسوس کیا ہے جس طرح ہم سب بین الاقوامی سیاست کے زیر اثر جی رہے ہیں اور

جن پیچیدہ معاملات سے دو چار ہیں جہاں کوئی باضابطہ اصول، مطمح نظر یا فلسفہ کام نہیں آرہا ہے۔اب ایک مرکز پر ٹھہراؤ نہیں ہے۔فکری اور جماعتی، دونوں ہی اعتبار سے انتشار پسندی میں اضافہ ہوا ہے مثال کے طور پر تعلیم کو ہی لے لیجیے آج تعلیم کا مقصد شخصیت کی تعمیر اور صحت مند تہذیبی قدروں اور علمی استعداد میں اضافہ کے لیے نہیں ہے بلکہ ذاتی ترقی اور نفع ہے۔احمد صغیر کے افسانوں میں اس قسم مسائل کو اٹھایا گیا ہے۔'داغ داغ زندگی' 16 افسانوں کا مجموعہ ہے، جس میں انھوں نے موجودہ معاشرے کو آئینہ دکھایا ہے۔'میں دامنی نہیں ہوں' کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں: سکھیا اپنی بیٹی کی لاش لے کر ایک میڈیا والے کے پاس گئی۔آپ تو میڈیا والے ہیں، میری بیٹی کی عزت لوٹی گئی اور ظالموں نے اسے جان سے بھی مار ڈالا، آپ اپنے چینل پر اس رپورٹ کو دکھائیے، تا کہ میرے ساتھ انصاف ہو سکے، ظالموں کو سزا مل سکے۔میڈیا والا زیرلب مسکرایا" تیری بیٹی کوئی دامنی تھوڑی ہی تھی یا اسکول میں پڑھنے والی وہ کم سن لڑکی بھی نہیں تھی، جس کی عزت لوٹی گئی ہے تیری عزت کی قیمت ہی کیا ہے جو خبر بناؤں، تمھاری رپورٹ سے ہمارے چینل کا ٹی آر پی بھی نہیں بڑھے گا جاؤ اس لاش کو جلانے کا انتظام کرو میری طرف سے یہ سو روپے رکھ لو، لاش کو جلانے میں کام آئے گا"

سکھیا نے وہ روپیہ تو نہیں لیا، البتہ اپنی بیٹی کی لاش لیے ایک لیڈر کے پاس پہنچ گئی۔'حضور میری بیٹی کی عزت اور جان'

لیڈر کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے سکھیا کی طرف دیکھا۔"اگر تمھاری جیسی عورتوں کو پولیٹیکل ایشو بنایا گیا تو کتنی جنتا میرے ساتھ اترے گی، دامنی میڈیکل کی چھاترا تھی، اس لیے لوگوں کی ہمدردی اس کے ساتھ تھی پورے ہندوستان میں تحریک نے زور پکڑا اور سرکار کو قانون تک بنانا پڑ گیا... نہیں... نہیں... تمھارے اشو پر ہم کوئی تحریک نہیں چلا سکتے......جاؤ اور اس کا انتم سنسکار کرو......لو میری طرف سے پانچ سو روپے رکھ لو......بھگوان تمھاری بیٹی کی آتما کو شانتی دے۔"

یقیناً اس اقتباس میں بدلتے دور کا اور ترقی یافتہ سماج کا ایک المیہ ہے، جو ہمیں پل بھر سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہماری فکر اور سمجھ کی سطح کہاں جا رہی ہے۔'داغ داغ زندگی' بھی ایسا افسانہ ہے جو ماحول اور معاشرے میں انسان کس طرح ڈھل جاتا ہے، اور آخر کار ناعاقبت اندیشی سے ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے، جس سے کہ پوری زندگی داغدار ہو جاتی ہے اور اس کا کرب زندگی بھر برقرار رہتا ہے۔'شدھی کرن' میں اونچ نیچ کے فلسفے کو نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے، 'مسیحائی' میں ازلی و ابدی دشمنی کی زہر ناکی کو بیان کیا ہے۔الغرض مجموعی طور پر 'داغ داغ زندگی' میں شامل سبھی افسانے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور انسان کے دل و دماغ پر اپنا اثر چھوڑتے ہیں۔امید ہے کہ احمد صغیر کا یہ افسانوی مجموعہ بھی ان کے سابقہ افسانوں کی طرح قبولیت حاصل کرے گا۔

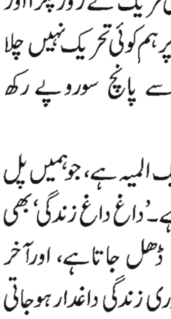

فکر و تحقیق (اردو اشاریوں پر خصوصی شمارہ)

مرتب: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

صفحات: 200، قیمت: 25 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

تبصرہ نگار: ثوبان سعید، ایسوسی ایٹ پروفیسر، خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی-فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ

قومی کونسل نے سہ ماہی فکر و تحقیق کا نیا شمارہ اردو اشاریہ سازی نمبر کے طور پر شائع کیا ہے۔ایک طرف جہاں زندگی کی تیز رفتاری اور انسان کی عدیم الفرصتی نے اس کو مجبور بنا رکھا ہے وہیں دوسری طرف نئی کتابوں کی اشاعت میں بھی قابل ذکر اضافہ ہوا ہے۔ پہلے کتابیں گنی چنی چھپتی تھیں اور محدود ذرائع ابلاغ کے باوجود کتابوں تک رسائی کی بھی کوئی نہ کوئی سبیل نکل ہی آتی تھی۔اب کتابوں کی بہتات ہے، کتابیں فراوانی سے چھپتی ہیں اور تقریباً دنیا کے سبھی علاقوں میں اس کی اشاعت کا معقول نظم وضبط ہے۔انٹرنیٹ اور ذرائع ابلاغ کی سہولیت کے باوجود سبھی کتابوں تک رسائی نسبتاً ایک بڑا چیلنج ہے۔اس صورت حال میں اشاریہ سازی کا فن افادیت اور معنویت کے نئے اوتار کے روپ میں سامنے آیا ہے۔اس کی تاریخ اگرچہ کئی دہائیوں کا سفر طے کر چکی ہے لیکن حالات کے جبر اور اپنی افادیت کے نقطۂ نظر سے اب اس کی اہمیت دوچند ہوتی جا رہی ہے۔یہ بڑی وجہ ہے جس کے سبب اشاریہ سازی کے میدان میں جتنے بھی کام ہوئے ہیں وہ اپنی نوعیت اور دائرۂ کار کے اختلاف کے باوجود قارئین اور ریسرچ اسکالر کی توجہ کھینچنے میں خاصے کامیاب کہے جا سکتے ہیں۔

اس طرح کے کام جب ادارے کرتے ہیں تو اس کی بازگشت دور تک سنائی دیتی ہے اور کام کرنے والوں کو اس طرح کے کاموں سے حوصلہ ملتا ہے۔فکر و نظر میں تبدیلی آتی ہے اور ذہن سازی اور رائے عامہ ہموار کرنے میں مدد ملتی ہے۔ہم سبھی جانتے ہیں کہ آج بھی اشاریہ سازی کو دوسرے درجے کا کام سمجھا جاتا ہے لیکن اس کی قدر کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے یا تو براہ راست اس کام کا تجربہ کیا ہے یا اس سے مستفید ہونے کا انھیں موقع ملا ہے۔یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ اشاریہ سازی سے اشاریہ ساز کو بہت بڑا علمی فائدہ شاید نہ پہنچے لیکن وہ اپنی کشتی جلا کر بہت سارے پیراکوں کو ساحل تک پہنچانے کا فرض یقینی طور سے ادا کرتا ہے۔

فکر و تحقیق کا موجودہ شمارہ بعض اسباب کی بنیاد پر ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ شمارے میں بعض اصولی نوعیت کے مضامین ہیں اور بیش تر مضامین اشاریہ سازی کے مختلف نمونوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔دیوان حنان خاں کا مضمون اشاریہ سازی کی تاریخ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے اصول و نظریات سے بحث کرتا ہے۔مضمون نگار نے ایسے موقر رسائل وجرائد کی فہرست بھی پیش کر دی ہے جن کے اشاریے منظر عام پر آ چکے ہیں۔مختلف یونیورسٹیوں میں بھی اشاریہ سازی پر تحقیقی مقالات لکھوائے گئے ہیں، ان کی جانب بھی مختصراً ہی سہی اشارے کیے گئے ہیں۔ڈاکٹر شمس بدایونی کا مضمون پروفیسر سید حنیف نقوی مرحوم کی تصنیفات و مقالات کا اشاریہ ہے۔حنیف نقوی صاحب نے تذکراتی تحقیق، غالبیات، سوانحی تحقیق، اصول تحقیق وغیرہ پر قابل قدر کام کیا ہے۔ ان کے مقالات کی تعداد 156 تک پہنچتی ہے۔شمس بدایونی کے مضمون میں ان جملہ تحریروں کا اشاریہ تیار ہو گیا ہے۔اس طرح حنیف نقوی کی تحریروں سے مکمل استفادے کی ایک بہتر اور آسان صورت پیدا ہو گئی ہے۔سید مسعود حسن نے سید محی الدین قادری زور صاحب کی تحریروں کا اشاریہ تیار کیا ہے۔زور صاحب محقق، ماہر لسانیات، مورخ اور شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ان کی خدمات کا دائرہ بہت پھیلا ہوا ہے۔اس مضمون میں زور صاحب کی تمام تحریروں کا احاطہ کرتے ہوئے خود زور صاحب پر لکھی گئی کتابوں کی فہرست بھی پیش کر دی گئی ہے۔شائستہ خان کا مضمون مشہور رسالے 'زمانہ' کا اشاریہ ہے۔افسانے پر کام کرنے والوں کے لیے محمد اطہر مسعود خاں کا مضمون 'اردو افسانے کا اشاریہ' کسی نعمت سے کم نہیں۔زبیر شاداب نے اپنے مضمون میں اردو لسانیات کا احاطہ کیا ہے اور اس موضوع پر شائع ہونے والی کتابوں کا مختصراً تعارف بھی پیش کر دیا ہے جس سے اس مضمون کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے۔مشیر احمد کا مضمون گورکھپور یونیورسٹی میں لکھے گئے تحقیقی مقالات کی تفصیل بیان کرتا ہے۔مضمون بہتر ہے اور محنت سے تیار کیا گیا ہے۔ اس کو اگر ڈاٹا بیس کی شکل میں شائع کیا جاتا تو اشاریہ کہلاتا۔شمیم صاحب کا مضمون مولانا احمد رضا خاں صاحب کی نعتیہ شاعری کے لسانی تجزیے پر مبنی ہے۔جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ اس طرح کے کام اداروں کی زیر نگرانی بہتر طور سے کرائے جا سکتے ہیں اور ان کو مزید مفید مطلب بنایا جا سکتا ہے۔یہ ایک اچھی شروعات ہے۔امید کی جانی چاہیے کہ اس طرح کے کام دوسروں کے لیے بھی حوصلہ افزائی کا باعث ہوں گے۔ ■

عالمی اردو نامہ

عزیز نبیل سے خاص گفتگو

عرب اور خلیجی ملکوں میں اردو زبان حالیہ برسوں میں ایک بڑی لسانی طاقت کے طور پر ابھری ہے جس کا سہرا یوں تو ہندوستان اور پاکستان سے وہاں روزگار کے سلسلے میں جابسنے والے اردو دانوں کے سر جاتا ہے لیکن اس خطے کو اردو ادب اور شاعری کا ایک مرکز بنانے میں ان تخلیق کاروں کا بڑا ہاتھ ہے جو اپنے روزگار کی مصروفیات میں سے بھی وقت نکال کر ادبی سرگرمیوں سے ایک بہتر تخلیقی ماحول بنانے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ ایسی شخصیتوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ ان میں بھی نوجوان شاعر اور ادبی صحافی عزیز نبیل ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور قطر میں رہ کر انہوں نے اردو شعر و ادب کی وہ شمعیں روشن کی ہیں جن کی روشنی تقریباً تمام خلیجی عرب دنیامیں پہنچ رہی ہے۔ پیش خدمت ہے ڈاکٹر عبدالحی کے ان سے لیے گئے انٹرویو کے اقتباسات:

عبدالحی: سب سے پہلے آپ اپنی تعلیم وتربیت اور پرورش کے بارے میں ہمارے قارئین کو آگاہ کریں؟

عزیز نبیل: میری پیدائش ممبئی میں ہوئی، لیکن ہوش سنبھالا تو خود کو الہ آباد کے قصبہ مئو آئمہ میں پایا۔ 6 سال کی عمر میں پھر ممبئی کی جانب واپسی ہوئی، 8 سال کا ہوا تو اعظم گڑھ میں جامعۃ الفلاح میں تعلیم کی غرض سے داخل کرادیا گیا، پھر یہ تعلیمی سلسلہ جامعہ ملّیہ اسلامیہ، دہلی منتقل ہوا۔ اسی دوران یہ ہوا کہ مستقل سکونت ممبئی سے بھیونڈی منتقل ہوچکی تھی۔ اور پھر تلاشِ معاش کے چکّر نے 1999 میں قطر کے صحراؤں میں لا پٹکا۔

ع.ح: شاعری کی جانب کس طرح مائل ہوئے؟

عزیز نبیل: مجھے نہیں پتہ کہ وہ کون سا لمحہ تھا جب مجھ میں شاعرانہ احساسات جاگے، ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ جب سے ہوش سنبھالا میرے دل اور میری روح کو شاعری اور ادب خود سے بہت قریب اور اپنے اپنے سے لگے۔ بچپن کی یادوں میں والدہ کی زبانی کچھ شعرا کی مشہور نعتوں کو ذوق وشوق سے سننا شامل ہے اور یہ بھی کہ جب لکھنے پڑھنے کی صلاحیت ودیعت ہوئی تو کتابوں سے بہت زیادہ قربت ہوگئی۔ دس سال کی عمر تک آتے آتے بے شمار شعرا کے دواوین اور بہت سارے فکشن نگاروں کے افسانے اور ناول پڑھ ڈالے تب تک معاملہ محض ذوق اور شوق کی تسکین تک ہی رہا، اندازہ نہیں تھا کہ کبھی خود بھی شعر گوئی کی لت کا شکار ہوجاؤں گا۔ عرصہ دراز تک مطالعے کا اور اشعار کو حافظے میں جگہ دینے کا یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا اس دوران کچھ افسانے اور مضامین لکھے لیکن ہنوز یہ معاملات خفیہ رہے کہ اشاعت کا کوئی سلسلہ نہیں رکھا اور پھر عمر کے پندرہویں سال میں کئی ساری غزلیں کہہ ڈالیں اور بس یہیں سے شاعری میری ضرورت بن گئی کیونکہ مجھے اپنے احساسات کے اظہار کے لیے کوئی وسیلہ بہت ضروری ہوگیا تھا۔

ع ح: اپنے شعروں پر آپ نے پہلے پہل کس سے اصلاح لی؟

عزیز نبیل: میرے نزدیک شاعری میں کسی استاد سے اصلاح کا سلسلہ قائم نہ رکھنا کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔ لیکن میرا معاملہ یہ رہا کہ مسلسل ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف بھاگتی ہوئی زندگی نے یہ موقعہ ہی نہیں فراہم کیا کہ کسی کے سامنے زانوئے تلمّذ تہہ کرتا۔ البتہ دو سال تک مرحوم ملک مصیب الرحمٰن سے زبان و بیان پر اور فن کی باریکیوں پر گفتگو اور مشورے ضرور کرتا رہا ہوں۔ مرحوم مجلس فروغِ اردو ادب قطر کے بانی تھے، گرچہ شعر نہیں کہتے تھے لیکن فنِ شاعری پر بے پناہ دسترس حاصل تھی۔ موت تو غیر متوقع ہی ہوتی ہے لیکن مصیب صاحب کی غیر متوقع اور بے وقت موت سے مجھے بے انتہا نقصان ہوا۔ اللہ انھیں غریقِ رحمت کرے۔

اردو شاعری کی استادی اور شاگردی والی روایت اِن دنوں نہ صرف کمزور ہوگئی ہے بلکہ تقریبا مفقود ہو چلی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ نشستوں اور مشاعروں میں بہت سارے لوگ زبان و بیان کے معاملات کی فکر نہ کرتے ہوئے اور بحر اور وزن کو اہم نہ سمجھتے ہوئے الٹی سیدھی غزلیں سناتے ہوئے جھجک محسوس نہیں کرتے۔ حتّی کہ مجموعۂ کلام کی اشاعت کے سلسلہ میں بھی بہت سے شعرا زبان و بیان کے معاملات میں کسی استاد سے مشورہ ضروری نہیں سمجھتے۔

ع ح: بطور شاعر، صحافی اور محقق آپ نے اپنی ایک شناخت بنائی ہے۔ شاعری سے صحافت اور پھر تحقیق کی طرف کیوں متوجہ ہوئے؟

عزیز نبیل: شاعری سے صحافت اور تحقیق تک کا میرا سارا سفر کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں۔ طبیعت کا میلان مجھے ایک حیرت سے دوسری حیرت کی طرف کھینچتا رہا اور میں کشاں کشاں آگے بڑھتا رہا۔ میری سرشت میں موجود تلاش اور جستجو کے مادّہ نے مجھے ادبی صحافت اور تحقیق کی رہگزر کا راہی بنادیا۔ مجلّہ دستاویز کا اجرا میرے اِس سفر کا سنگِ میل ہے۔ ایک بالکل مختلف ادبی رسالہ، ایک ایسا رسالہ جو بہت سارے رسائل وجرائد کی بھیڑ میں گم نہ ہوسکے، ایک بالکل الگ انداز کا رسالہ جسے صحیح معنوں میں ادبی دستاویز کہا جا سکے۔

ع ح: شاعر یا نثر نگار کسے آپ فوقیت دیں گے؟

عزیز نبیل: شاعر اور نثر نگار دونوں ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں۔ دونوں کا ہی مقصد ادب تخلیق کرنا، مافی الضمیر کا بیان اور قاری تک اپنے خیالات کی ترسیل ہے۔ لیکن یہ بات بھی ایک مسلّم حقیقت ہے کہ بہترین نثر وہی ہے جس میں شاعری کی خوشبو رچی بسی ہو۔ جس نثر میں شاعری کی عطر بیزی نہ ہو وہ خشک کہلاتی ہے۔ ذاتی طور پر مجھے شاعری نثر سے زیادہ اپیل کرتی ہے کیوں کہ نثر کے مقابلہ میں شاعری اپنے قاری کو سوچنے سمجھنے کی زیادہ آزادی فراہم کرتی ہے، ایک بات کے مختلف زاویے اور پہلو پیش کرتی ہے اور دل ودماغ کو بہت جلد متوجّہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ع ح: آپ کے کچھ اشعار اور مصرعے بہت ہی خوبصورت ہیں۔ مثلاً، اس نے تراشا ایک نیا عذر لنگ پھر، مستقل اک بے یقینی اک مسلسل انتظار، میں جیسے وقت کے ہاتھوں میں اک خزانہ تھا، سرائے درد میں بیٹھے ہوئے ہیں دل والے۔ بس ایک آخری تہمت کے انتظار میں ہیں،

جس طرف دیکھو ہزاروں سلسلے بیتاب ہیں۔ اک ہماری جستجو ہے اور ہم نایاب ہیں، دشت والے نئے برباد کو کب جانتے ہیں، کاش اک روز کوئی چھو کے بتائے مجھ کو، خامشی ٹوٹے گی، آواز کا پتھر بھی تو ہو۔ جس قدر شور ہے اندر، کبھی باہر بھی تو ہو' وغیرہ۔ ایسے اشعار کو ہمیشہ یاد رکھا جاسکتا ہے۔ ایسے اشعار کی تحریک کہاں سے ملی۔

عزیز نبیل: مجھے اس وقت عبیداللہ علیم کا ایک شعر یاد آرہا ہے:

صدائیں ایک سی یکسانیت میں ڈوب جاتی ہیں
ذرا سا مختلف جس نے پکارا یاد رہتا ہے

دراصل یہی مختلف اور منفرد ہونا سب سے اہم ہے۔ خیال اور اسلوب دونوں سطح پر۔ شاعری میں جتنی اہمیت خیال کی انفرادیت کو ہے اتنی ہی اہمیت اسلوبِ بیان کو بھی ہے، ایسا اسلوب جس میں نغمگی ہو، شائستگی ہو، روانی ہو اور صفائیِ کلام ہو۔ الغرض ہمیشہ یاد رکھے جانے والے اشعار وہی ہوسکتے ہیں جو قاری یا سامع کی آنکھوں میں چمک اور روح میں سرشاری پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

طبیعت کی موزونی کی بنیاد پر عام سی باتوں کو شاعری کا جامہ پہنادینا ایک مختلف عمل ہے اور خوبصورت، دلفریب اور دل و دماغ کو اپیل کرنے والے اشعار کی تجسیم یقیناً ایک بالکل الگ کیفیت کا نام ہے۔ ایسی شاعری جس میں قاری اور سامع کی آنکھوں میں چمک اور دل میں للک پیدا کرنے کی قوت ہو جہدِ مسلسل اور طویل ریاضت چاہتا ہے۔

یہ میرا یقین ہے فنکار کا فن تب تک ہی عروج کی طرف سفر کرتا ہے جب تک وہ خود کو مکمل نہیں سمجھتا، چنانچہ میں مسلسل سفر میں ہوں اور مستقل کچھ نیا سیکھنے اور نیا کہنے کے عمل سے گزر رہا ہوں۔ ہمیشہ اپنے حافظے کو اچھے اشعار کے استقبال کے لیے تیار رکھتا ہوں۔

ع ح: نئے شعرا میں آپ کو ایک بہتر شاعر کے طور پر جانا جاتا ہے، آپ قطر اسٹیل میں ملازمت کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ فولاد اور اردو ادب و شاعری کا کوئی رشتہ نہیں۔ کیسے وقت نکال لیتے ہیں اردو ادب اور شاعری کے لیے؟

عزیز نبیل: آپ نے درست کہا کہ شعر و ادب اور فولاد کا کوئی آپسی رشتہ نہیں ہے۔ لیکن کیا کیا جائے شاعری میرا عشق ہے تو ملازمت میری ضرورت اور جب عشق پختہ ہوتو اپنے لیے جگہ بنا ہی لیتا ہے۔

ع ح: 2011 میں آپ کا شعری مجموعہ خواب سمندر منظر عام پر آیا۔ خواب سمندر اور اس کی شاعری کے متعلق کچھ بتائیں؟

عزیز نبیل: خواب سمندر دراصل میری آرزوؤں، حسرتوں اور زندگی میں پیش آئیں بے شمار خوشیوں، محرومیوں، مسکراہٹوں اور آنسوؤں کا بے پناہ سمندر ہے۔ 208 صفحات پر مشتمل اس مجموعے کی اشاعت کے لیے خود کو تیار کرنے میں تین سال سے زائد عرصہ لگ گیا۔ اس تاخیر کی سب سے بڑی بلکہ واحد وجہ یہ خوف تھا کہ کیا واقعی میں نے اس لائق شاعری تخلیق کر لی ہے کہ اسے شائع کر کے اہلِ علم و ادب کی بارگاہ میں پیش کرسکوں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرا مجموعہ پڑھنے کے بعد قاری کو یہ محسوس ہونے لگے کہ اس نے اپنا وقت ضائع کردیا۔ یہ خیال اس قدر مجھے ستاتا رہا کہ میں نے اپنی ایک نظم کا اختتام اس انداز میں کیا:

مجھے خود کو بھی اپنے ہی سوالوں سے گزرنا ہے
مجھے خود کو بتانا ہے کہ میرے ذہن کے ترکش میں
بے ہنگم سوالوں کے کہاں سے تیر آتے ہیں
مجھے یہ پوچھنا ہے اپنے شاعر سے
کہ میں کیوں شعر کہتا ہوں
میرے کہنے نہ کہنے سے کہاں کچھ فرق پڑتا ہے

الغرض اسی شش و پنج میں وقت نکلتا گیا لیکن پھر ہمت باندھ لی اور میری شاعری کا مجموعہ خواب سمندر کے نام سے شائع ہوگیا۔ مجھے اندازہ ہے کہ خوابوں کے اگلے سمندر تک پہنچنے کے لیے ابھی بے شمار جزیروں کو سر کرنا پڑے گا:

ع ح: آپ کا صحافتی کارنامہ بھی کچھ کم نہیں، آپ کے جریدے دستاویز کے رسائل و جرائد نمبر کو لوگ ابھی بھی تلاش کرتے ہیں؟ ادبی صحافت موجودہ دور میں جوئے شیر لانے کے برابر ہے، اپنی صحافتی کارکردگی پر روشنی ڈالیں:

عزیز نبیل: مجلّہ دستاویز بیک وقت دوحہ اور دہلی سے شائع ہونے والا ایک ضخیم ادبی رسالہ ہے۔ 2010 میں دستاویز کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر آیا۔ 460 میگزین سائز صفحات پر مشتمل اس شمارے میں عالمی اردو ادب کے ان مایہ ناز قلم کاروں کی تخلیقات کو دستاویز کیا گیا تھا جو اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں جہانِ اردو کو سوگوار کر گئے تھے۔ 82 بہت اہم شعرا و ادبا کی بھرپور تخلیقات کو شاملِ اشاعت کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ 2000 سے 2009 کے درمیان وفات پانے والے تین سو سے زائد شعرا و ادبا کا سوانحی اشاریہ۔ دستاویز کا شمارہ دوم اور سوم، اردو کے اہم ادبی رسائل و جرائد نمبر تھا، 700 سے زائد صفحات پر مشتمل اس شمار میں ادبی رسائل و جرائد کی گزشتہ ایک سو دس سال کی تاریخ کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 25 نہایت اہم رسائل کے گوشے شامل ہیں جن میں متعلقہ رسالے کے مختلف شماروں سے نادر و نایاب تحریروں کو شامل کیا گیا ہے۔

دستاویز نمبر 4 فی الحال اشاعت کے مراحل میں ہے، یہ شمارہ اردو کے اہم غیر مسلم شعرا و ادبا کی اہم تخلیقات پر مشتمل ہے۔ اردو ادب میں از ابتداء تا حال جن اہم غیر مسلم شعرا و ادبا نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان کا ذکر، تصویریں اور آخر میں 300 سے زائد شعرا و ادبا کا سوانحی اشاریہ۔

ع ح: فراق گورکھپوری پر ابھی ابھی آپ کی ترتیب دی ہوئی کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب پر روشنی ڈالیں، یہ کتاب کس طرح فراق کی شاعری اور شخصیت پر انفرادیت رکھتی ہے؟ یہ بھی بتائیں کہ آجکل آپ کس شاعر یا ادیب پر کام کررہے ہیں؟

عزیز نبیل: دراصل فراق گورکھپوری شخصیت شاعری اور شناخت 800 صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے، جس کی اشاعت بحرین کی مشہور و معروف سماجی، معاشی اور ادبی شخصیت شکیل احمد صبرحدی صاحب کی تحریک پر مجلس فخرِ بحرین برائے فروغِ اردو کے دوسرے سالانہ مشاعرہ بیاد فراق کی مناسبت سے منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب میں فراق گورکھپوری کی شخصیت شاعری اور شناخت کو کئی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب نادر و نایاب: فراق کا شجرہ، سوانح، تصاویر، کتابوں کے سرورق، عکس تحریر وغیرہ۔ دوسرا باب- یادیں، ملاقاتیں اور خاکے: مذکورہ حصے میں مجتبیٰ حسن، آل احمد سرور، جگن ناتھ آزاد، دوارکاداس شعلہ، ممتاز زمن، ملک زادہ منظور، شمیم حنفی جیسے قلم، کاروں کے دلچسپ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ تیسرا باب- تذکرہ و تبصرہ- شخصیت و فن: مذکورہ حصے میں کل 9 عدد مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ لکھنے والوں میں شامل ہیں انتظار حسین، راج بہادر گوڑ، عزیز احمد، کمال صدیقی، مجنوں گورکھپوری، وامق جونپوری وغیرہ۔ چوتھا حصّہ- فراق فہمی- تحقیق و تنقید: اس طویل حصے میں کل 27 تحریریں شامل ہیں۔ پانچواں حصّہ- فراق نامہ: فراق کے انٹرویو، خطوط، نثری تحریریں اور شاعری شامل کی گئی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ فراق پر بہت کچھ کام ہونے کے باوجود اتنا وقیع اور جامع کام نہیں ہوسکا ہے۔ میرے بیان کردہ کتاب کے مشمولات سے اس کتاب کی انفرادیت کا بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا۔

فی الحال تو میں دستاویز کے اہم غیر مسلم شعرا و ادبا کی اشاعت پر کام کررہا ہوں۔ جس کے بعد مجھے مجلس فخرِ بحرین کے تیسرے عالمی مشاعرہ بیاد عرفان صدیقی کی مناسبت سے فراق والی اسی کتاب کی نہج پر عرفان صدیقی پر بھی کتاب ترتیب دینی ہے۔

ع ح: آپ نے مختلف ممالک کا دورہ بھی کیا ہے وہاں اردو کی صورتحال پر مختصراً روشنی ڈالیں؟

عزیز نبیل: جی ہاں خلیج عرب کے مختلف ممالک کے لیے اکثر و بیشتر سفر رہتا ہے۔ تقریباً تمام ہی خلیجی ممالک کی صورتِ حال یکساں ہے۔ اِن ممالک میں نثر سے زیادہ شاعری کا بول بالا ہے۔ مختلف تنظیمیں اپنی اپنی سطح پر اردو

قومی اردو کونسل میں فراق گورکھپوری شخصیت شاعری اور شناخت کے اجرا کا منظر

کے فروغ اور ترویج کے لیے کوشاں ہیں۔ شعری نشستوں اور مشاعروں کا انعقاد بڑی تعداد میں ہوتا ہے۔ خلیجی ممالک میں ہندوپاک سے آئے ہوئے اہلِ اردو نے ان ممالک میں اردو کی سرگرمیاں اسی طرح جاری رکھی ہوئی ہیں جس طرح اپنے ملکوں میں ہوتی ہیں۔

اِن ممالک میں عربی اور انگریزی کے بعد عام بول چال کی زبان اردو ہی ہے جس میں مختلف لہجے اور مختلف زبانوں کے الفاظ خوبخود شامل ہوگئے ہیں۔ عربی اور انگریزی کے علاوہ اردو میں سائن بورڈز جا بجا نظر آتے ہیں۔ تقریباً ہر ملک میں حکومت کی سرپرستی میں اردو ریڈیو جاری ہے۔ پاکستانی اسکولوں کے علاوہ تقریباً تمام ہندوستانی اسکولوں میں اردو اختیاری مضمون کے طور پر شامل ہوتی ہے۔ الغرض صورتِ حال امید افزا اور خوش کن ہے۔

ع ح : آپ گذشتہ بارہ تیرہ برسوں سے قطر میں قیام پذیر ہیں اور مختلف اردو انجمنوں، اداروں سے بھی وابستہ ہیں، کئی پروگرام بھی کراتے رہے ہیں، وہاں کی ادبی صورتحال پر روشنی ڈالیں؟

عزیز نبیل: قطر میں اردو زبان اور شعروادب کی ترقی وترویج کا ایک بے مثال سلسلہ قائم ہے جس کا دائرہ بین الاقوامی سطح تک پھیلا ہوا ہے۔ چار اہم تنظیمیں ہیں جو مسلسل کئی سالوں سے اردو کی ترویج کی کوششوں میں مصروف ہیں، جس میں سرِفہرست مجلس فروغ اردوادب کا نام آتا ہے جس کے بانی مرحوم ملک مصیب الرحمٰن ہیں اور فی الحال مجلس کے روحِ رواں محمد عتیق صاحب ہیں، مجلس سالانہ عالمی مشاعروں اور عالمی سطح کے سالانہ ایوارڈ کے لیے پوری دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ دوسری اہم تنظیم انجمن محبّانِ اردو ہند قطر ہے جس کی گوناگوں سرگرمیوں نے گزشتہ ایک عشرے میں اندرونِ قطر اور بیرونِ قطر اپنی الگ شناخت قائم کی ہے، انجمن کی اہم سرگرمیوں میں سے ایک سالانہ کل ہند مشاعروں کا انعقاد اور ہر دو ماہ میں مقامی شعرا کے لیے پروقار اور معیاری مشاعرہ منعقد کرنا ہے۔ بزمِ اردو قطر دوحہ کی سب سے قدیم تنظیم ہے جو ہر ماہ باقاعدگی سے طرحی نشستوں کا انعقاد کرتی ہے اور اس کے علاوہ سالانہ مشاعرہ اور سیمینار منعقد کرتی ہے جس میں ہندوپاک سے شعرا وادبا شریک ہوتے ہیں۔

قطر کی سرزمین سے اردو کے دو رسائل شائع ہوتے ہیں۔ سب سے قدیم رسالہ مشہور شاعر وادیب جناب محمد ممتاز راشد کی ادارت میں گزشتہ کئی برسوں سے خیال وفن کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ دوسرا اہم رسالہ مجلّہ دستاویز ہے جسے اردو ادب کا سالانہ دستاویزی سلسلہ کہا جاسکتا ہے اور خاکسار اس مجلّہ کا مدیرِ اعلیٰ ہے۔ اور ایک ہفت روزہ اردو اخبار سیاست گزشتہ دو برسوں سے باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

ع ح: روزمرہ زندگی کی غیر ادبی مشغولیات یا دلچسپی اور شوق کے بارے میں کچھ بتائیں؟

عزیز نبیل:

فکرِ معاش، عشقِ بتاں یادِ رفتگاں
دو دن کی زندگی میں بھلا کیا کرے کوئی

قصّہ مختصر یہ سمجھیے کہ شب وروز کے محدود شاعری اور نوکری، پھر بچوں کی نگہداشت اور پرورش کی ذمّہ داریاں یہ سب کچھ اتنا زیادہ ہے کہ کسی اور مشغلہ کے لیے وقت نکالنا ممکن ہی نہیں ہے۔ ہاں میری دلچسپی کا ایک زاویہ ڈیجیٹل ڈیزائنگ بھی ہے، چنانچہ کبھی وقت نکال کر فوٹوشاب اور دیگر سافٹ ویرس کی مدد سے کچھ بناتا بگاڑتا رہتا ہوں۔

ع ح : ماہنامہ اردو دنیا پر آپ کے تاثرات، قارئین کے لیے کوئی پیغام۔

عزیز نبیل: میں اردو دنیا کے تقریباً تمام ہی شمارے آن لائن پڑھتا ہوں اور مجھے تعجب ہے کہ مختصر سے صفحات میں آپ سب نے رسالہ اردو دنیا کو اسم بامسمّٰی بناتے ہوئے پوری اردو دینا اور اس کے تمام موضوعات کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ یہ رسالہ اپنے آپ میں ایک مکمّل درسگاہ اور انسائیکلوپیڈیا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو اس بات کے لیے مبارکباد کی مستحق ہے کہ یہ ادارہ ماہنامہ اردو دنیا کی شکل میں ایک دیدہ زیب اور معلوماتی رسالہ اہلِ اردو کے سامنے ہر ماہ باقاعدگی سے پیش کرتا ہے۔

ماہنامہ اردو دنیا کے قارئین کے لیے میرا پیغام یہی ہے کہ آیئے ہم سب مل کر یہ عہد کریں کہ اردو کی بقا کے لیے ہر ممکن عملی اقدامات کریں گے۔ اردو جو ہماری میراث ہے اس کی چمک کسی طرح ماند نہیں پڑنے دیں گے اور اس ورثہ کو فخر کے ساتھ اپنی نئی نسلوں تک منتقل کریں گے۔ اردو لکھیں گے، پڑھیں گے اور بولیں گے۔ اردو کتابیں، رسائل وجرائد اور اخبارات خرید کر پڑھیں گے۔

ع ح : آخر میں آپ کے اپنے کچھ پسندیدہ اشعار:

عزیز نبیل: خواب سمندر اور اس کے بعد کی شاعری سے اپنے کچھ پسندیدہ اشعار ماہنامہ اردو دنیا کے قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں:

جس طرف چاہوں پہنچ جاؤں مسافت کیسی
میں تو آواز ہوں آواز کی ہجرت کیسی

عادتاً سلجھا رہا تھا گتھیاں کل رات مَیں
دل پریشاں تھا بہت اور مسئلہ کوئی نہ تھا

اک تعارف تو ضروری ہے سرِراہِ جنوں
دشت والے نئے برباد کو کب جانتے ہیں

تمام شہر کو تاریکیوں سے شکوہ ہے
مگر چراغ کی بیعت سے خوف آتا ہے

یہ کون بلانے لگا مجھ کو مری جانب
یہ کون سرِ شام اترنے لگا مجھ میں

جانے کتنے سورجوں کا فیض حاصل ہے اسے
اُس مکمّل روشنی سے جو ملا روشن ہوا

اب ہمیں چاک پہ رکھ یا خس و خاشاک سمجھ
کوزہ گر ہم تری آواز پہ آئے ہوئے ہیں

خامشی ٹوٹے گی آواز کا پتّھر بھی تو ہو
جس قدر شور ہے اندر کبھی باہر بھی تو ہو

میں اگر ٹوٹا تو سارا شہر بکھرے گا نبیل
ایسا پتھر ہوں فصیلِ شہر کی بنیاد کا

■

Abdul Hai
ahaijnu@gmail.com

Aziz Nabeel Doha Qatar
aziznabeel@yahoo.com

اردو پریس کلب کے زیر اہتمام دوبئی میں عالمی مشاعرہ

دوبئی: انڈین اسکول دوبئی کے شیخ راشد آڈیٹوریم میں اردو پریس کلب انٹرنیشنل کا تیسرا بین الاقوامی مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں ہندو پاک کے علاوہ ممتاز شاعر، نغمہ نگار اور مکالمہ نویس جاوید اختر نے مشاعرے کی

صدارت کی۔ سابق مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور کے۔ رحمٰن خان مہمان خصوصی کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے پرووائس چانسلر برگیڈیر سیّد احمد علی نے مہمان ذی وقار کی حیثیت سے اس مشاعرے کی رونق کو بڑھایا۔ اس مشاعرے میں ایک طرف جہاں مشاہیر شعرا نے اپنے فن کا جادو جگایا وہیں بعض نئی آوازوں نے بھی سامعین کا دل جیت لیا۔ مشاعرے کی نظامت معین شاداب نے شگفتہ وشائستہ انداز میں کی اور مشاعرے کی تہذیبی روایات کو سنبھالے رکھا۔

جاوید اختر نے صدارتی کلمات میں کہا کہ انھوں نے ایک عرصے بعد دوبئی میں ایک ایسا مشاعرہ سنا ہے جس میں معیاری ادب پیش کیا گیا اور اچھی شاعری نہ صرف پڑھی گئی بلکہ اس سے پورے وقار کے ساتھ سامعین محظوظ ہوئے۔ مہمان خصوصی کے رحمٰن خان نے اردو پریس کلب کی پندرہ سالہ سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اردو زبان وادب کے فروغ میں اس کی خدمات کی ستائش کی۔ ترقی کی یہ منازل طے کرنے کے لیے انھوں نے طارق فیضی کو مبارک باد پیش کی۔ مہمان ذی وقار برگیڈیر سید احمد علی نے اپنی تقریر میں مشاعروں کی سماجی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ مشاعرہ کنوینر طارق فیضی نے استقبالیہ کلمات میں مشاعروں کے گرتے معیار پر تشویش کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم اعلیٰ اور معیاری شاعری سننا چاہتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ اچھے شعرا کو موقع دینا ہوگا بلکہ اپنی سماعتوں کو بھی معیاری کرنا ہوگا۔ اردو پریس کلب کے اس مشاعرے میں جاوید اختر کے علاوہ نواز دیوبندی، پاپولر میرٹھی، ملک زادہ جاوید، معین شاداب، مہتاب عالم، شرف نان پاروی، معید رشیدی اور ابھیشیک شکلا نے ہندوستان کی نمائندگی کی۔ پاکستان سے عباس تابش اور ریحانہ روحی نے شرکت کی۔ جب کہ ٹورنٹو سے احمد سلمان شریک ہوئے۔ دوبئی سے جاوید صدیقی اور ابوعبیدہ اعظمی نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 جون 2014

کامران غنی اردو نیٹ جاپان کے اعزازی مدیر برائے ہندوستان مقرر

اردو نیٹ جاپان کے بیورو چیف برائے ہندوستان کامران غنی کو ان کی خدمات کے اعتراف میں اس اخبار کا اعزازی مدیر برائے ہندوستان مقرر کیا گیا ہے۔ یہ اطلاع اردو نیٹ جاپان کے بانی و مدیر اعلیٰ ناصر ناکاگاوا نے دی۔ انھوں نے کہا کہ نوجوان صحافی کامران غنی ایک عرصہ سے اردو نیٹ جاپان کے لیے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی کوششوں سے اردو نیٹ جاپان کو ہندوستانی قارئین کے درمیان مقبولیت ملی۔ کامران غنی 2011 سے اردو نیٹ جاپان سے وابستہ ہیں۔ اس سال اردو نیٹ جاپان کی پانچویں سالگرہ تقریب میں انھیں 'نوجوانوں کا نمائندہ قلمکار' کے اعزاز کے لیے نامزد کیا گیا تھا لیکن ویزا نہیں ملنے کی وجہ سے وہ تقریب میں شریک نہیں ہوسکے تھے۔ کامران غنی نے

اپنی صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ 'پندار' پٹنہ سے کیا۔

اردو نیٹ جاپان، جاپان کے شہر کوشی گایا سے شائع ہونے والا مقبول ترین آن لائن اردو روزنامہ ہے جو دنیا کے تقریباً پچاس سے زائد ممالک میں پڑھا جاتا ہے۔ برصغیر ہندو پاک کے علاوہ دنیا کے مقبول و معروف شعرا، ادبا اور صحافیوں کی تحریریں اردو نیٹ جاپان پر شائع ہوتی ہیں۔ اردو نیٹ جاپان نے 2010 میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام کو 'سال کا بہترین قلم کار' کے اعزاز سے نوازا تھا۔ کامران غنی کو اردو نیٹ جاپان کا اعزازی مدیر برائے ہندوستان بنائے جانے پر مدیر اعلیٰ ناصر ناکاگاوا اور اردو نیٹ جاپان کی پوری ٹیم نے مبارکباد پیش کی ہے۔

روزنامہ 'قومی تنظیم'، پٹنہ 31 مئی 2014

ریڈیو تہران کی اردو سروس کی 35ویں سالگرہ کے انعقاد کا منظر

ایران

ریڈیو تہران کی اردو سروس کی 35ویں سالگرہ کا انعقاد

تہران: اسلامی جمہوریۂ ایران کے دارالحکومت تہران میں ریڈیو تہران کی اردو سروس کی 35 ویں سالگرہ منائی گئی۔ سالگرہ کی تقریب کا انعقاد ایران کے ریڈیو ٹی وی کے ادارے، آئی آر آئی بی، کی ایکسٹرنل سروس کی عمارت میں کیا گیا۔ اس تقریب میں اردو کے معروف شاعر، ادیب اور دانشور افتخار عارف نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ تقریب میں ایکسٹرنل سروس کے برصغیر اور مشرقی ایشیا شعبے کے ڈائرکٹر جنرل حسین زادہ، ایکسٹرنل سروس کے تعلقات عامہ کے ڈائرکٹر احمد امیر محمدی، ریڈیو تہران کی اردو سروس کے سابق اور سحر اردو ٹی وی کے موجودہ ڈائرکٹر امیر علی زینلی، ریڈیو تہران کی ہندی اور بنگالی سروسز کے ڈائرکٹر سید قمر عباس اور مجاہدالاسلام جب کہ ہندی سروس کی سابق ڈائرکٹر زہرا زیدی بھی شریک تھیں۔ تقریب کے شروع میں اسلامی جمہوریۂ ایران کے قومی ترانے کی دھن بجائی گئی۔ ریڈیو تہران کی اردو سروس کے ڈائریکٹر سید اظفر کاظمی نے حاضرین سے خطاب کیا اور ریڈیو تہران کی کارکردگی پر مختصر طور پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر ایکسٹرنل سروس کے برصغیر اور مشرقی ایشیا شعبے کے ڈائرکٹر جنرل حسین زادہ نے بھی خطاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ گزشتہ دور میں ریڈیو صرف شارٹ ویو اور میڈیم ویو پر سنا جاتا تھا لیکن ٹیکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ریڈیو تہران اردو سروس کی نشریات اب نہ صرف شارٹ ویو اور میڈیم پر نشر کی جارہی ہیں بلکہ سٹیلائٹ، انٹرنیٹ اور موبائل فون کے ذریعے بھی یہ نشریات پوری دنیا میں سنی جارہی ہیں جبکہ ریڈیو تہران اردو سروس کی ویب سائٹ پوری دنیا میں اردو جاننے والوں کی ضروریات کو پورا کررہی ہے۔ حسین زادہ کا کہنا تھا کہ اس کے علاوہ فیس بک کے ذریعے بھی اردو زبان سے تعلق رکھنے والے افراد کی ایک بڑی تعداد ریڈیو تہران سے جڑی ہوئی ہے۔ مہمان خصوصی افتخار عارف نے اپنے خطاب میں کہا کہ میں نے بھی ریڈیو سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور اب بھی جب میرے سامنے مائک آتا ہے تو میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ آخر میں انھوں نے اپنا کلام بھی پیش کیا جسے حاضرین نے بہت پسند کیا اور داد دی۔ تقریب کے آخر میں ریڈیو تہران کی 35ویں سالگرہ کی مناسبت سے ایک کیک کاٹا گیا اور ریڈیو تہران اردو سروس کے تمام اراکین کو خوبصورت سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ ریڈیو تہران اردو سروس کے ڈائرکٹر سید اظفر کاظمی کی طرف سے حاضرین کے شکریہ کے ساتھ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ نظامت اردو سروس سے وابستہ ایرانی اسٹاف کی رکن پروانہ طالبنی نے کی۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 2 جون 2014

تہران یونیورسٹی میں اردو کنووکیشن

تہران: اسلامی جمہوریۂ ایران کے دارالحکومت تہران کی معروف تہران یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے بی اے اردو کے طلبہ و طالبات کے لیے جلسۂ تقسیم اسناد کا انعقاد کیا گیا۔ جلسۂ تقسیم اسناد کا انعقاد یونیورسٹی کی غیرملکی زبانوں کی فیکلٹی میں کیا گیا جس میں تعلیمی سال 2013 اور 2014 میں بی اے اردو کا کورس مکمل کرنے والے طلبہ و طالبات کو اسناد پیش کی گئیں۔ اس تقریب میں صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر علی بیات کے علاوہ شعبۂ اردو سے وابستہ دیگر اساتذہ بھی شریک تھے۔ جلسۂ تقسیم اسناد تین سیشنوں پر مشتمل تھا اور اس موقعے پر اساتذہ کی طرف سے بڑا سا کیک بھی کاٹا گیا۔ تقریب کی دلچسپ بات یہ تھی کہ تینوں سیشنوں کی نظامت اردو کے ایرانی طلبہ و طالبات نے اپنے مخصوص لہجے میں انجام دی اور انھوں نے ایک سیشن میں ایک خاکہ بھی پیش کیا۔

اسناد پانے والے طلبہ و طالبات گروپ پوز دیتے ہوئے

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 29 مئی 2014

قطر

دوحہ قطر میں محفل مشاعرہ کا انعقاد

دوحہ: دوحہ کی اوّلین اردو ادبی تنظیم بزم اردو کے زیراہتمام دوحہ کے ریان روڈ پر واقع معروف دواخانہ 'صدلیہ الریم' کے پیچھے 'دکن ہال' کے خوبصورت خیمہ نما ہال میں پچھلے دنوں سالانہ مزاحیہ طرحی مشاعرے کا انعقاد ہوا، جس کی صدارت امجد علی سرور نے اور نظامت بزم کے جنرل سکریٹری احمد اشفاق نے کی۔ مشاعرے میں شریک شعرا نے اپنے خوبصورت کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ اس موقعے پر عمائدین شہر اور محبان اردو کی بڑی تعداد موجود تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 جون 2014

لندن

لندن میں ٹیپو سلطان کی انگوٹھی کی نیلامی

لندن: ہندوستان میں اٹھارہویں صدی میں سلطنت میسور کے معروف بادشاہ ٹیپو سلطان کی ایک انگوٹھی لندن میں ہونے والی نیلامی میں فروخت کی گئی ہے۔ سونے کی یہ قدیم انگوٹھی لندن کے نیلام گھر 'کرسٹیز' میں فروخت کی گئی ہے۔ اس انگوٹھی کی غیر معمولی بات یہ ہے کہ اس پر ہندوؤں کے دیوتا رام کا نام کندہ ہے۔ بعض افراد کا کہنا ہے انگوٹھی پر رام لکھے ہونے سے اس بات کو

تقویت ملتی ہے کہ ٹیپو سلطان کے دل میں ہندوؤں کے لیے ہمدردی تھی۔ نیلامی میں یہ نادر انگوٹھی 2 لاکھ 40 ہزار ڈالر میں فروخت ہوئی۔ ہندوستان کے مشہور بادشاہ ٹیپو سلطان کا شمار ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف لڑنے والے حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ انگوٹھی 1799 میں ایک برطانوی فوجی کمانڈر نے ٹیپو سلطان کو لڑائی میں شکست دینے کے بعد ان کی انگلی سے اتار لی تھی۔ 41.2 گرام وزن کی اس انگوٹھی کو ابتدائی اندازوں کے مقابلے 10 گنا زیادہ قیمت پر فروخت کیا گیا ہے۔ یہ بات حیران کن ہے کہ ایک مسلمان جنگجو بادشاہ ہندو مذہب کے دیوتا کے نام والی انگوٹھی پہنتے تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 مئی 2014

عارف نقوی کی کتاب 'نصف صدی جرمنی میں' کا اجرا

جرمنی میں رہنے والے اردو ادیب عارف نقوی کی تازہ کتاب 'نصف صدی جرمنی میں' کی رسم اجرا یکم جون کو جرمن راجدھانی برلن میں ادا کی گئی ہے۔ یہ اس مضمون اور عنوان کی اردو میں پہلی کتاب ہے۔ اردو انجمن برلن کے

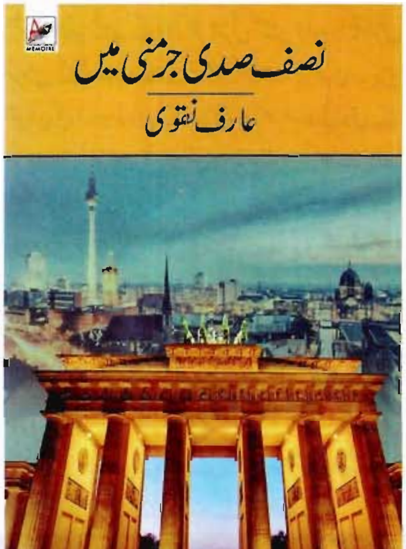

نائب صدر انور ظہیر رہبر کے الفاظ میں عارف نقوی کے جرمنی میں پچاس سالہ قیام، مشاہدات اور تجربات کا نچوڑ ہے، جس میں یہاں کی زندگی کے مسائل اور تاریخ کے اتار چڑھاؤ نیز اہم ادیبوں، فنکاروں اور دانشوروں سے عارف نقوی کی ملاقاتوں اور ان کی ذاتی زندگی کے تجربات اور تاثرات کو اتنے دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے میں مزا آتا ہے اور جرمنی کی زندگی اور مسائل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

کتاب کی رسم اجرا دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر خالد علوی کے ہاتھوں انجام پائی، جو مہمان اعزازی کی حیثیت سے تقریب میں شریک تھے۔ ڈاکٹر خالد علوی نے اس بات پر زور دیا کہ یہ اردو میں اپنی نوعیت کی نئی اور انوکھی کتاب ہے، جو جرمنی کے بارے میں بہت سی اہم اور دلچسپ معلومات سے بھری ہے اور خاص طور سے اردو قارئین کے لیے بہت اہم ہے۔

عارف نقوی 1961 میں جرمنی آئے تھے اپنے 53 برس کے برلن میں قیام کے دوران انھوں برلن کی ہمبولٹ یونیورسٹی میں پڑھانے کا کام کیا، برلن ریڈیو پر ہندوستانی پروگراموں کے مدیر کی حیثیت سے کام کیا، کئی سال آل انڈیا ریڈیو کی اور برسوں پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے برلن میں ایکریڈیٹیڈ نمائندے رہے، نیشنل ہیرالڈ کے یوروپین نمائندے رہے، انٹر پریس سروس کے برلن میں بیورو انچارج رہے جس کا ہیڈ کوارٹر روم (اٹلی) میں تھا اور کئی ہندی اور اردو اخبارات کی نمائندگی کی۔ انھوں نے نظمیں، غزلیں، کہانیاں لکھیں، ڈرامے لکھے اور اسٹیج پر کھیلے اور یہاں کی سماجی و ثقافتی زندگی میں کافی فعال رہے ہیں۔ جرمنی اور یورپ میں کیرم کے فروغ کے لیے پہل کی، جرمن کیرم فیڈریشن کے صدر رہے، یوروپین کیرم کنفیڈریشن قائم کی اور اس کے 17 سال صدر رہے اور اس وقت بھی وہ عالمی کیرم فیڈریشن کے صدر ہیں۔ ساتھ ہی وہ اردو انجمن برلن اور چلڈرین چیریٹیبل سوسائٹی برلن کے صدر ہیں۔

عارف نقوی نے 1964 میں مشرقی برلن کی ایک خاتون سے شادی کی تھی، جن کی والدہ مشرقی برلن میں اور والد مغربی جرمنی میں رہتے تھے اور ان دونوں کے درمیان برلن کی دیوار حائل تھی۔ اس کتاب میں اس پہلو سے بھی ان کے ذاتی تجربات ملتے ہیں۔

پریس ریلیز، عارف نقوی، صدر اردو انجمن برلن، 11 جون 2014

ڈاکٹر خالد علوی کی کتاب 'انگارے' کے انگریزی ایڈیشن کی رسم اجرا

ڈاکٹر خالد علوی کی کتاب انگارے کے انگریزی ایڈیشن کی رسم اجرا یکم جون 2014 کو برلن میں اردو انجمن کی طرف سے اہتمام سے کی گئی۔ اردو انجمن برلن کے صدر عارف نقوی نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ یہ کتاب ترقی پسند ادیبوں کی تحریک کے ابتدائی مرحلے کے مزاج کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک کے تاریخی پس منظر، انگارے کے فنی جائزے اور انگارے کے مصنّفین کے بارے میں ڈاکٹر خالد علوی کی تحقیقی تحریروں نیز معلوماتی دستاویزوں کی فراہمی کے لیے کاوشوں کی خاص طور سے تعریف کی۔ عارف نقوی نے اردو انجمن کی طرف سے ڈاکٹر خالد علوی کی خدمات کو سراہتے ہوئے انھیں اردو انجمن برلن کے اعزاز سے نوازا اور اس بات پر فخر کا اظہار کیا کہ انگارے کے انگریزی ایڈیشن کا اجرا سب سے پہلے برلن میں ہو رہا ہے۔

پریس ریلیز، عارف نقوی، صدر اردو انجمن برلن، 11 جون 2014

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

ایک سالہ اردو ڈپلومہ کورس کا آغاز

بنگلور: بروز اتوار مورخہ 11 مئی 2014 بمقام لائبریری ہال کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام چلائے جانے والے ایک سالہ اردو ڈپلومہ کورس کا افتتاح عمل میں آیا۔ جس میں مرزا عظمت اللہ، رجسٹرار نے ماہرین کورس خواجہ معین الدین صمدانی کے ساتھ امسال داخلہ لیے ہوئے تمام طلبہ وطالبات کا اکادمی، قومی کونسل اور محکمہ اقلیتی بہبود کی جانب سے استقبال کیا اور مبارکباد پیش کی۔ مرزا عظمت اللہ نے اس موقعے پر کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے زیر اہتمام چلنے والے ایک سالہ ڈپلومہ کورس، اردو سے نابلد حضرات کو اردو سکھانے میں مددگار ثابت ہوا ہے اور ہندوستان بھر میں اس کی شاخیں موجود ہیں۔ جناب معین الدین صمدانی نے اپنے تعلیمی، تدریسی تجربات طلبہ کے سامنے پیش کرکے کہا کہ دنیا کے تمام زبانوں میں سب سے دلکش، خوبصورت اور چاشنی سے بھرپور زبان اردو ہے، جو کوئی بھی اس سے وابستہ ہے، وہ ہر طرح سے فیضیاب ہوا ہے۔ آخر میں رجسٹرار صاحب نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس جلسے میں المنصور گرافکس و ماہنامہ تسخیر انسانیت کے مالک منصور علی خان اور رام نگرم سے مسلم گریجویٹس فورم کی نمائندگی کرتے ہوئے سید متین الدین اور دیگر ارکان بھی موجود تھے۔ پریس ریلیز کرناٹک اردو اکادمی، 16 مئی 2014

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

پنجاب میں افسانوی ادب پر سیمینار

مالیرکوٹلہ: شمالی ہند کی واحد افسانوی انجمن افسانہ کلب رجسٹرڈ مالیرکوٹلہ (پنجاب) نے 16-15 مارچ 2014 کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے دو روزہ سیمینار بعنوان 'مشرقی پنجاب کی افسانوی خدمات (تقسیم سے پہلے، تقسیم کے بعد)' کا انعقاد کیا جس میں اورنگ آباد سے تشریف لائے سینئر افسانہ نگار جناب نورالحسنین، جلگاؤں کے معین الدین عثمانی، بمبئی کے اشتیاق سعید، میرٹھ کے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، جموں کے مشتاق احمد وانی، پٹیالہ کے اشرف محمود نندن کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔ اس موقعے پر بشیر مالیرکوٹلوی کی ٹیلی ڈراموں کی کتاب عکس درعکس کا اجرا کیا گیا۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ افسانہ کلب شمالی ہند کا ہی نہیں بلکہ ہندوستان کا

ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے مندوبین نے حصہ لیا۔ پہلے اجلاس کی صدارت امجد علی چیئرمین سہراب گروپ آف کمپنیز نے کی۔ بحیثیت مہمان خصوصی پروفیسر ارتضیٰ کریم اور پاکستان سے تشریف لائے پرنسپل عباس مرزا، پرنسپل ارشاد علی خاں مہمانانِ ذی وقار تھے۔ اس افتتاحی اجلاس کی نظامت افسانہ کلب کے جنرل سکریٹری محمد ناصر آزاد نے کی۔ کلب کے صدر بشیر مالیرکوٹلوی نے دہلی سے تشریف لائے ڈاکٹر ارتضیٰ کریم اور ڈاکٹر پرویز شہریار، واحد ادارہ ہے جو صرف اردو افسانے کے فروغ کے لیے کام کر رہا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو افسانے کی تاریخ کسی بھی طرح پنجاب کے بغیر ترتیب نہیں دی جاسکتی۔ 15 مارچ 2014 کی شام افسانہ کلب نے 'شام افسانہ' کا اہتمام کیا جس کی صدارت امجد علی نے کی، مہمان خصوصی جناب محمد اشرف پروپرائٹر محمود اینڈ سنز تھے اور مہمان ذی وقار ڈاکٹر ارتضیٰ کریم اور پریم گوئل تھے۔ نظامت کے فرائض معروف افسانہ نگار بشیر مالیرکوٹلوی نے انجام دیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر روبینہ شبنم ہیڈ نواب شیر محمد خاں انسٹی ٹیوٹ مالیرکوٹلہ اور دہلی سے آئے پرویز شہریار نے کی۔ اس اجلاس کی نظامت کلب کے سکریٹری ناصر آزاد نے کی۔ اس اجلاس میں کئی مقالے پیش کیے گئے۔ اجلاس کے آخر میں مندوبین اور مقالہ نگاروں کو یادگاری ٹرافیاں پیش کی گئیں۔ معین الدین عثمانی، ڈاکٹر روبینہ شبنم اور ڈی ڈی بھٹی نے بھی اپنے خیالات سے نوازا۔ اختتام پر کلب کے صدر جناب محمد بشیر مالیرکوٹلوی نے مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ کلب کے اراکین کا یہ دیرینہ خواب تھا کہ افسانہ کلب افسانے پر کوئی سیمینار منعقد کرے۔

پریس ریلیز، بشیر مالیرکوٹلوی، پنجاب، 20 مارچ 2014

'موجودہ دور میں اردو زبان کا فروغ'

علی گڑھ: جامعہ اردو علی گڑھ کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے 'موجودہ دور میں اردو زبان کا فروغ' کے موضوع پر منعقدہ قومی سیمینار اور جامعہ اردو علی گڑھ کے مراکز کے مہتمم حضرات کے لیے منعقدہ تین روزہ قومی ورکشاپ کے مہمانِ خصوصی ممتاز سائنس داں پروفیسر ہمایوں مراد نے کہا ہے کہ گلوبلائزیشن کے اس دور میں ہر زبان کی اپنی ایک منفرد اہمیت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان نہ صرف برصغیر ہند کی ایک ممتاز زبان ہے بلکہ یہ پیدا بھی یہیں ہوئی ہے اور بدلتے دور کے ساتھ اس کے فروغ کے پیمانے کو بھی بدلنا ہوگا۔ پروفیسر مراد نے کہا کہ ہر دور کی اپنی سیاسی اور سماجی ضروریات ہوتی ہیں اور فی الوقت ہندوستان میں برق رفتاری کے ساتھ سیاسی تبدیلیاں وجود میں آئی ہیں لہٰذا ہمیں اردو کے فروغ کے لیے اپنی فکر اور عملی پیمانے کو تبدیل کرنا ہوگا۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے ڈائرکٹر جسیم محمد نے کہا کہ نہ صرف ہندوستان کی آزادی میں اردو زبان نے اہم رول ادا کیا بلکہ ملک میں آرٹ اور ثقافت سے لے کر ادب تک میں اردو ایک اہم مقام کی حامل ہے۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے او ایس ڈی فرحت علی خاں نے کہا کہ موجودہ دور کمپیوٹر اور نیٹ کا دور ہے اور اردو زبان کے فروغ کے لیے لازم ہے کہ اس زبان کو مکمل طور پر کمپیوٹر کے ساتھ جوڑا جائے۔ مصائب قدوائی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 مئی 2014

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

فخر الدین علی احمد میموریل لیکچر

نئی دھلی: سابق صدر جمہوریہ ہند فخر الدین علی احمد کے یوم ولادت کی مناسبت سے غالب انسٹی ٹیوٹ میں 'ہندوستان کی قومی تحریک کی تاریخ پر مختلف نظریات' کے موضوع پر منعقدہ تاریخی 'فخر الدین علی احمد میموریل لکچر' کے دوران معروف مورخ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ایمریٹس عرفان حبیب نے قومی تحریک کی خدمات اور اس کی اہمیت کو ناقابل فراموش بتاتے ہوئے کہا کہ قومی تحریک کو کئی زاویوں سے دیکھنے اور بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ آج جب قومی تحریک کے خد و خال کو مسخ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس تحریک کو یاد کرنے کی بے حد ضرورت ہے، تا کہ عصر حاضر میں ان اصولوں کو منطبق کر سکیں جن کو مجاہدین آزادی نے اپنا نصب العین بنایا تھا۔ انھوں نے قومی تحریک کے تاریخی پس منظر اور اس کے منصۂ شہود پر آنے کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کی ابتدا کے بعد قومی تحریک کے مخالفین میں کیا تصور تھا اور اب قومی تحریک کا کیا نظریہ ہونا چاہیے اس پر خاطر خواہ روشنی ڈالی جانی چاہیے۔ قبل ازیں غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے فخر الدین علی احمد میموریل لکچر کی اہمیت اور اس کے تاریخی تسلسل پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر عرفان حبیب کے بارے میں بتایا کہ یہ اپنے عہد کی تاریخ کو بہت خلوص کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں اور تقریریں اتنی اہم ہیں کہ ان سے ہندوستان اور دیگر ممالک کے اسکالرز استفادہ کرتے ہیں۔ صدارتی تقریر میں ڈاکٹر پرویز علی احمد، وائس چیئرمین، غالب انسٹی ٹیوٹ نے کہا کہ پروفیسر عرفان حبیب کے اس لکچر سے موجودہ صورتِ حال اور قومی تحریک کو سمجھنے میں ضرور مدد ملے گی۔ نظامت کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے کہا کہ ملک کے اہم دانشوروں اور مورخوں نے اس لکچرز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، پروفیسر عرفان حبیب کی موجودگی نے اس لکچر کے وقار میں اضافہ کیا ہے۔

دائیں سے: ڈاکٹر رضا حیدر، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر عرفان حبیب، ڈاکٹر پرویز علی احمد، جسٹس بدر دُرریز احمد

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 25 مئی 2014

مخطوطات کے تحفظ پر ورکشاپ

رام پور: رضا لائبریری رامپور کے کانفرنس ہال خیابان رضا میں قومی مشن برائے مخطوطات وزارت ثقافت، حکومت ہند کے زیر اہتمام 5 روزہ ورکشاپ بعنوان 'مخطوطات کا تحفظ اور دیکھ ریکھ' کا انعقاد ہوا۔ افتتاحی تقریب کی صدارت پروفیسر آئی کے بھٹنا گر سابق صدر شعبہ نیشنل میوزیم انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے کی جب کہ نظامت کے فرائض ورکشاپ کے کوآرڈی نیٹر سید طارق اظہر نے انجام دیے۔ تقریب میں ڈاکٹر عبدالرحیم شعبۂ میوزیولوجی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ تقریب کو خطاب کرتے ہوئے پروفیسر آئی کے بھٹنا گر نے کہا کہ ابتدائی تحفظ کے طریقہ کار کو سیکھ کر علمی ذوق رکھنے والے افراد اپنے مخطوطات کو محفوظ رکھ سکتے

دہلی کی ایک شام مخدوم قلی فرغانی کے نام

نئی دھلی: ہندوستان کا ترکمانستان سے بڑا گہرا رشتہ رہا ہے جو اب بھی قائم ہے۔ آئی سی سی آر دونوں ملکوں کے درمیان ایک پل کا کام کر رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم ہندوستان میں رہتے ہوئے بھی ترکمانستان کے عظیم صوفی، شاعر اور فلسفی کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ کمشنر برائے لسانی اقلیات پروفیسر اختر الواسع نے اپنی صدارتی تقریر میں ترکمانستان سفارت خانہ کی طرف سے ایک پروگرام بعنوان بین الاقوامی سائنٹفک کانفرنس و ثقافتی تقریب میں ترکمانستان کے عظیم صوفی، شاعر اور فلسفی مخدوم قلی فراغی کی 290 ویں تقریب کے موقعے پر انڈیا ہیبی ٹیٹ سینٹر لودھی روڈ

دائیں سے: پروفیسر اقتدار محمد خان، پروفیسر منوتل، پروفیسر نسیم احمد شاہ، ستیش شاہ، پروفیسر انا گوربان اشیروف،
پروفیسر اختر الواسع اور مسز مرل انا یونا ڈیگا نووا

نئی دہلی میں مذکورہ خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کی نظامت شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ایم اے کی طالبہ ثمرین فاطمہ نے انجام دی۔ دو نشستوں میں منعقد اس تقریب میں سیاسی، سماجی اور بین الاقوامی ثقافتی میدان کی منتخب شخصیات، ترکمانستان کی معزز شخصیات پر مشتمل وفد، سفارت خانہ کے اعلیٰ عہدیداران، شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ پروفیسر اختر الواسع نے مزید کہا کہ پروفیسر نسیم احمد شاہ خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے مخدوم قلی کے منتخب اشعار کو اردو زبان میں ترجمہ کر کے ان کے فکر کی آفاقیت اور ترکمانستان کی تہذیب و ثقافت سے ہمیں متعارف کرایا۔ پروفیسر نسیم احمد شاہ نے کہا کہ مجھے فخر ہے کہ میں نے مخدوم قلی فراغی جیسے عظیم الشان شخصیت کے اشعار کو اردو زبان میں ترجمہ کر کے اردو داں حلقے کو مخدوم کے افکار و نظریات سے متعارف کرایا۔ آئی سی سی آر کے ڈائریکٹر ستیش شاہ نے پروگرام کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کیا۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 28 مئی 2014

ہیں۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر عبدالرحیم نے ورکشاپ کے عنوان اور اس کی اہمیت کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ مخطوطات کی دیکھ بھال انتہائی احتیاط کے ساتھ کرنا چاہیے کیونکہ بیشتر اوقات یہ نازک اور خستہ حال ہوتے ہیں۔ روشنی موسم اور فیزیکلی، کیمیکلی اسباب بانس کی پتیوں پر لکھے مخطوطات اور ہاتھ سے بنے کاغذ پر لکھے مخطوطات پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں مختلف مدارس مندروں، مٹھوں، گردواروں اور گرجا گھروں میں مخطوطات کا بڑا خزانہ ہے۔ قومی مشن برائے مخطوطات کی ملک بھر میں موجود ان مخطوطات کے خزانوں کے تحفظ میں اہم خدمات ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 مئی 2014

دھلی:

حق تعلیم ایکٹ کا نفاذ اقلیتی اداروں پر نہیں

نئی دھلی: سپریم کورٹ نے اپنے ایک فیصلے میں حق تعلیم ایکٹ (آرٹی ای) کو آئینی قرار دیا۔ اس قانون کے تحت سبھی اسکولوں میں معاشی طور سے کمزور طبقات

کے لیے 25 فیصد سیٹیں ریزرو کرنے کا نظم ہے۔ چیف جسٹس آر ایم لوڑھا کی صدارت والی پانچ رکنی آئینی بینچ نے اس قانون کو آئینی قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ قانون امداد یافتہ یا غیر امداد یافتہ اقلیتی اداروں پر نافذ نہیں ہوگا۔ آئینی بنچ نے کہا کہ آرٹیکل 21 (ک) آئین کے بنیادی ڈھانچے کو متاثر نہیں کرتا۔ حق تعلیم ایکٹ سے جڑا یہ معاملہ 23 اگست 2013 کو ججوں کی تین رکنی بنچ نے پانچ رکنی آئینی بنچ کو سونپا تھا کیونکہ اس میں غیر امداد یافتہ نجی تعلیمی اداروں کے اختیارات سے متعلق اہم آئینی مسئلہ اٹھایا گیا تھا۔ واضح رہے کہ 350 سے زائد نجی غیر امداد یافتہ اسکولوں کی تنظیم فیڈریشن آف پبلک اسکولس کی دلیل تھی کہ یہ قانون حکومت کی مداخلت کے بغیر ہی ان کے اسکول چلانے کے اختیار کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ سپریم کورٹ نے اپنے دیگر ایک اہم فیصلے میں رولنگ دی ہے کہ حکومت پرائمری تعلیم دینے کے لیے لسانی اقلیتوں کے لیے علاقائی زبان لازمی نہیں کرسکتی۔ چیف جسٹس آر ایم لوڑھا کی صدارت والی پانچ رکنی آئینی بنچ نے کہا کہ حکومت کو لسانی اقلیتوں کو پرائمری تعلیم دینے کے لیے لازمی طور سے علاقائی زبان نافذ کرنے کے لیے مجبور کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ بنچ کے سامنے یہ مسئلہ کرناٹک حکومت کے 1994 کے دو احکام کے سبب پہنچا تھا جن میں درجہ 1 سے 4 تک مادری زبان یا علاقائی زبان میں تعلیم دینا لازمی کیا گیا تھا۔ حکومت کے اس احکام کو چیلنج کیا گیا تھا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 مئی 2014

آندھرا پردیش:

اردو یونیورسٹی میں حقیقت پسندی بنام مثالیت پسندی کے موضوع پر لیکچر

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں یو جی سی کی مدودہ اسکیم کے تحت منعقدہ لکچر میں اردو کے ممتاز فکشن نگار اور ناقد پروفیسر بیگ احساس نے 'ادب میں حقیقت پسندی اور مثالیت پسندی، گئودان کے خصوصی حوالے سے' موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ تقریباً 80 سال گزر جانے کے بعد بھی یہ ناول انفرادی اور اجتماعی دیہی زندگی کی فلسفیانہ عکاسی کے اعتبار سے معرکۃ الآراتخلیق ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ پریم چند کا ناول گئودان حقیقت نگاری کے پس منظر میں مثالیت پسندی کا شاہکار ناول ہے اور اردو ناول میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لکچر کے بعد سوال و جواب کے سیشن میں موضوع کے تعلق سے دیر تک تبادلۂ خیال ہوا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 13 مئی 2014

اترپردیش:

پاکستانی ناول نگار نوشابہ صدیقی کا استقبال

علی گڑھ: پاکستان کی معروف ناول نگار پروفیسر نوشابہ صدیقی کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آمد پر ایک استقبالیہ تقریب

کا انعقاد کیا گیا جس کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اپنے ماضی سے رشتہ قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے حال کو سمجھا جائے انھوں نے اپنے والد حسن عبداللہ حسن کا شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی سے تعلق بیان کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے یونیورسٹی کی مختلف تقاریب کے موقعے پر نظمیں لکھیں جو کہ تاریخ وار مرتب کی گئی ہیں اس طرح یہ کتاب تاریخ کا ماخذ قرار دی جاسکتی ہے اور اپنی کتاب 'افکار حسن' کا مضمون زیر لب بھی پیش کیا۔ شعبۂ اردو کے استاد ماہنامہ تہذیب الاخلاق کے مدیر پروفیسر صغیر افراہیم نے پروفیسر نوشابہ صدیقی کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کے دو ناول 'صلیب کے زخم 1973'، زندگی بھر کی بات، 2010' شائع ہوکر مقبول عام ہوچکے ہیں۔

صدر شعبۂ اردو پروفیسر عقیل احمد صدیقی نے اظہار تشکر پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر نوشابہ صدیقی کی جو تحریر سنی گئی اس سے ان کے ناول نگاری کے فن پر گرفت کا اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے خودکلامی کے انداز میں اپنے تخیل کا ایسا استعمال کیا ہے کہ یہاں ایک طلسم طاری ہوگیا ہے۔

وزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 مئی 2014

رشید جہاں کی حیات پر مبنی تصاویر کی نمائش

علی گڑھ: سرسید اکادمی کے اشتراک سے معین الدین احمد آرٹ گیلری میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ضمیر الدین شاہ نے ممتاز ادیبہ اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی بانی رکن رشید جہاں کی حیات پر مبنی تصاویر کی نمائش کا افتتاح کیا۔ یہ نمائش اندرا گاندھی نیشنل آرٹ سینٹر نئی دہلی کے تعاون سے منعقد کی گئی تھی۔ ڈاکٹر رخشندہ جلیل نے اس نمائش کا انعقاد کیا تھا۔ معین الدین احمد آرٹ گیلری کی کوآرڈینیٹر ڈاکٹر بدر جہاں نے حاضرین کا خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر رشید جہاں ویمنس کالج کے بانی پاپا میاں شیخ عبداللہ کی دوسری دختر تھیں جو 25 اگست 1905 کو علی گڑھ میں پیدا ہوئیں اور 'انگارے' میں شائع اپنے افسانے کے سبب کافی شہرت کی حامل رہیں۔ اس پروگرام کی صدارت وائس چانسلر جنرل ضمیر الدین شاہ نے کی۔ پرووائس چانسلر بریگیڈیر سید احمد علی پروگرام کے اعزازی مہمان تھے۔ ڈاکٹر رخشندہ جلیل نے اپنے خطبے میں رشید جہاں کی قلمی کاوشوں کی روشنی میں ان کے انقلابی خیالات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ معاشرے میں خواتین کی موجودہ صورت حال کے تناظر میں ضروری ہے کہ رشید جہاں کی تحریروں پر نئے سرے سے کام کیا جائے۔ وائس چانسلر جنرل شاہ نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ رشید جہاں انقلابی نظریات کی حامل تھیں اور وہ اپنے زمانے سے آگے بڑھ کر سوچتی تھیں۔ پروفیسر طارق احمد نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور ڈاکٹر سید حسین حیدر نے

نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ ’سیاسی تقدیر‘ دہلی، 20 مئی 2014

تعلیمی بیداری پروگرام کا انعقاد

دیوبند: مسلم فنڈ ٹرسٹ دیوبند کی جانب سے فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت کم خرچ اور معیاری تعلیم فراہم کرانے کی غرض سے شیخ الہند ہال میں تعلیمی بیداری پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی محترمہ ڈاکٹر آشا شرما ریجنل ڈائرکٹر اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی دہرہ دون نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ دیوبند عالمی شہرت یافتہ قصبہ ہے۔ یہ نہ صرف تعلیم بلکہ روحانیت کا بھی مرکز ہے۔ دنیا میں سب سے بہترین تعلیم دین کی تعلیم ہے اگر اس کو عالمی سطح تک متعارف کرانا ہے تو آپ کو علوم و زبانوں سے بھی واقفیت حاصل کرنی ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ یہاں پر مقیم طلبہ کے لیے اگنو مختلف کورسز تعلیم کے ساتھ کرارہا ہے۔ انگریزی اقتصادی زبان ہے جبکہ اردو، عربی، فارسی اور سنسکرت روحانی زبانیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگنو کے مختلف کورسز اور ان سے حاصل ہونے والی ڈگریاں وسارٹیفکیٹ عالمی سطح پر منظور شدہ ہیں اس لیے وہ افراد جو وقت اور خرچ کی قلت کی وجہ سے پابندی کے ساتھ تعلیم حاصل نہیں کرسکتے وہ اپنی تعلیمی تسکین اگنو کے ذریعے مکمل کرسکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگنو کے ذریعے اس وقت بڑی تعداد میں پروفیشنل کورسز چلائے جارہے ہیں یہ یونیورسٹی پارلیمنٹ سے منظور شدہ ہے اس وقت ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر اس کی ڈیمانڈ ہے۔ ان کے علاوہ پروگرام کے مہمان ذی وقار ڈاکٹر این آر راجیند رپرساد اے آر ڈی اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی دہرہ دون، دارالعلوم وقف کے استاد مولانا نسیم اختر بھی شامل ہوئے۔ پروگرام کی صدارت حسیب صدیقی نے کی اور نظامت کے فرائض مشہور کالم نگار اور ادیب سید وجاہت شاہ نے انجام دیے۔

روزنامہ ’سیاسی تقدیر‘ دہلی، 14 مئی 2014

’خبرنامہ‘ اور ’عالمی اردو نامہ‘ کے تحت ملک کے مختلف اردو اخبارات میں اردو کے تعلق سے شائع ہونے والی خبروں کا ڈائجسٹ ہر ماہ اس لیے پیش کیا جاتا ہے تاکہ پورے ملک میں اردو سرگرمیوں کی مجموعی صورتِ حال سامنے آسکے۔ خبروں میں دیے گئے تمام حقائق اور تبصروں کے لیے متعلقہ اخبارات ذمے دار ہیں۔

(ادارہ)

زرینہ بیگم: اودھ کی آخری شاہی گلوکارہ

نئی دھلی: زرینہ بیگم (87) اودھ دربار کی واحد زندہ درباری گلوکارہ ہیں۔ 1950 اور 1960 کے دور کی سب سے زیادہ مقبول گلوکارہ آج ایک گمنام زندگی جی رہی ہیں۔ زرینہ بیگم ایک ایسی زندہ گلوکارہ ہیں جو لکھنؤ کے شاہی گھرانوں میں گائی جانے والی ٹھمری گاسکتی ہیں لیکن آج بدحالی میں جی رہی ہیں۔ زرینہ بیگم حال ہی میں اس شہر میں موجود تھیں۔ اس دوران انھوں نے غزل کی دنیا کی بے تاج ملکہ بیگم اختر کو یاد کرنے کے ساتھ اپنی زندگی کے شیریں اور تلخ تجربوں کو شیئر کیا۔ زرینہ نے لڑکھڑاتی زبان میں بتایا کہ ’’میرے پاس جو بھی جائیداد اور پیسہ تھا سب میرے بھائی نے مجھ سے چھین لیا۔ میں نے ایک بہت ہی مشکل زندگی گزاری ہے۔‘‘ نانپاڑہ، بہرائچ میں پیدا ہونے والی زرینہ بیگم نے 11 سال کی عمر میں غلام حضرت کی قیادت میں موسیقی کی تربیت لینی شروع کی۔ کچھ برسوں بعد اختری بائی فیض آبادی کے نام سے بھی شناخت حاصل کرنے والی بیگم اختر نے انھیں گاتے ہوئے سنا اور اس کے بعد جلد ہی انھیں اپنی نگرانی میں لے لیا تھا۔

روزنامہ ’راشٹریہ سہارا‘ دہلی، 29 مئی 2014

الٰہ آباد میں انجمن ترقی اردو کی شاخ کا افتتاح

الٰہ آباد: 3 جون 2014 کو انجمن ترقی اردو (ہند) کی الٰہ آباد شاخ کا باضابطہ قیام عمل میں آیا۔ انجمن ترقی اردو

(ہند) کی الٰہ آباد شاخ کا افتتاح سابق ایڈوکیٹ جنرل ایس ایم اے کاظمی نے اپنی لوکر گنج میں واقع رہائش گاہ میں کیا۔ افتتاحی تقریب میں خصوصی طور سے مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے شرکت کی۔ اس موقعے پر ایک جلسے کا انعقاد بھی کیا گیا جس کی صدارت بزرگ ترقی پسند ناقد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے کی اور نظامت کے فرائض انجمن کی الٰہ آباد شاخ کے سکریٹری جاوید نظر نے انجام دیے۔ اس موقعے پر اردو کے بہی خواہ، انگریزی شاعر اور جید عالم نیز منشی پریم چند کے پوتے آلوک رائے بھی بطور خاص موجود تھے۔ انجمن ترقی اردو الٰہ آباد شاخ کے صدر پروفیسر علی احمد فاطمی نے مہمانِ خصوصی کا استقبال کرتے ہوئے ان کی علمی و ادبی خدمات کا تعارف پیش کیا اور کہا کہ ڈاکٹر اطہر فاروقی نے انجمن کی شاخوں کو فعال کرنے، نئی شاخیں قائم کرنے نیز اردو تعلیم کے ذریعے اردو کے احیا کی جو تحریک شروع کی ہے وہ نہایت مبارک ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اطہر فاروقی نے الہ آباد میں انجمن کی شاخ قائم کیے جانے پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ تاریخی موقع ہے کہ اس اہم شہر میں جہاں اب بھی اردو عمائدین کی بڑی تعداد موجود ہے نیز عوام الناس میں اردو سے دل چسپی عام ہے، انجمن کی شاخ کا قیام عمل میں آیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کیسا حسین اتفاق ہے کہ جب انجمن ترقی پسند مصنّفین کی داغ بیل الٰہ آباد میں پڑی تھی تو اس وقت ہمارے سب سے بڑے کہانی کار منشی پریم چند موجود تھے اور آج انجمن ترقی اردو (ہند) کی الٰہ آباد شاخ کے افتتاح کے موقعے پر ان کے پوتے آلوک رائے ہمارے درمیان تشریف فرما ہیں۔ اردو تعلیم کے موضوع پر انھوں نے کہا کہ پہلی اور لازمی زبان کے طور پر اسکولوں میں اردو کا مطالعہ اردو مادری زبان والے بچوں کا آئینی حق ہے۔ پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے الٰہ آباد میں انجمن کی شاخ کے قیام کو ایک خوش آئند واقعہ قرار دیا۔ ڈاکٹر علی حیدر رضوی نے شکریہ کی رسم ادا کی۔

روزنامہ ’راشٹریہ سہارا‘ دہلی، 4 جون 2014

شبلی نعمانی کی ماضی شناسی

اعظم گڑھ: دانشوروں کے نزدیک علامہ شبلی نعمانیؒ کی حیثیت عظیم مصنف، بہترین نقاد اور اچھے شاعر کی تھی لیکن میرے نزدیک ان کی ماضی شناسی ان کی الگ خوبی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ عظیم

مقصد کے تحت صرف کیا۔ مذکورہ باتیں شبلی کالج کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر شباب الدین نے شعبۂ اردو میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے یوم پیدائش منعقد ایک مذاکرے کے دوران کہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج پوری دنیا میں شبلی شناسی پر

کام ہورہا ہے، ہر روز نئی نئی باتیں سامنے آرہی ہیں لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہمیں علامہ کی تاریخ پیدائش کا تعین کرنے میں 90 سال کا عرصہ گزر گیا۔ شعبۂ تاریخ کے استاذ پروفیسر ڈاکٹر علاؤ الدین نے کہا کہ علامہ شبلی نعمانیؒ ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار اور قومی یکجہتی کے اعلیٰ رہنما تھے۔ دارالمصنفین کے رفیق مولانا کلیم صفات اصلاحی نے کہا کہ علامہ شبلیؒ کی یوم پیدائش 3 جون 1857 متعین کی گئی ہے، اسی لیے اس مذاکرے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ پروگرام کی صدارت صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر شباب الدین اور نظامت ابورافع نے کی۔ اس موقعے پر محمد ناظم، محمد ثاقب، وصی الرحمٰن اور احمد کلیم وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 جون 2014

سنبھل میں ادبی جلسہ

سنبھل: سرائے ترین کے محلہ منگل پورہ واقع فیض گرلس انٹر کالج میں ایک ادبی پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں اہم شخصیات نے شرکت کی۔ اس موقعے پر عبدالغفور سلامی نے کہا کہ وہ اردو زبان جسے منشی پریم چند، چکبست، دیاشنکر نسیم، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر وغیرہ نے اپنے جگر کا خون دے کر اس کی آبیاری کی اس کو تراش تراش کے ایسا حسین مجسمہ بنا دیا جس کو دیکھ کر ہر کوئی حیران رہ گیا اور اس کا گرویدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکا، وہی اردو زبان آج سوتیلے پن کا شکار ہے۔ انھوں نے کہا ہمیں اپنے نونہالوں کو اردو زبان کی تعلیم خصوصی طور پر دلانی چاہیے جس سے وہ اس زبان کی شیرینی و لطافت اور کشش سے پوری طرح واقف ہو جائیں۔ شفیق الرحمٰن برکاتی نے کہا کہ اردو زبان کو مسلمانوں سے منسوب کر کے تمام ہندو شعرا اور ادبا کی توہین کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ دراصل جو لوگ اردو کو مسلمانوں سے منسوب کرتے ہیں وہ تنگ ذہن ہیں، اگر انھیں اردو کی تعلیم دے دی جائے تو یہ بھی اردو کے ہمدرد نظر آئیں گے۔ انھیں معلوم نہیں کہ اردو ایسی زبان ہے جس کے بغیر ہندوستان کی تاریخ نامکمل رہ جائے گی۔ ہندوستان میں مغلوں کے دیے ہوئے چند بے نظیر تحفوں میں اردو زبان، تاج محل اور مرزا غالب شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 مئی 2014

لکھنؤ میں طلعت عزیز کا جشن غزل

لکھنؤ: غزل گائیکی کے حوالے سے جو نام ہمارے ذہن میں آتے ہیں ان میں سب سے خوبصورت شخصیت کے مالک طلعت عزیز کا نام ابھرتا ہے۔ طلعت عزیز غزل کے ایک ایسے فنکار ہیں جنھوں نے عوامی پروگرام کے ساتھ فلم اور ٹی وی کے ذریعے بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ غزل گائیکی میں تبدیلی کے بارے میں پوچھے جانے پر انھوں نے کہا کہ غزل ایک مزاج ہے، غزل کے مزاج کو سمجھے بغیر غزل کو نہیں گایا جا سکتا۔ سب سے پہلے اس کے لیے رومانی ہونا پڑے گا کیونکہ غزل کے معنی ہوتے ہیں محبوب سے گفتگو کرنا اور رومانس کا مطلب ہے عشق۔

عشق حقیقی یا عشق مجازی، عشق کسی سے بھی ہو سکتا ہے عشق کا مطلب نرم احساس کا حساس دل۔ طلعت عزیز آنندی کنسپٹ کے جشن غزل کے موقعے پر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لکھنؤ آئے تھے۔ پروگرام میں طلعت عزیز کے سننے والے ہزاروں سامعین ان کی آمد پر پلکیں بچھائے بیٹھے تھے۔ پروگرام کا آغاز اس خوبصورت غزل سے ہوا: بیتے لمحوں میں کھو گیا ہوگا* اس نے جب میرا خط پڑھا ہوگا۔ نظامت خلیل خاں نے اپنے منفرد انداز میں کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' لکھنؤ، 1 جون 2014

اتراکھنڈ:

دہرادون میں خواجہ احمد عباس تقریب

دہرادون میں خواجہ احمد عباس صدی تقریب میں اتراکھنڈ کے گورنر ڈاکٹر عزیز قریشی خطاب کرتے ہوئے، جبکہ اسٹیج پر اتل تیواری، ممبر پارلیمنٹ ڈی پی ترپاٹھی، ڈاکٹر سیدہ حمید اور آلوک بی لال کو دیکھا جا سکتا ہے

دہرادون: اتراکھنڈ کے گورنر ڈاکٹر عزیز قریشی نے راج بھون میں منعقدہ دو روزہ 'خواجہ احمد عباس صدی تقریب' کا افتتاح کیا۔ 'خواجہ احمد عباس صدی کمیٹی' کے ذریعے منعقدہ اس تقریب کے افتتاحی اجلاس کو مہمان خصوصی کے طور پر خطاب کرتے ہوئے گورنر نے کہا کہ خواجہ احمد عباس جیسے آئیڈیل اور اصول پسند شخص اب سماج میں دکھائی نہیں دیتے کیونکہ اب لوگ مادیت پرست ہوتے جارہے ہیں، جو مال و دولت کے بل پر سماج کی سوچ کو بدلنا چاہتے ہیں۔ گورنر نے کہا کہ اگر آج خواجہ احمد عباس ہمارے درمیان ہوتے تو وہ موجودہ سیاسی و سماجی نظام پر ضرور سوال اٹھاتے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ خواجہ احمد عباس نے آزادی کی لڑائی کے دوران بھی اپنے قلم کی دھار تیز رکھی تھی، اس وقت جب کہ وہ مشکل دور تھا۔ اپنے خطاب میں ڈاکٹر سیدہ حمید نے کہا کہ خواجہ احمد عباس کو پہاڑی علاقوں سے بہت زیادہ پیار تھا، خاص طور پر اتراکھنڈ کے مسوری علاقے سے۔ اس کی دلیل ان کی 'مسوری 1954' نامی کہانی ہے۔ انھوں نے کہا کہ نوجوانوں کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ خواجہ احمد عباس کی زندگی اور ان کی تخلیقات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں۔ ممبر پارلیمنٹ ڈی پی ترپاٹھی نے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ ان کی شخصیت میں انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ دنیا میں ان جیسے لوگ کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ تقریب میں تھیٹر اور فلم اداکار اتل تیواری اور آلوک بی لال نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ دیگر شرکا نے بھی اس موقعے پر اپنے خیالات پیش کیے۔

خواجہ احمد عباس صدی کمیٹی کے زیر اہتمام راج بھون میں منعقدہ دو روزہ اور اختتامی 'خواجہ احمد عباس صدی تقریب' میں ملک کے معروف اور ممتاز دانشوروں نے خواجہ احمد عباس کو دور اندیش اور اپنے وقت کی برائیوں کے خلاف سب سے بڑا مجاہد اور مرد آہن بتایا۔ اتراکھنڈ کے گورنر ڈاکٹر عزیز قریشی کی پہل پر ملک بھر میں خواجہ احمد عباس صدی تقریب منائی جا رہی ہے، جس کا مقصد لوگوں کو اس بات سے روشناس کرانا ہے کہ خواجہ احمد عباس نے ایک فنکار، ادیب اور صحافی کے طور پر عام لوگوں کی زندگی کو بہتر بنانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ راج بھون میں

منعقدہ تقریب کے دوسرے دن کے پہلے سیشن میں 'نئی زمین-اور نئے لوگ' عنوان کے تحت خواجہ احمد عباس کے ادب، نظریہ اور صحافت پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ پہلے سیشن میں دہلی یونیورسٹی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر اور پروگریسیو رائٹرس ایسوسی ایشن کے قومی جنرل سکریٹری علی جاوید نے کہا کہ آج کے حالات میں ہر شخص وہ ترقی پسند ہے جو انسان کو انسان کی طرح دیکھے، اسے ذات، مذہب اور نسل میں تقسیم نہ کرے۔ ہندسنیما کے رائٹر اور اداکار اتل تیواری نے عباس کی تین فلموں 'ڈاکٹر کوٹنیس کی امر کہانی'، 'نیچا نگر' اور 'دھرتی کے لال' کو ہندوستانی فلم کی تاریخ میں رجحان ساز قرار دیا۔ انھوں نے خواجہ احمد عباس کو ایک عظیم دوراندیش قرار دیا۔ پروفیسر بی لال نے کہا کہ خواجہ احمد عباس نے اپنی تحریروں میں خوبصورتی اور حقیقت کا گہرا توازن پیش کیا۔ سیشن کی کنوینز اور منصوبہ بندی کمیشن کی رکن ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید نے کہا کہ خواجہ احمد عباس نے موجودہ دنیا کو مزید بہتر بنانے کے لیے زندگی بھر جدوجہد کی، ان کا موازنہ شاید ہی کسی دوسرے شخص سے کیا جاسکتا ہے۔ اس موقعے پر کماؤں یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ایس سی دھامی، پبلک سروس کمیشن کی رکن ڈاکٹر چھایا شکلا، مقامی کنوینز آلوک بی لال سمیت کئی دوسری شخصیات بھی موجود تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 و 12 مئی 2014

بہار:

نسیم اختر کی کتاب 'تلاش و تصنیف' پر مذاکرہ

پٹنہ: ڈاکٹر نسیم اختر کی کتاب 'تلاش و تصنیف' اپنے مضامین، تحقیقی پیش کش، لب و لہجے اور زبان و بیان کے اعتبار سے چونکانے والی کتاب ہے۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحقیق کے میدان میں جس انداز سے کام کرنے کی ضرورت ہے، نسیم اختر اس پر کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار اردو کونسل ہند کے زیراہتمام معروف و مشہور شاعر بدیع الزماں سحر کے دولت کدہ کی شعری و ادبی نشست گاہ میں منعقدہ ایک محفلِ مذاکرہ میں پروفیسر علیم اللہ حالی نے اپنی صدارتی تقریر میں کیا۔ انھوں نے محفل مذاکرہ کے انعقاد پر اردو کونسل کی تحسین کی۔ مہمانِ اعزازی کی حیثیت سے شریک پروفیسر جاوید حیات نے ڈاکٹر نسیم اختر کی کتاب کا تفصیلی و تجزیاتی جائزہ پیش کیا۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے کتاب پر بڑا خوبصورت اور جامع تبصرہ پیش کیا اور کہا کہ سید محمد یوسف کی قلمی بیاض کی ترتیب نسیم اختر کی اہم پیش کش ہے اور جمیل مظہری کے غیر مطبوعہ خطوط پر ان کا تحقیقی مضمون ایک اچھوتا کام ہے۔ انھوں نے مصنف کو تحقیقی صلاحیتوں سے متصف قرار دیا۔ ڈاکٹر آصف سلیم نے 'تلاش و تصنیف' کا بھرپور محاکمہ پیش کیا۔ انھوں نے ڈاکٹر نسیم اختر کی کاوشوں کو سراہا اور انھیں نئی نسل کا معتبر محقق بتایا۔ عطا عابدی نے زیر بحث کتاب پر نہایت مختصر مگر جامع روشنی ڈالی اور کہا کہ نسیم اختر نئے محققین میں تیزی سے اپنی شناخت بنا رہے ہیں۔ محفل مذاکرہ میں ڈاکٹر علیم اللہ حالی، ڈاکٹر جاوید حیات اور ڈاکٹر ہمایوں اشرف کے ہاتھوں 'تلاش و تصنیف' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ کونسل کے ناظم اعلیٰ ڈاکٹر اسلم جاوداں نے مہمانوں کا استقبال کیا اور کہا کہ اردو کونسل کا بنیادی مقصد اردو زبان کا تحفظ و فروغ ہے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 16 مئی 2014

اساتذہ کا تربیتی پروگرام

ارریہ: الشمس اکادمی ملت نگر ارریہ میں ایک روزہ تربیتی پروگرام کا انعقاد ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیراہتمام کیا گیا۔ اس پروگرام کی صدارت سکریٹری آل انڈیا اقلیتی تعلیمی بورڈ و ڈائرکٹر سرور عالم ندوی نے انجام دی جب کہ بطور مہمان خصوصی کیرل کے معروف تعلیمی ادارہ الجامعہ الاسلامیہ کے لیکچرر شبلی ارسلان سابق جنرل سکریٹری این آئی او آف انڈیا نے شرکت کی۔ مہمانِ خصوصی شبلی ارسلان نے آج کا ایجنڈا اساتذہ کی تعلیم و تربیت و حسن سلوک اور مدبرانہ و مشفقانہ رویہ پر سیر حاصل گفتگو کی۔ تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ''ملکی سرحد کی حفاظت فوج کرتی ہے جب کہ سماجی و اخلاقی ذمے داری کی حفاظت تعلیم کرتی ہے۔ تعلیم کے ذریعے انسانیت سازی ہوتی ہے۔ انسانیت سازی ایک طرح سے شیشہ گری ہے۔ تعلیم ایک امانت دارانہ عمل ہے جو دوسروں تک پہنچایا جائے۔'' اخیر میں صدر محفل نے علامہ سید سلیمان ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے دیگر کارکردگی پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ سکریٹری آئی ٹی ماسٹر معیز الدین اور شمس اعظم وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' بھاگلپور، 18 مئی 2014

جھارکھنڈ:

مجلس ادب رانچی کی شعری نشست

رانچی: 29 مئی کو بمقام تسلیم محل مین روڈ رانچی میں مجلس ادب کے زیراہتمام ایک شعری نشست کا انعقاد کیا گیا۔ یہ نشست دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر اردو، پروفیسر ارتضیٰ کریم کے اعزاز میں رکھی گئی تھی۔ واضح ہو کہ پروفیسر ارتضیٰ کریم بہار کے ضلع گیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ پروفیسر موصوف درجنوں کتابوں کے مصنف ہیں جن میں 'بہار کا اردو ادب آٹھویں دہائی میں' عجائب القصص: تنقیدی مطالعہ، ترقی پسند ادب، انتخاب کلام میر سوز، قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ، اردو فکشن کی تنقید، انتظار حسین: ایک دبستان قابل ذکر ہیں۔ وہ ابھی خواجہ احمد عباس اور کرشن چندر پر اپنا تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے خطاب کرتے ہوئے اردو کی بدحالی پر افسوس ظاہر کیا اور کہا کہ: اردو زبان کا مسئلہ اہم ہے اور اس کی بدحالی کے ذمہ دار کوئی اور نہیں ہم خود ہیں۔ ہمیں اپنے گھر سے اس کی از سرنو شروعات کرنی چاہیے کہ ہمارے بچے کیسے اردو تعلیم کی طرف راغب ہوں۔ مشاعرے کی صدارت جناب حیرت فرخ آبادی نے کی اور نظامت مجلس ادب کے سکریٹری ڈاکٹر سرور ساجد نے کی۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر سرور ساجد، جھارکھنڈ، 30 مئی 2014

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے اعزاز میں نشست

رانچی: مورخہ 30 مئی 2014 اشوک نگر، روڈ نمبر 1 رانچی میں واقع ڈاکٹر ریحانہ محمد علی کے دولت کدے پر انجمن جمہوریت پسند مصنفین رانچی کے اردو کے بزرگ و کہنہ مشق شاعر شوق جالندھری کے زیرصدارت ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی رانچی آمد پر ایک اعزازی نشست کا انعقاد کیا گیا، جس میں خصوصی طور پر ڈاکٹر شین اختر، ڈاکٹر رضوانہ ارم، ڈاکٹر ریحانہ محمد علی، ڈاکٹر شفق وارثی، قاصر عظیم، نہال سریاوی، عالم گیر ساحل، ایرج محمد، افق وارثی اور ایچ زیڈ خان وغیرہ شامل ہوئے تھے۔ اِس نشست میں حالات حاضرہ سمیت موجودہ سیاسی صورت حال پر سنجیدہ گفتگو ہوئی اور ادبی مباحث بھی زیر بحث آئے۔ ڈاکٹر رضوانہ ارم کی کتاب 'فیض احمد فیض کی غزلوں کا تنقیدی مطالعہ' اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی 160 ویں کتاب 'انکیا کا زبان، پس منظر، پیش منظر' اور ان کے اوپر مظفر مہدی کی لکھی بارہویں کتاب 'مناظر عاشق کی شاعرانہ جہتیں' کا اجرا ڈاکٹر شین اختر سابق وائس چانسلر کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ سکریٹری انجمن کے اظہار تشکر کے بعد نشست اختتام پذیر ہوئی۔

بذریعہ ڈاک، ایم زیڈ خان، 5 جون 2014

کرناٹک:

گلبرگہ یونیورسٹی میں جلسۂ تقسیم اسناد

گلبرگہ: بتاریخ (22 مئی 2014) بزم ادب اردو، شعبۂ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ کی جانب سے جلسۂ اختتامیہ و تقسیم انعامات اور ناول کی رسم اجرا پروفیسر عبدالحمید اکبر صدر شعبۂ اردو و فارسی کی زیر نگرانی منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں پروفیسر رفیق مدے بہال صدر شعبۂ علم ریاضیات، گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ اور ڈاکٹر اکرام باگ ممتاز افسانہ نگار و سابق ریسرچ گائیڈ شعبۂ اردو گلبرگہ یونیورسٹی نے بحیثیت مہمانانِ خصوصی شرکت فرمائی۔ شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالر و معروف فکشن نگار شاہد فریدی

کا اولین ناول 'اپنا ہی گریباں بھول گئے' کا اجرا بدست ڈاکٹر اکرام باگ عمل میں آیا۔ بزم ادب اردو شعبۂ اردو و فارسی گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ کی سالانہ رپوٹ عشرت سلطانہ نے پیش کی۔ ڈگری کالج اور پوسٹ گریجویشن طلبہ و طالبات کے مابین تحریری، تقریری، افسانہ نویسی، طنز و مزاح، بیت بازی، برجستہ تقریر اور غزل سرائی کے مقابلوں میں گلبرگہ اور نواحِ گلبرگہ کے مختلف ڈگری کالجز کے طلبہ نے حصہ لینے والوں کو انعامات و اسناد مہمانانِ خصوصی کے ذریعے پیش کیے گئے۔ پروفیسر عبدالرب استاد نے انعام یافتگان کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے انھیں مزید محنت کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ پروفیسر رفیق مدے بہال نے بھی اپنے خطاب میں تہذیبی و ثقافتی پروگراموں کے ساتھ ساتھ مسابقتی امتحانات میں بھی شرکت کرنے پر زور دیا۔ پروفیسر عبدالحمید اکبر نے اپنے صدارتی خطاب میں انعام پانے والوں کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ مسابقتی دور میں محنت اور مقابلہ کی اسپرٹ کے ساتھ حصہ لینا چاہیے۔

پریس ریلیز، حامد رضا: معتمد نشر و اشاعت، شعبۂ اردو و فارسی یونیورسٹی گلبرگہ، 9 جون 2014

مدنی میاں کمپیوٹر سینٹر ہبلی کا تقسیم اسناد

ہبلی: شہر کے علاقہ طیب لینڈ میں چلائے جارہے مدنی میاں کمپیوٹر سینٹر ہبلی میں منعقدہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے مہمانِ خصوصی حضرت سید محمد قاسم اشرف صاحب قبلہ بابا صاحب نے علم اور تعلیم کے موضوع پر بصیرت افروز خطاب فرمایا اور حکومت ہند کی جانب سے منظور کردہ ایک سالہ، ڈپلوما ان کمپیوٹر اپلیکیشن کے کامیاب 9 طلبا کو اپنے دستِ مبارک سے سند عطا کی۔ نعیم الدین اشرفی نے اجلاس کی نظامت کے دوران کورس اور سند کی اہمیت بتائی۔ جب کہ جناب محمد شعیب کے اظہارِ تشکر پر اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' 12 جون 2014

پروفیسر اختر الواسع کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کرتے ہوئے جامعہ اردو کے ذمے داران

کرناٹک اردو اکادمی کی تشکیل

بنگلور: کرناٹک اسٹیٹ اردو اکادمی کی باقاعدہ تشکیل ہوچکی ہے اور اس کا سرکاری حکم نامہ بھی جاری کیا گیا ہے۔ محکمہ اقلیتی بہبود، حج اور وقف کے انڈر سکریٹری عباس شریف کی اطلاع کے مطابق ڈاکٹر

چودھری فوزیہ بیگم اکادمی کی نئی چیئر پرسن ہیں۔ رجسٹرار اردو اکادمی، فائنانس ممبر اردو اکادمی اور ڈائرکٹر برائے کنڑا اینڈ کلچرل ڈائرکٹوریٹ یا ان کے نمائندہ ان تین اراکین کے علاوہ ریاستی حکومت نے دیگر دس اراکین کو نامزد کیا ہے جن کے نام اس طرح ہیں: انل ٹھکر (ہبلی)، محمد امجد حسین (گلبرگہ)، محمد اشفاق صدیقی (بلگام)، نعمت اللہ خان (میسور)، پروفیسر صبیحہ زبیر خان (سنجے نگر بنگلور)، سعید یوسف علی ناطق (علی پور، گوری بدنور تعلقہ)، شفیق عابدی (شیواجی نگر بنگلور)، رضوان اللہ خان (صحافی سیاست، بنگلور)، رفیع بھنڈاری (صحافی سالار، باجاپور)، محمد یوسف (صحافی بیدر)، ان کے علاوہ دیگر تین اراکین کو اپٹ کرنے کی بھی گنجائش ہے۔ اس کمیٹی کی میعاد تین سال کی ہوگی۔

روزنامہ سالار، 1 جون 2014

اعزاز و اکرام:

اختر الواسع کو 'ڈکتورادب' کی اعزازی ڈگری

علی گڑھ: پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے جامعہ اردو علی گڑھ میں 'موجودہ دور میں اردو زبان کا فروغ' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو ماں کے دودھ کی طرح مقدس ہے اور میں اردو سے پیار ہی نہیں اس کا احترام کرتا ہوں۔ اردو زبان میں جو شیرینی، اپنائیت، محبت اور اخوت کا جذبہ پایا جاتا ہے وہ دنیا کی کسی دوسری زبان کو میسر نہیں ہے۔ غور طلب ہے کہ جامعہ اردو علی گڑھ نے پروفیسر اختر الواسع کو ان کی اردو خدمات کے اعتراف میں گراں قدر اعزاز 'ڈکتورادب' کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا۔ انھوں نے ایوارڈ قبول کرنے کے بعد کہا کہ آج وہ جس مقام پر ہیں اس کی بنیاد جامعہ اردو علی گڑھ میں رکھی گئی اور انھوں نے یہیں سے ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل وغیرہ کی شکل میں تعلیم حاصل کی۔ سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ زبانیں کبھی حکومت کی سرپرستی سے زندہ نہیں رہتیں بلکہ اپنے چاہنے والوں کے جذبے سے زندہ رہتی ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نے اپنے طور پر کام کیا ہے۔ آج بڑی تعداد میں اردو اساتذہ موجود ہیں۔ سرکار کو جب ضرورت ہوگی اردو اساتذہ مہیا کرا دیے جائیں گے۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے ڈائرکٹر جسیم محمد نے کہا کہ پروفیسر اختر الواسع کی ذات اردو زبان کی تاریخ کا اہم باب بن چکی ہے اور ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا

جا سکے گا۔ صدر جلسہ ممتاز سائنس داں پروفیسر ہمایوں مراد نے کہا کہ اردو کے فروغ کا مطالبہ کرنا ہمارا آئینی حق ہے اور اردو والے اپنا حق طلب کرتے ہیں۔ پروفیسر مراد نے کہا کہ اردو زبان نے آزادی کی جدوجہد میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان سے دنیا کا کوئی دانشور انکار نہیں کرسکتا۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے او ایس ڈی فرحت علی خاں نے مہمانوں کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ ملک بھر میں اردو زبان کے فروغ میں جامعہ اردو نے جو خدمات پیش کی ہیں ان کا اعتراف بابائے قوم مہاتما گاندھی سمیت ملک کے کئی وزرائے اعظم کرچکے ہیں مگر افسوس کہ آج تک جامعہ اردو کو اس کا واجب حق نہیں مل سکا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 مئی 2014

پروفیسر خالد محمود اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین نامزد

نئی دھلی: دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ نے دہلی کی سرگرمیوں کو بحال رکھنے کے لیے ایک فعال اور خالص اردو کی شخصیت پروفیسر خالد محمود کو اردو اکادمی دہلی کے لیے وائس

چیئرمین کے طور پر منتخب کیا ہے۔ پروفیسر خالد محمود کے وائس چیئرمین منتخب کیے جانے سے اردو حلقے میں خوشی محسوس کی جارہی ہے۔ پروفیسر خالد محمود جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے استاد کے علاوہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے اعزازی ڈائرکٹر بھی ہیں جس طرح مکتبہ جامعہ پروفیسر خالد محمود کی سربراہی میں ترقی سے ہمکنار ہوا ہے، امید کی جارہی ہے کہ اکادمی ان کی سربراہی میں فعال رول ادا کرے گی۔ ان کے وائس چیئرمین منتخب ہونے پر پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر شہزاد انجم، ڈاکٹر افضل مصباحی اور ڈاکٹر خالد مبشر سمیت دیگر ارباب علم و دانش نے انھیں مبارکباد پیش کرتے ہوئے اس بات کی امید ظاہر کی ہے کہ اردو اکادمی اردو زبان و ادب کی خدمات اور اس کے فروغ میں اہم کردار ادا کرے گی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 مئی 2014

پروفیسر اختر الواسع مخدوم قلی میڈل سے سرفراز

نئی دھلی: ایک عظیم الشان تقریب میں نائب صدر ترکمانستان نے مطالعات اسلامی کے ماہر اور اردو زبان و ادب کے حوالے سے اپنی شناخت رکھنے والے لسانی اقلیات حکومت ہند کے کمشنر پدم شری پروفیسر اختر الواسع کو مخدوم قلی ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ مخدوم قلی ایوارڈ سے دنیا کی ان تمام شخصیات کو نوازا گیا جنھوں نے لسانی اور فنی اعتبار سے اہم خدمات انجام دی ہیں۔ اس حوالے سے

ترکمانستان کے عشق آباد میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی سیمینار میں جو مشہور صوفی، فلسفی اور شاعر مخدوم قلی کی یاد میں منعقد کیا گیا تھا ترکی، ازبکستان اور آذربائیجان کے صدر اور ڈائرکٹر جنرل یونیسکو سمیت دنیا کے ممتاز افراد کو مخدوم قلی کے میڈل سے سرفراز کیا گیا۔ واضح رہے کہ مخدوم قلی پر منعقد ہونے والے بین الاقوامی سیمینار میں دنیا بھر سے 50 سے زائد علما اور دانشوروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ ہندوستان سے پروفیسر نسیم احمد شاہ، پروفیسر ایم جی خاکی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی کے سابق صدر پروفیسر محمد اقبال کو خاص طور پر مدعو کیا گیا ہندوستانی وفد کی قیادت پروفیسر اختر الواسع نے کی۔ اس موقعے پر سینٹرل ایشیا کو اپنے علمی مطالعات کا موضوع بنانے کے لیے پروفیسر نسیم احمد شاہ ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنس کو بھی ایک خصوصی تقریب میں نائب صدر ترکمانستان کی جانب سے میڈل پیش کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 مئی 2014

پروفیسر سید محمد ہاشم فکر و نظر کے مدیر بنے

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ضمیرالدین شاہ نے شعبۂ اردو کے پروفیسر، مشہور محقق اور ماہر اقبالیات، پروفیسر سید محمد ہاشم کو پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی جگہ 2 سال کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سب سے باوقار سہ ماہی اردو رسالہ

'فکر و نظر' کا مدیر مقرر کیا ہے۔ ان کی تقرری کے احکامات فوری طور پر روبہ عمل لائے گئے ہیں۔ پروفیسر سید محمد ہاشم کا تعلق علم و ادب اور روحانیت کے قدیم مرکز امروہہ کے سادات خاندان سے ہے۔ ہاشم صاحب طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے گولڈ میڈلسٹ بھی رہے ہیں۔ علمی و تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے علاوہ مختلف شخصیات پر سوانحی خاکے بھی شائع ہوچکے ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف، مؤلف، مرتب اور تقریباً ساٹھ مقالات کے مصنف ہیں۔ انھیں مختلف کتابوں پر کئی اکادمیوں نے انعامات سے بھی نوازا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 مئی 2014

صغیر افراہیم 'تہذیب الاخلاق' کے ایڈیٹر مقرر

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے معروف استاد پروفیسر صغیر افراہیم کو معمارِ قوم سرسید احمد خاں کے قائم کردہ رسالہ 'تہذیب الاخلاق' کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا ہے۔

تہذیب الاخلاق کے 1870 میں اجرا کے موقعے پر خود سرسید نے اس رسالے کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو کامل درجے کی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کرنا تاکہ مسلمان خود بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلائیں۔ پروفیسر صغیر افراہیم تہذیب الاخلاق سے زمانہ طالب علمی سے ہی وابستہ رہے ہیں انھوں نے سید حامد صاحب کی اپیل پر جو مضامین قلم بند کیے اُن میں سے 'کائنات: تخلیق اور زندگی'، 'سائنس اور اسلام' اور 'لیزر سرجری' جیسے مضامین کو خصوصی انعام سے نوازا گیا۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے بتایا کہ تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے ملک گیر سطح پر تحریک چلائی جائے گی تاکہ سرسید احمد خاں کے خواب کو زیادہ سے زیادہ افراد تک

استقبالیہ پروگرام میں ڈاکٹر امجد حسین خطاب کرتے ہوئے

پہنچایا جاسکے۔ انھوں نے کہا کہ تہذیب الاخلاق کو مقبول عام بنانے کے لیے ملک کے ادیبوں اور دانشوروں سے رابطہ قائم کرکے ان کے اس ادارے سے وابستگی کی تجدید کی جائے گی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 مئی 2014

امریکہ کے ادیب ڈاکٹر سید امجد حسین کا استقبال

نئی دھلی: معروف ادیب، ماہر امراض قلب اور اردو دنیا میں اپنی اعلیٰ ادبی تحریروں کی وجہ سے مشہور امریکہ سے آئے ڈاکٹر امجد حسین نے شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی میں پشاور میں اردو زبان و ادب کی صورت حال پر خطاب کیا۔ انھوں نے اپنے خطاب میں پشاور کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہاں پر اردو پھل پھول رہی ہے۔ پاکستان میں اگرچہ کئی علاقائی زبانیں ہیں، لیکن اردو نے رابطے کی زبان کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ انھوں نے اپنے خطبے میں پشاور کی اردو کا دہلی اور لکھنوی لہجہ سے موازنہ کرتے ہوئے کہا کہ وہاں کی زبان میں وہ روانی نہیں ہے جو دہلوی اور لکھنوی اردو کا خاصہ ہے۔ مہمان محترم نے پشاور کی ادبی انجمنوں کا ذکر کرتے ہوئے حلقہ ارباب ذوق، انجمن ترقی اردو کے علاوہ ایک انجمن 'ملاقات' کا بھی ذکر کیا جس میں مختلف زبان کے ادیب شامل ہوکر اپنی تخلیقات پیش کرتے ہیں۔ اس موقعے پر انھوں نے اپنی کتاب 'چترال والا کٹورہ' سے ایک مضمون بھی پڑھ کر سنایا جس کو سامعین نے کافی پسند کیا۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر ابن کنول نے مہمان محترم کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ دل کے ڈاکٹر ہیں، اردو کا معاملہ بھی دل کا ہے اس لیے اردو سے وہی وابستہ ہوتا ہے جو دل سے اس زبان سے جڑا ہوتا ہے۔ اس موقعے پر مہمانِ خصوصی اے رحمان (چیئرمین عالمی اردو ٹرسٹ) نے بھی سامعین سے خطاب کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر ابوبکر عباد نے کی اور شکریے کے کلمات ڈاکٹر علی جاوید نے ادا کیے۔ پروگرام میں شعبہ کے اساتذہ کے علاوہ ریسرچ اسکالر اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 مئی 2014

صدر شعبۂ اردو ابن کنول کو استقبالیہ

نئی دھلی: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر ابن کنول کے صدر منتخب کیے جانے پر اساتذہ کی طرف سے ایک استقبالیہ تقریب کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقعے پر اساتذہ نے انھیں گلدستہ پیش کرکے استقبال کیا۔ پروفیسر ابن کنول نے نئے اساتذہ سے امید ظاہر کی کہ وہ جس

طرح شعبہ کی سرگرمیوں میں پہلے بھی وابستہ رہے ہیں اسی طرح اردو کے فروغ اور شعبہ کے وقار کو بحال رکھنے میں نمایاں کارنامہ انجام دیں گے اور شعبہ کے تمام کاموں میں تعاون کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ اس بار طلبہ کے اندر شوق اور صلاحیت پیدا کرنے کے لیے سیمینار اور لکچرز کا سلسلہ بھی شروع کیا جائے گا۔ تمام اساتذہ نے بھی امید ظاہر کی پروفیسر ابن کنول نے جس طرح پہلے بھی اپنی مدت صدارت میں شعبہ کی سرگرمیوں کو تیز تر کردیا تھا، اس بار بھی وہ فعال ثابت ہوں گے۔ نئے اساتذہ میں ڈاکٹر احمد امتیاز اور ڈاکٹر ارشاد نیازی کو بھی استقبالیہ دیا گیا۔ تقریب میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شعبہ کے سابق صدر پروفیسر صادق اور شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر شعبہ پروفیسر وہاج الدین علوی نے شرکت کی۔ اس استقبالیہ تقریب میں دہلی یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بیشتر اساتذہ و طالب علموں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 مئی 2014

یوپی اردو اکادمی کے تعلیمی وظائف کی تقسیم

مئوناتھ بھنجن: صرف اسکول میں اچھی اچھی باتیں سکھانے اور بتانے سے ماحول نہیں بنے گا گھروں میں ماحول بنانا ہوگا۔ بات چیت میں اچھے لفظوں اور شائستہ جملوں کے استعمال کی عادت ڈالنی ہوگی۔ ان خیالات کا اظہار دانش گاہ پبلک اسکول میں وظائف کی تقسیم کے سلسلے میں منعقدہ پروگرام کو خطاب کرتے ہوئے سابق چیئرمین محمد طیب پالکی نے کیا انھوں نے اردو اکادمی کی جانب سے اسکول کے بچوں کو دیے جانے والے وظائف کے چیک تقسیم کرتے ہوئے کہا کہ تعلیمی وظیفہ زندگی کی ایک یادگار چیز ہوتی ہے جو ہمیشہ کے لیے ذہن میں قید ہوجاتی ہے اور یہاں سے بچوں کی کامیابی کا دور شروع ہوجاتا ہے بچوں کو اس چھوٹی سی رقم سے بڑا حوصلہ ملتا ہے اور ان کی تعلیمی سرگرمی بڑھ جاتی ہے اور وہ اپنا بہتر مستقبل بنانے کے لیے پرعزم ہوجاتے ہیں۔ اس تقریب کی صدارت مولانا اسامہ نے کی ماسٹر اظہار الحق نے ادارے کی تعلیمی پروگریس کے بارے میں بتایا اور اسکول کی پرنسپل شکیلہ پروین نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 23 مئی 2014

سید شمس الحسن عارف کو اعزاز

بھوپال: سرائے سکندری، بھوپال میں منعقد ایک پروقار تقریب میں روزنامہ 'ندیم' کے ایگزیکیٹو ایڈیٹر جناب عارف حسن کی صحافت، معاشرہ اور تعلیم کے میدانوں میں بے مثال خدمات کے اعتراف میں ادارہ کہکشاں ادب کی طرف سے استقبال کیا گیا اور سند توصیف پیش کی گئی۔ اس موقعے پر شہر کے رکن اسمبلی سابق وزیر اور ادارہ کہکشاں ادب کے روح رواں جناب عارف عقیل نے عارف حسن صاحب کی گل پوشی کی اور انھیں شال پہنائی اور عارف حسن صاحب کی خدمات کو سراہا۔ اس تقریب میں روزنامہ ندیم کے مینجنگ ایڈیٹر اور سید شمس الحسن عارف کے چھوٹے بھائی سید نورالحسن پرویز، اور ممتاز صحافی عارف عزیز، پروفیسر آفاق احمد، عارف علی عارف بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 3 جون 2014

رسم اجرا:

گئودان اور نرملا کی ڈی وی ڈی کا اجرا

نئی دھلی: منشی پریم چند کے مشہور زمانہ ناول گئودان اور نرملا پر مبنی ڈی وی ڈی کو ایک عظیم الشان تقریب میں جاری کیا گیا۔ یہ ڈی وی ڈی دوردرشن کے زیر اہتمام بنائی گئی ہے۔ دونوں سیریلوں کی ہدایت کاری کے فرائض

کلیاتِ شبنم گورکھپوری کے اجرا کا منظر

فلم فیئر ایوارڈ یافتہ، پدم بھوشن اور ساہتیہ اکادمی اعزاز سے سرفراز گلزار نے دیے ہیں۔ اس تقریب میں گلزار مہمان خصوصی تھے۔ گئودان اور نرملا جیسی تخلیقات ہندوستانی سماج کے حقائق کو عیاں کرتی ہیں۔ گئودان کی کہانی ہوری کے ارد گرد گھومتی ہے۔ نرملا میں قدامت پرستی کے خلاف جدوجہد کرنے والی ایک عورت کی داستان کو بیان کیا گیا ہے۔ دوردرشن ادب عالیہ کو سیریل اور ٹیلی فلموں کے توسط سے نشر کر کے مقبول عام بنانے میں ہمیشہ پیش پیش رہا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 6 مئی 2014

کلیاتِ شبنم گورکھپوری

گورکھپور: شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی گورکھپور میں ڈاکٹر مشیر احمد اور اشفاق احمد عمر کی مرتبہ کتاب 'کلیاتِ شبنم گورکھپوری' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی سے تشریف لائے ہوئے مہمان خصوصی پروفیسر محمد شاہد حسین (سابق صدر شعبۂ اردو) نے کتاب کا اجرا کیا اور گورکھپور کی ادبی و ثقافتی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ ان کے علاوہ شبلی نیشنل پی جی کالج اعظم گڑھ کے شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر محمد طاہر نے بھی خوشی کا اظہار کیا اور کتاب کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ اس تقریب میں ڈاکٹر مشیر احمد و اشفاق احمد عمر کے علاوہ ڈاکٹر ساجد حسین، ڈاکٹر شجاع الحق، معین عارف، شریف نواز، محمد شمیم، سیدہ خاتون، نغمہ تبسم، ہیم لتا وغیرہ نے شرکت کی۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 جون 2014

اردو شاعری میں گیتا

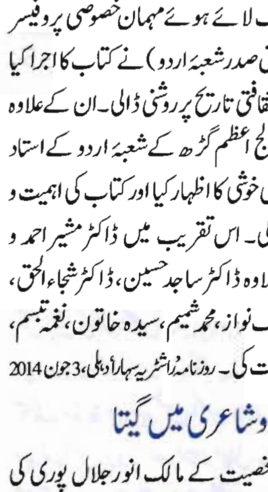

لکھنؤ: ہمہ جہت شخصیت کے مالک انور جلال پوری کی کتاب 'اردو شاعری میں گیتا' کا 23 مئی 2014 کو شام 5 بجے اندرا گاندھی پرتشٹھان لکھنؤ میں سنت مراری باپو اور وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو کے ہاتھوں اجرا ہوا۔ انور جلال پوری نے کہا کہ 'مجھے طالب علمی کے زمانے سے ہی لٹریچر اور مذہب کے تقابلی مطالعہ کا شوق تھا۔ چنانچہ انگریزی ادب کے بعد جب اردو ادب میں ایم اے کیا تو 1982 میں مجھے پی ایچ ڈی کرنے کا خیال آیا۔ میں نے ایک عنوان 'گیتا کے اردو منظوم ترجمے اور ان کا تنقیدی جائزہ' منتخب کیا۔ لیکن اپنی تدریسی اور مشاعروں کی مصروفیات کی وجہ سے میں اس کام کو مکمل نہیں کر سکا۔ مگر گیتا کے انداز بیان اور اس کے فلسفیانہ نکات سے میری دلچسپی قائم رہی اور میں نے مطالعہ جاری رکھا۔ آہستہ آہستہ اس کام کو بھی کرتا رہا۔ گزشتہ سات آٹھ برسوں میں میری دیوانگی میں کچھ اضافہ ہوا اور اسی دیوانگی کا نتیجہ ہے کہ یہ کتاب آپ لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ انھوں نے کہا کہ 'گیتا کو پڑھنے اور اس کی اخلاقی تعلیمات پر غور کرنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ قرآن اور احادیث رسولؐ کی اخلاقی تعلیمات میں بڑی مماثلت ہے۔ دنیا کی بڑی کتابیں وہ چاہے کسی ملک میں ہوں دراصل انسانیت کی وراثت ہوتی ہیں۔ انسانیت کی رہنمائی اور اس کے بہتر مستقبل کے نسخے ان کتابوں میں آسانی سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ گیتا کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ ہر عقیدے اور نظریہ کا احترام کرتی ہے مگر اپنے عقیدے پر عمل کرنے اور مستحکم رہنے کی تلقین کرتی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 مئی 2014

لمعاتِ طرزی

بہار: رونردسدن کلکتہ واقع اسٹار ہوٹل میں شعرا اور محبان اردو نے ڈاکٹر منصور خوشتر کی ترتیب کردہ کتاب 'لمعاتِ طرزی' کی رونمائی کرتے ہوئے کتاب کی اشاعت پر مسرت کا اظہار کیا۔ رونمائی نشست میں اردو دوست جمیل فاروقی (ہوٹل مالک)، طنز و مزاح کے شاعر ارم انصاری، اشرف یعقوبی، محترمہ بشریٰ سحر، فراغ روہوی، محترمہ ریحانہ نواب، طالب حسین، احمد علی برقی اور ڈاکٹر انتخاب ہاشمی سمیت خود مرتب ڈاکٹر منصور خوشتر موجود تھے۔ شرکا نے کتاب کی اشاعت پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے پسندیدگی ظاہر کی اور کہا کہ اس سے معروف شاعر و ادیب ڈاکٹر عبدالمنان طرزی کی ہمہ جہت شخصیت کا ادراک ہوتا ہے۔ ڈاکٹر طرزی کی جملہ خوبیوں کو نئی نسل کے شاعر منصور خوشتر نے نئے روپ اور منفرد سوچ کے ساتھ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 12 مئی 2014

غالب اکادمی میں تین کتابوں کا اجرا

نئی دھلی: غالب اکادمی میں دبستان ابر کے زیر اہتمام تین کتابوں کی رسم رونمائی ہوئی۔ استاد شاعر احمر جلیسری کے شعری مجموعے 'مخفی دانائیاں' اور سلمان عبدالصمد کی کتاب 'قرآن کا نظریہ سیاست' اور 'غضنفر کا فکشن' پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر ابن کنول صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے کہا کہ احمر جلیسری نے اپنے مجموعے میں اسلامی موضوعات پر

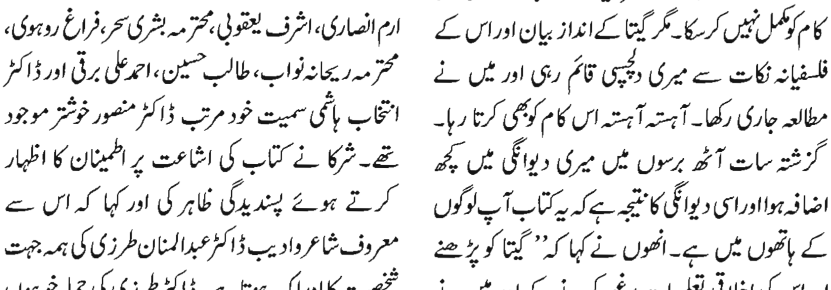

اچھی شاعری کی ہے، ان کے متعدد شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سلمان عبدالصمد نے غضنفر کے فکشن میں ایک بیدار مغز قاری کی حیثیت سے فکشن کے تجزیے پر توجہ مبذول کی ہے۔ عالمی اردو ٹرسٹ کے چیرمین اے رحمان نے دونوں صاحب کتاب کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو کا مستقبل روشن ہے، یہی وجہ ہے کہ نت نئے موضوعات پر کتابیں منظر عام پر آرہی ہیں، اہل اردو کو اردو کی بقا اور اس کی نیک نامی کے لیے گہری تحقیق اور اچھی تنقید پر توجہ دینی چاہیے۔ واضح رہے کہ قرآن کے نظریہ سیاست میں مصنف نے کئی اہم سوالوں کو اٹھا کر اسے قرآن و احادیث کے تناظر میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

پریس ریلیز، سلمان عبدالصمد، نئی دہلی، 3 جون 2014

اشرف استھانوی کی کتاب کے اجرا کا منظر

ولایت کے تاجدار اور انسانیت کے علمبردار

حضرت مخدوم شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ

پٹنہ: سرزمین بہار کے عظیم المرتبت صوفی کی حیات و خدمات پر معروف صحافی اشرف استھانوی کی نئی کتاب 'ولایت کے تاجدار اور انسانیت کے علمبردار حضرت مخدوم شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ' کا اجرا اردو بھون کے کانفرنس ہال میں ایک باوقار تقریب میں کیا گیا۔ رسم اجرا تقریب میں معروف گاندھیائی مفکر ڈاکٹر رضی احمد، مگدھ یونیورسٹی گیا کے وائس چانسلر ڈاکٹر پروفیسر محمد اشتیاق، ویرکنور سنگھ یونیورسٹی آرہ کے وائس چانسلر ڈاکٹر اظہر حسین، معروف ملی وسماجی رہنما انجینئر محمد حسین وغیرہ کی موجودگی میں عمل میں آیا۔ کتاب کے مصنف اشرف استھانوی نے کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ حضرت مخدوم جہاں کی دینی اور روحانی خدمات پر مشتمل یہ کتاب سہل اور سادہ زبان میں پہلی بار منظر عام پر آئی ہے۔ سب سے خاص بات یہ ہے کہ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی کتاب شائع کی گئی ہے تاکہ عقیدت مندانِ مخدوم ان کی گرانقدر خدمات سے باخبر ہو سکے۔

پریس ریلیز، اشرف استھانوی، پٹنہ، بہار، 12 جون 2014

'پرورش لوح و قلم'

نئی دھلی: انصاری اسلامک کلچرل سینٹر دہلی میں 'پرورش لوح و قلم' نامی کتاب کا اجرا عمل میں آیا۔ اس کتاب کے مصنف مختار احمد فردین مقیم حیدرآباد بھی اس موقعے پر موجود تھے۔ اجرا کے اس پروگرام میں ڈاکٹر مولا بخش، ڈاکٹر مشتاق صدف پروگرام آفیسر ساہتیہ اکادمی، سینئر صحافی سہیل انجم اور چھتیس گڑھ کے ڈائرکٹر جنرل آف پولیس ایم ڈبلیو انصاری نے شرکت کی۔ ایم ڈبلیو انصاری نے کتاب کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ مختار احمد فردین نے صحافت کے موضوع پر کتاب لکھ کر زبان و ادب کی اہم خدمت انجام دی ہے۔ انھوں نے مصنف کو مبارکباد دیتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر مولا بخش نے اس کتاب کو صحافت کے موضوع پر ایک اہم کتاب بتایا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب صحافت کے مختلف موضوعات سے قاری کو روشناس کراتی ہے۔ سینٹر کی تقریبوں میں ہندوستان کے مختلف حصوں سے ادبا وشعرا تشریف لاتے ہیں۔ اس تقریب میں یو این این نیوز ایجنسی کے سربراہ نجم الحسن انصاری، محمد عمران، خورشید احمد، ڈاکٹر ولی مدنی اور ایم جے خالد نے شرکت کی۔ مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سینٹر کے روح رواں انصاری اطہر حسین نے مختار فردین کے فن کی تحسین کی۔ اس موقعے پر سینٹر کے سکریٹری سلیم انصاری نے سینٹر کی کارگزاری پیش کی اور مہمانوں کو تہہ دل سے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 مئی 2014

'گلدستہ در گلدستہ'

نگینہ: 5 جون قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے پروجیکٹ اسسٹنٹ اور معروف ادیب ڈاکٹر وسیم اقبال نگینوی کی کتاب 'گلدستہ در گلدستہ' کی چوتھی جلد کا اجرا اقبال میموریل گرلز جونیئر ہائی اسکول میں عمل میں آئی۔ جس میں مقررین نے فن بیت بازی اور اس کے تعلق سے اس کتب میں جمع کیے گئے معیاری شعرا کے اشعار کے

انتخاب پر روشنی ڈالی۔ مہمان خصوصی سید محمد ہاشم نے کہا کہ اردو کی زبوں حالی کے ساتھ ساتھ بیت بازی مقابلوں میں بھی کمی آئی ہے لیکن وسیم اقبال نے اس فن کو زندہ رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے جو قابل قدر ہے۔ ڈاکٹر شیخ نگینوی نے کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ گلدستہ در گلدستہ کی چوتھی جلد میں 60 عنوانات کے تحت 2720 اشعار کو اس طرح جمع کیا ہے کہ بیت بازی کے شوقین اس سے بھرپور استفادہ کرسکیں۔ اس موقعے پر اقبال میموریل ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیراہتمام صدر حسن جاوید نے ڈاکٹر وسیم اقبال اور سید محمد ہاشم کو 'نشان نگینہ' اعزاز سے نوازا گیا۔ سکریٹری طفیل احمد ایڈوکیٹ نے اظہار تشکر پیش کیا۔ نظامت شیخ نگینوی نے اور صدارت ڈاکٹر عظیم الرحمٰن نے انجام دی۔

پریس ریلیز، شیخ نگینوی، 6 جون 2014

شہنشاہِ جذبات دلیپ کمار کی سوانح عمری کا اجرا

ممبئی: امیتابھ بچن اور عامر خان نے ایک پانچ ستارہ ہوٹل میں مشہور اداکار دلیپ کمار کی سوانح عمری کا اجرا کیا۔ کتاب اجرا کی تقریب کے اس موقعے پر دلیپ کمار کی بیوی سائرہ بانو کے علاوہ بالی ووڈ کی کئی مشہور ہستیاں موجود تھیں، گویا فلمی ستارے اس عظیم فن کار کی خدمات کا اعتراف کرنے یہاں پہنچے ہوں۔ کتاب کا نام 'سبسٹینس اور شیڈو' ہے اور دلیپ کمار کی قریبی خاندانی دوست ادیبہ

تارا نائر نے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے دلیپ کمار کی زندگی کی کہانی سلسلہ وار طریقے سے کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں ان کے بچپن، کیریئر، زندگی کے اتار چڑھاؤ، خاندان کے حالات کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ ہے۔ سائرہ بانو نے اس موقعے پر کہا کہ ''ہمارے لیے یہ شام خاص ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ ہر کوئی ان کی سوانح عمری پسند کرے گا۔ اس موقعے پر عامر خان نے پرسون جوشی کی لکھی نظم پڑھی اور کئی اداکاروں نے اسٹیج پر آکر عظیم فنکار دلیپ کمار کے بارے میں اپنے تجربات پیش کیے۔ ایک ڈاکومینٹری بھی دکھائی گئی جس میں دلیپ صاحب نے اپنے حالات زندگی سے مطلع کیا۔

امیتابھ بچن نے ان کی کتاب کے چند پیراگراف پڑھے اور کہا کہ ''میں دلیپ کمار کی عظمت کو سلام کرتا ہوں، ایک بڑے فن کار ہی نہیں وہ ایک بڑے انسان بھی ہیں۔'' دھرمیندر نے خالص اردو میں تقریر کرتے ہوئے انھیں اپنا بڑا بھائی قرار دیا اور کہا کہ ان کے اور میرے درمیان کئی یادیں وابستہ ہیں۔ میں اس کتاب کی ایک ایک سطر پڑھنے کے لیے بے چین ہوں اور وہ ایک عظیم مخلص انسان ہیں۔'' ابتدا میں وجینتی مالا، مادھوری دکشت اور پرینکا چوپڑہ نے بھی شمع روشن کی اور اپنے خیالات پیش کیے۔ وجینتی مالا نے کہا کہ دلیپ کمار کے ساتھ انھوں

نے 7 فلموں میں اداکاری کی۔ اس موقعے پر مادھوری ڈکشت نے کہا کہ ''وہ ایک عظیم اداکار ہیں اور میں ان پر لکھی گئی کتاب پڑھنے کا انتظار کررہی ہوں۔ پرینکا نے کہا کہ ''جب بھی ہندوستانی فلم کی تاریخ لکھی جائے گی۔ اس کے اوّل صفحہ پر دلیپ کمار کا نام لکھا ہوگا۔ انھوں نے سائرہ بانو کا شکریہ ادا کیا کہ انھیں اپنے خاندان سے قریب کیا۔ کرن جوہر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ کئی فلموں میں افسردہ عاشق کا کردار ادا کرنے والے دلیپ کمار کو 'ٹریجڈی کنگ' یعنی 'شہنشاہ جذبات' کا خطاب دیا گیا تھا۔ دلیپ کمار آخری بار 1998 میں آئی فلم 'قلعہ' میں نظر آئے تھے۔ انھیں سال 1991 میں پدم بھوشن اور 1994 میں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے نوازا گیا اور وہ راجیہ سبھا کے ممبر بھی رہے اور انھیں قومی اعزاز بھارت رتن دینے کا مطالبہ بھی ایک عرصے سے جاری ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 جون 2014

وفیات

ممتاز ادیب اور شاعر سید ضمیر حسن دہلوی کا انتقال

نئی دہلی: دہلوی تہذیب کے دلدادہ اور نمائندہ اردو کے ممتاز ادیب، شاعر اور ہر دلعزیز استاذ سید ضمیر حسن دہلوی کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ وہ 74 برس کے تھے۔ ان کے پسماندگان میں 2 بیٹے شامل ہیں۔ ان کی نماز جنازہ بہادر شاہ ظفر مارگ واقع مسجد بھوری بھٹیاری میں ادا کی گئی اور سینکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں انھیں

دہلی گیٹ قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔ سید ضمیر حسن دہلوی طویل عرصے تک دلی کالج کے شعبہ اردو میں بطور استاد اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ سید ضمیر حسن دہلوی کو تصنیف و تالیف سے خاص شغف تھا اور وہ اپنے منفرد دہلوی اندازِ تحریر کی وجہ سے پسند کیے جاتے تھے۔ مختلف موضوعات پر ان کی ایک درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہوئیں لیکن 'دلی سے دلی تک' کو خاص طور سے پسند کیا گیا۔ سید ضمیر حسن دہلوی کے انتقال پر دہلی کے ادبی و تعلیمی حلقوں میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔ ان کے انتقال کو دہلویت کے ایک بڑے دور کے خاتمے کی شکل میں دیکھا جارہا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 مئی 2014

ابوتراب خطائی ضامن

بنگلور: کرناٹک کے مشہور و معروف شاعر ادیب، محقق جناب سید ابوتراب خطائی ضامن طویل علالت کے بعد بتاریخ 21 مئی 2014 بمقام تھنیسندرا، بنگلور میں انتقال فرماگئے۔ نماز جنازہ جامع مسجد، منی ریڈی پالیہ، بنگلور عمل میں آئی، اور تدفین قدوس صاحب قبرستان، منی ریڈی پالیہ میں ہوئی۔ مرحوم کا آبائی وطن ٹمکور ہے۔ سید ابوتراب اردو، فارسی، کنڑا، ہندی، انگریزی زبان پر خاصا

عبور رکھتے تھے۔ آپ کا درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تحقیق و تدقیق اور شاعری سے دلی لگاؤ تھا۔ جناب قمرالاسلام وزیر برائے اقلیتی بہبود و وقف حکومت کرناٹک و سرپرست اعلیٰ کرناٹک اردو اکادمی کے او ایس ڈی جناب سید نثار احمد نے کہا ہے کہ ابوتراب خطائی ضامن کی وفات سے اردو کی ایک بہترین شخصیت ہم سے جدا ہوگئی ہے اور جناب عباس شریف صاحب، انڈر سکریٹری، محکمہ اقلیتی بہبود حج وقف حکومت کرناٹک اور دیگر عہدیداران نے جناب ابوتراب خطائی ضامن کی رحلت پر غم کا اظہار فرمایا۔

پریس ریلیز، ایس مرزا عظمت اللہ، رجسٹرار کرناٹک اردو اکادمی، 21 مئی 2014

شاکر ندیم

کلکتہ: مغربی بنگال میں اردو کے ممتاز شاعر اور ہوڑہ میں تعلیم کے فروغ کی تحریک کے اہم کارکن شاکر ندیم اپنی رہائش گاہ پر انتقال کرگئے۔ ان کی عمر 64 سال تھی۔ یہ اطلاع شاعر و صحافی فہیم انور نے دی ہے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور چار بیٹیاں شامل ہیں۔ ان کا اصل نام سرفراز احمد خاں تھا، ان کے آبا کا تعلق چھپرہ کے کوپا گاؤں سے تھا مگر ان کی پیدائش اور پرورش ہوڑہ میں ہوئی تھی۔ وہ ہوڑہ کی ملی سماجی علمی اور ادبی زندگی میں پوری طرح شریک رہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 29 مئی 2014

خراجِ عقیدت

آصف بریلوی کی وفات پر تعزیتی نشست

راجوری: تحریک بقائے اردو نے 2013 کے شان اردو ایوارڈ یافتہ اتر پردیش کے معروف شاعر و تحریک کے اہم کارکن آصف بریلوی کی حادثاتی موت پر دکھ کا اظہار کیا اور ان کے اہل خانہ کے ساتھ تعزیت کی ہے۔ تحریک کی طرف سے جاری پریس بیان میں کہا گیا ہے کہ آصف بریلوی کا سڑک حادثہ میں انتقال ہوگیا۔ ان کی اچانک موت پر تحریک کے سرپرست فاروق شاہ بخاری، صدر عرفان علی عارف، جنرل سکریٹری ذاکر ملک بھلیسی، سینئر نائب صدر جاوید انور، نائب صدر محمد صغیر مرزا، مرکزی جوائنٹ سکریٹری محمد سعید مغل اور تنظیم سے وابستہ دیگر حضرات نے بھی ان کی اچانک موت پر رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ واضح رہے کہ آصف بریلوی 6 ملکوں کے اردو سفیر تھے اور 8 ملکوں کی سرکار سے انھوں نے ایوارڈ بھی حاصل کیا تھا جن کی اسی نمایاں کارکردگی کی بنیاد پر تحریک بقائے اردو نے سال 2013 کے لیے ان کو شان اردو ایوارڈ ڈاک بنگلہ راجوری میں اپنے یومِ تاسیس کے موقعے پر دیا تھا۔ اس سال بنارس میں تحریک بقائے اردو کے پروگرام کے لیے آصف بریلوی سے میزبان بنائے گئے تھے تاہم اب ان کی موت کے بعد فی الحال تحریک نے اس پروگرام کو ملتوی کردیا ہے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 21 مئی 2014

حسرت موہانی کی 63ویں برسی

کانپور: مولانا حسرت موہانی ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے دفتر طلاق محل میں مولانا حسرت موہانی کی 63ویں برسی کے موقعے پر ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں مولانا موصوف کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔ اس موقعے پر حاضرین کو خطاب

کرتے ہوئے سوسائٹی کے جنرل سکریٹری غفران احمد چاند نے کہا کہ دراصل سوسائٹی کا قیام اسی مقصد کے تحت کیا گیا ہے کہ مولانا کے ذریعے کیے گئے کاموں اور ان کی قربانیوں سے عوام کو روشناس کرایا جائے۔ خاص طور پر نوجوان نسل کو ان کی راہ پر چلنے کے لیے آمادہ کیا جائے اور ان کے مشن کو آگے بڑھایا جائے، یہی موصوف کو سچا خراجِ عقیدت ہوگا۔ اس موقعے پر غفران احمد چاند کے علاوہ سوسائٹی کے اراکین عبدالرزاق منصوری، مظفر جمال انصاری، محمد احمد انصاری، سیف انصاری و دیگر لوگ موجود تھے۔ اس کے علاوہ مولانا حسرت موہانی میموریل سوسائٹی اور چندر شیکھر آزاد جن کلیان سمیتی کے زیر اہتمام نانا راؤ پارک میں منعقدہ تعزیتی جلسے میں شرکا نے ان کی تصویر کی گل پوشی کی اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا عہد کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 مئی 2014